آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کی حیات وارشادات

خاندان

آپ مشہد کے ایک مذہبی گھرانے میں ۲۹ فروردین ماہ ۱۳۱۸ش/۲۸ صفر ۱۳۵۸ھ/۱۹ اپریل ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے جد اعلیٰ سید محمد حسینی تفرشی اپنا سلسلہ نسب افطسی سادات تک پہنچاتے ہیں۔ آپ کا شجرہ سلطان العلماء المعروف سلطان سید احمد تک پہنچتا ہے جو پانچ واسطوں سے امام سجاد علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ آپ کے دادا سید حسین خامنہ ای (۱۲۵۹ - ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۲۵ق) خامنہ میں پیدا ہوئے اور نجف میں سید حسین کوہ کمری، فاضل ایروانی، فاضل شربیانی، میرزا باقر شکی اور میرزا محمد حسن شیرازی جیسے عظیم اساتذہ سے علم حاصل کیا اور حوزہ علمیہ نجف میں دینی علوم کے مدارج طے کرنے کے بعد اس حوزہ کے مدرسین اور فقہاء میں شامل ہوئے۔ وہ ۱۳۱۶ھ ق میں تبریز آئے[۱] اور مدرسۂ طالبیہ کے استاد اور اس شہر کی جامع مسجد کے امام جماعت بنے[۲]۔ سید حسین اعلیٰ سیاسی و اجتماعی افکار کے حامل اور آئینی تحریک کے طرفدار علماء میں سے تھے اور ہمیشہ لوگوں کو آئینی تحریک کی حمایت و پاسداری کرنے کی ترغیب دلاتے تھے[۳]۔ ریاض المسائل، قوانین الاصول، مکاسب شیخ انصاری، فوائد الاصول اور شرح لمعہ جیسی کتابوں پر ان کے حاشیہ سمیت ان کی بعض کتابیں حسینیہ شوشتری نجف کے کتابخانہ کو وقف کر دی گئیں[۴]۔ آئینی تحریک کے دور کے مجاہد عالم دین شیخ محمد خیابانی ان کے شاگرد اور داماد تھے[۵]۔ آیت اللہ سید علی خامنہ ای کے چچا سید محمد

---

۱. آقا بزرگ، طبقات اعلام الشیعہ، ج ۲، ص ۶۴۰۔
۲. گلشن ابرار، ج ۲، ۹۷۱۔
۳. مرکز اسناد، شمارہ ۱۲۲۵۔
۴. طبقات اعلام الشیعہ، ج ۲، ص ۶۴۰۔
۵. کسروی، احمد، قیام شیخ محمد خیابانی، ص ۹۲۔

خامنہ ای (۱۲۹۳ق، نجف - شعبان ۱۳۵۳، نجف) جو پیغمبر کے نام سے مشہور تھے[۱]، آخوند خراسانی، شریعت اصفہانی اور نجف کے دیگر بزرگ علماء کے شاگرد تھے۔ اور زمانے کے مسائل سے آگاہ شخص اور آئینی تحریک کے حامی افراد میں شمار ہوتے تھے[۲]۔

آیت اللہ خامنہ ای کے والد سید جواد خامنہ ای، (۱۶ آذر ۱۲۷۴ - تیر ۱۳۶۵) اپنے زمانے کے ان علماء اور مجتہدین میں سے تھے جو نجف میں پیدا ہوئے اور بچپن میں ہی اپنے گھر والوں کے ساتھ تبریز آ گئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تقریباً ۱۳۳۶ ہجری میں مشہد ہجرت کی[۳] اور فقہ واصول میں آقا حسین قمی، میرزا محمد آقازادۂ خراسانی (کفائی)، میرزا مہدی اصفہانی اور حاج فاضل خراسانی اور فلسفہ میں آقا بزرگ حکیم شہیدی اور شیخ اسد اللہ یزدی جیسے علماء کے دستر خوان علم سے خوشہ چینی کی[۴]۔ اس کے بعد ۱۳۴۵ق میں نجف چلے گئے اور میرزا محمد حسین نائینی، سید ابوالحسن اصفہانی اور آقا ضیاء الدین عراقی کے دروس سے کسب فیض کیا اور ان تینوں شخصیات سے اجازۂ اجتہاد حاصل کیا[۵] اور مشہد واپس آ گئے اور اسی شہر میں سکونت اختیار کی اور تدریس کے ساتھ ساتھ، مسجد صدیقی ہای بازار مشہد (مسجد آذر بائیجانی ہا) میں امامت کا منصب بھی سنبھالا[۶]۔ اسی طرح وہ مسجد جامع گوہر شاد کے ائمہ جماعت میں بھی شامل تھے[۷]۔ انہیں مطالعہ میں بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ حاج میرزا حسین عبائی، حاج سید علی اکبر خوئی، حاج میرزا حبیب اللہ ملکی وغیرہ سمیت اپنے ساتھیوں اور ہم جماعتوں کے ساتھ ان کے روزانہ کے علمی مباحثے دسیوں سال جاری رہے۔ وہ اسی طرح ایک پرہیزگار اور دنیوی امور سے لاتعلق شخص تھے اور انہوں نے ایک زاہدانہ زندگی بسر کی[۸]۔ اسلامی

---

۱. بہبودی، ہدایت اللہ، شرح اسم، ص ۱۲۔
۲. طبقات اعلام الشیعہ، ج ۶، مقدمہ، ص ۱۳۔
۳. مرکز اسناد، شمارہ ۱۲۲۵۔
۴. شریف رازی، محمد، گنجینۂ دانشمندان، ج ۷، ص ۱۲۷-۱۲۹؛ زنگنہ قاسم آبادی، ابراہیم، مشاہیر مدفون در حرم رضوی، ج ۱، ص ۱۳۲۔
۵. گنجینۂ دانشمندان، ج ۷، ص ۱۲۷؛ آرکائیو مرکز اسناد، شمارہ ۱۲۲۵۔
۶. شرح اسم، ص ۱۵۔
۷. مشاہیر مدفون در حرم رضوی، ج ۱، ص ۷۷۔
۸. گلشن ابرار، ج ۲، ۹۷۱۔

انقلاب کی کامیابی کے بعد اس کے باوجود کہ ان کے بیٹے اعلی سیاسی و انتظامی عہدوں تک پہنچے، انہوں نے بدستور زاہدانہ زندگی بسر کی۔ انسانی کمالات کے حامل ہونے کی بناپر وہ ہمیشہ لوگوں کے لیے قابل اعتماد تھے۔ ۱۴ تیر ۱۳۶۵ کو انتقال ہوا اور امام رضا علیہ السلام کی ضریح کے قریب ایک شبستان (رواق) میں انہیں سپرد خاک کیا گیا[۱]۔ امام خمینی(رہ) نے آیت اللہ خامنہ ای کے والد کے انتقال کی مناسبت سے ان کے نام اپنے تعزیتی پیغام میں، آیت اللہ سید جواد خامنہ ای کو ایک متقی اور فرض شناس عالم قرار دیا[۲]۔

آیت اللہ خامنہ ای کی والدہ بانو میر دامادی (۱۲۹۳-۱۳۶۸ ش) ایک زاہدہ اور دیندار خاتون، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والی اور قرآنی آیات، احادیث، تاریخ اور ادبیات سے واقف و آشنا تھیں۔ وہ پہلوی حکومت کے خلاف جدوجہد کے دوران اپنے بیٹوں خاص طور پر آیت اللہ خامنہ ای کے ہم قدم رہیں[۳]۔ آیت اللہ خامنہ ای کے نانا آیت اللہ سید ہاشم نجف آبادی (میر دامادی)۔ صفوی دور کے مشہور فلسفی میر داماد کے خاندان سے تھے۔ (۱۳۰۳-۱۳۸۰ق)۔ آپ آخوند خراسانی اور میرزا محمد حسین نائینی کے شاگرد، مفسر قرآن اور مسجد گوہر شاد کے ائمہ جماعت میں سے تھے[۴]، اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر خاص توجہ دیتے تھے اور رضا شاہ کے دور میں مسجد گوہر شاد میں عوام کے قتل عام پر اعتراض اور احتجاج کے بعد انہیں سمنان جلاوطن کر دیا گیا[۵]۔ آیت اللہ خامنہ ای کا نسب والدہ کی جانب سے امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرزند محمد دیباج تک پہنچتا ہے[۶]۔

علمی و ثقافتی شخصیت

حصول علم اور تدریس: سید علی خامنہ ای نے حصول علم کا آغاز چار سال کی عمر میں مکتب خانہ سے اور قرآن کریم کی تعلیم سے کیا۔ پرائمری اسکول کی تعلیم مشہد کے پہلے اسلامی مدرسے دار التعلیم دینانتی میں حاصل

---

۱. مشاہیر مدفون در حرم رضوی، ج۱، ص ۷۷۔
۲. صحیفہ نور، ج ۲۰، ص ۱۷۔
۳. مرکز اسناد، شمارہ ۱۲۲۶۔
۴. طبقات اعلام الشیعہ، ج ۲، ص ۵۵۹۔
۵. تاریخ علماء، ص ۳۰۸؛ قاسمپور، داود، دہۂ سرنوشت ساز، ص ۶۰۔
۶. مشاہیر مدفون در حرم رضویہ، ج۱، ص ۴۵۸۔

کی[۱]۔ انہی دنوں قرآن کی قرائت اور تجوید کی تعلیم مشہد کے بعض قاریوں سے حاصل کرنا شروع کی[۲]۔ پانچویں کلاس میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنا بھی شروع کر دی۔ دینی تعلیم کی جانب ان کی بے پناہ رغبت اور والدین کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے پرائمری تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدرسہ سلیمان خان میں داخلہ لے لیا۔ انہوں نے بعض ابتدائی دینی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ اس کے بعد وہ مدرسہ نواب چلے گئے اور دورۂ سطح وہاں پر مکمل کیا۔ دینی تعلیم حاصل کرنے کے دوران انہوں نے میٹرک تک تعلیم کو جاری رکھا[۳]۔

انہوں نے کتاب معالم الاصول آیت اللہ سید جلیل حسینی سیستانی اور شرح لمعہ اپنے والد اور میرزا احمد مدرس یزدی سے پڑھیں۔ کتاب رسائل، مکاسب اور کفایہ بھی اپنے والد اور آیت اللہ حاج شیخ ہاشم قزوینی سے پڑھیں۔ ۱۳۳۴ ش میں آیت اللہ سید محمد ہادی میلانی کے درس خارج فقہ میں حاضر ہوئے۔ آپ ۱۳۳۶ ش میں اپنے گھر والوں کے ساتھ نجف گئے اور آیت اللہ سید محسن حکیم، سید ابوالقاسم خوئی، سید محمود شاہرودی، میرزا باقر زنجانی اور میرزا حسن بجنوردی جیسے حوزہ علمیہ نجف کے نامور اساتذہ کے دروس میں شامل ہوئے لیکن ان کے والد نے اس شہر میں نہ رہنے کا فیصلہ کیا اور وہ مشہد واپس لوٹ آئے[۴] اور مزید ایک سال آیت اللہ میلانی کے درس میں شرکت کی۔ اس کے بعد ۱۳۳۷ ش میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں حوزہ علمیہ قم چلے گئے[۵]۔ اسی سال اور قم روانہ ہونے سے قبل، آیت اللہ محمد ہادی میلانی نے انہیں اجازۂ روایت دے دی تھی[۶]۔

سید علی خامنہ ای نے قم میں آیت اللہ حاج آقا حسین بروجردی، امام خمینی، حاج شیخ مرتضی حائری یزدی، سید محمد محقق میر داماد اور علامہ طباطبائی جیسے عظیم علماء سے علم حاصل کیا[۷]۔ قم میں قیام کے دوران

---

۱. مرکز اسناد، شمارہ ۱۲۲۵۔
۲. شرح اسم، ص ۴۹۔
۳. مرکز اسناد، ۱۲۲۶۔
۴. ایضاً، ۱۲۲۶۔
۵. شرح اسم، ص ۷۸۔
۶. مرکز اسناد، شمارہ ۱۲۳۲۔
۷. ایضاً، شمارہ ۱۲۲۷۔

انہوں نے اپنا بیشتر وقت تحقیق، مطالعہ اور تدریس میں گزارا۔ آیت اللہ خامنہ ای ۱۳۴۳ ش. میں اپنے والد کی آنکھوں کے عارضہ کی بنا پر اور ان کی مدد کرنے کے لیے قم سے مشہد واپس چلے گئے اور ایک بار پھر آیت اللہ میلانی کے درس میں شرکت کی اور یہ سلسلہ ۱۳۴۹ ش. تک جاری رہا۔ انہوں نے مشہد میں آتے ہی فقہ و اصول کے اعلیٰ سطح کے درس (رسائل، مکاسب اور کفایہ) کی تدریس اور سب لوگوں کے لیے تفسیر کے درس شروع کیے۔ ان درسوں میں نوجوانوں خاص طور پر طالب علموں کی ایک بڑی تعداد شرکت کرتی تھی[۱]۔ وہ اپنے تفسیر کے دروس میں قرآنی آیات کی رو سے اسلام کی اہم ترین فکری بنیادوں اور اسلامی نظریات کو بیان کرتے تھے اور جدوجہد کی سوچ کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ طاغوتی حکومت کے خاتمے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے دروس میں شرکت کرنے والے اس ضروری اور فطری نتیجے پر پہنچتے تھے کہ ملک میں اسلام اور دینی تعلیمات کی بنیاد پر ایک حکومت قائم ہونی چاہیے۔ تفسیر کے دروس سے ان کا اصلی مقصد معاشرے کو اسلامی انقلاب کی بنیادی تعلیمات منتقل کرنا تھا۔ انہوں نے ۱۳۴۷ ش. سے دینی طلبا کے لیے بھی تفسیر کے تخصصی دروس شروع کر دیے جو ۱۳۵۶ ش. میں ان کی گرفتاری اور ایرانشہر جلاوطنی تک جاری رہے[۲]۔ ان کے تفسیر کے دروس دورۂ صدارت کے برسوں میں اور اس کے بعد بھی جاری رہے۔ آیت اللہ خامنہ ای نے ۱۳۶۹ ش. سے فقہ کا درس خارج بھی شروع کیا اور اب تک جہاد، قصاص اور مکاسب محرمہ کی تدریس کر چکے ہیں اور یہ دروس اب بھی جاری ہیں۔

آیت اللہ خامنہ ای ادبیات سے بھی شغف رکھتے ہیں اور ادبی سبک و اسلوب سے آشنا ہیں اور ان کی نثر خاص اسلوب کی حامل ہے۔ انہیں بچپن سے لے کر اب تک ناولوں اور کہانیوں سے دلچسپی رہی ہے اور انہوں نے دنیا کے معتبر ناولوں اور کہانیوں کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ دلچسپی انہیں مشرق اور مغرب کی اقوام کی ثقافت اور تاریخ نیز دنیا کے عظیم مصنفین کی ادبی تخلیقات اور ناولوں کے مطالعہ تک لے گئی۔ وہ شعر و ادب کی کتابوں کا تنقیدی جائزہ بھی لیتے ہیں۔ آیت اللہ خامنہ ای اپنے زمانے کے بہت سے شاعروں، ادیبوں، مصنفین اور روشن خیال افراد سے رابطہ میں تھے۔ جن دنوں وہ مشہد میں تھے بعض ایسی ادبی انجمنوں میں

---

۱. مرکز اسناد، شمارہ ۱۲۲۸۔
۲. خامنہ ای، جم۔

شرکت کرتے تھے جو عظیم شعراء کی شرکت سے تشکیل پاتی تھیں[۱]۔ وہ ادبی انجمنوں میں شعروں کا تنقیدی جائزہ لیتے تھے۔ انہوں نے خود بھی شعر کہے ہیں اور حالیہ برسوں کے دوران اپنے لیے «امین» کا تخلص چنا ہے۔ معتبر تاریخی کتب کا مطالعہ ان کے مطالعہ کے مستقل پروگرام کا ایک حصہ ہے، یہاں تک کہ انہیں معاصر تاریخ کی بحثوں اور موضوعات پر عبور حاصل ہے[۲]۔

تصنیفات: آیت اللہ خامنہ ای نے تحقیق و تالیف کا کام زمانہ طالب علمی سے ہی شروع کر دیا تھا اور وہ اپنے اساتذہ کے دروس لکھا کرتے تھے[۳]۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی سے قبل انہوں نے جو کتابیں تالیف کیں وہ درج ذیل ہیں: ۱۔ چھار کتاب اصلی علم رجال، ۲۔ طرح کلی اندیشہ اسلامی در قرآن، ۳۔ پیشوای صادق، ۴۔ از ژرفای نماز، ۵۔ صبر، ۶۔ روح توحید نفی عبودیت غیر خدا، ۷۔ گزارشی از سابقۂ تاریخی و اوضاع کنونی حوزۂ علمیۂ قم۔

اسی دور میں انہوں نے ان کتابوں کو اپنی تحقیقات میں شامل کر کے، ترجمہ اور انہیں شائع کیا: ۱۔آیندہ در قلمرو اسلام، تصنیف سید قطب؛ ۲۔ صلح امام حسن: پرشکوہ ترین نرمش قہرمانانۂ تاریخ، تصنیف شیخ راضی آل یاسین؛ ۳۔ تفسیر فی ظلال القرآن، نوشتۂ سید قطب؛ ۴۔ مسلمانان در نہضت آزادی ہندوستان، تصنیف عبدالمنعم النمر؛ ۵۔ ادعانامہ علیہ تمدن غرب۔

ان کے علاوہ آیت اللہ خامنہ ای کے بہت سے آراء و نظریات کہ جو تقریر، تحریر، پیغام، گفتگو، خطبات اور انٹرویوز کی شکل میں ہیں، کتاب اور سافٹ ویئر کی شکل میں مختلف عناوین کے تحت اور موضوعاتی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور ان میں سے بعض کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اسی طرح ان کے افکار و نظریات کے بارے میں مختلف مقالات، رسالے اور کتابیں بھی تالیف اور تدوین ہو چکی ہیں؛ اس کے علاوہ ان کی قیادت و رہبری کے دور میں ان کے بیانات اور مکتوبات کا ایک حصہ حدیث ولایت کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

---

۱. مرکز اسناد، شمارہ ۱۲۲۷۔
۲. تداوم انقلاب، ص۲۱۔
۳. مرکز اسناد، شمارہ ۱۲۲۸۔

سیاسی و سماجی زندگی

آیت اللہ خامنہ ای کے خاندان کی سیاسی و مذہبی سرگرمیوں کے ماضی نے ان میں سیاسی و مذہبی جدوجہد کے لیے تربیتی راستہ ہموار کر دیا تھا۔ سیاسی سرگرمیوں میں شامل ہونے کا ان کا نقطۂ آغاز مشہد میں سید مجتبیٰ نواب صفوی (میر لوحی) سے ان کی ملاقات تھی کہ خود ان کے بیان کے مطابق اس ملاقات نے ان میں پہلی انقلابی چنگاری پیدا کی[۱]۔ امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی پہلی ملاقات ۱۳۳۶ ش. میں ہوئی لیکن امام خمینی کا سیاسی چہرہ پہلی بار صوبائی انجمنوں کے بل کے دوران ان کے سامنے آیا[۲]۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی سے قبل

آیت اللہ خامنہ ای ۱۳۴۱ ش. میں امام خمینی کی قیادت میں اسلامی تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی طاغوت کے خلاف جدوجہد کے مختلف میدانوں میں داخل ہو گئے۔ وہ ان اولین افراد میں سے تھے جنہوں نے ۱۵ خرداد ۱۳۴۲ ش. کے قیام سے قبل انقلابی سرگرمیاں شروع کر دی تھیں[۳]۔ بہمن ۱۳۴۱ میں صوبائی انجمنوں کے بل کے بارے میں ریفرنڈم کے بعد آیت اللہ خامنہ ای اور ان کے بھائی سید محمد کو، اس ریفرنڈم پر مشہد کے عوام کے رد عمل کے بارے میں آیت اللہ محمد ہادی میلانی کی رپورٹ ایک خط کی شکل میں امام خمینی تک پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی[۴]۔ ۱۳۴۲ ش. میں محرم الحرام سے قبل امام خمینی نے انہیں ذمہ داری سونپی کہ وہ آیت اللہ میلانی، مشہد کی مذہبی انجمنوں اور علمائے کرام کو پہلوی حکومت کے پروپیگنڈے کے بارے میں عوام کو آگاہ کرنے اور تحریک کو جاری رکھنے کے سلسلے میں پیغامات پہنچائیں[۵]۔ امام خمینی نے ان پیغامات میں جدوجہد کے خدوخال واضح کیے اور علمائے کرام سے اپیل کی تھی کہ وہ پہلوی حکومت کے مظالم و جرائم کو بیان کرنے کے مقصد سے مدرسۂ فیضیہ کے واقعہ کا ذکر سات محرم سے منبروں سے بیان کریں[۶]۔

---

۱. مرکز اسناد، شمارہ ۱۲۲۶۔
۲. ایضاً، شمارہ ۱۲۲۸۔
۳. ایضاً، شمارہ ۱۱۹۔
۴. جلالی، غلامرضا، مشہد در بامداد نہضت اسلامی، ص ۱۴۸۔
۵. مرکز اسناد، شمارہ ۱۲۲۹، ۱۲۳۱۔
۶. باقری، علی، خاطرات ۱۵ خرداد قم، ص ۱۲-۱۳۔

آیت اللہ خامنہ ای بھی اس مقصد کو پورا کرنے اور امام خمینی کی حکمت عملی پر درآمد کے لیے بیر جند گئے جو خاندان علم کے زیر اثر تھا اور اس شہر کے منبروں پر اور مجالس میں مدرسۂ فیضیہ کے واقعہ اور اسلامی معاشروں پر اسرائیل کے تسلط کے بارے میں تقریریں کیں[۱]۔ ان تقریروں کے بعد انہیں ۱۲ خرداد ۱۳۴۲ ش/ ۷ محرم ۱۳۸۳ ھ کو گرفتار کرکے مشہد کے جیل میں ڈال دیا گیا[۲]۔ ان کی رہائی کے بعد آیت اللہ میلانی نے ان سے ملاقات کی[۳]۔ آیت اللہ خامنہ ای نے اس کے بعد امام خمینی کی غیر موجودگی میں جو اس وقت قید میں اسلامی تحریک کو جاری رکھنے کی غرض سے آیت اللہ میلانی کے گھر پر ہونے والے اجلاس میں شرکت کرکے اپنی سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھا[۴]۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد وہ قم واپس چلے گئے اور انہوں نے بعض مجاہد علماء کی مدد اور تعاون سے مشاورتی اجلاس منعقد کرکے سیاسی سرگرمیوں کو ایک بار پھر منظّم کیا اور تبلیغ کا کام انجام دیا[۵]۔ وہ ان علماء میں شامل تھے جنہوں نے ۱۱ دی ۱۳۴۲ ش/۱۹۶۳ء کو آیت اللہ سید محمود طالقانی، مہدی بازرگان اور یداللہ سحابی کے نام ٹیلی گرام ارسال کیا جو امام خمینی کی حمایت کرنے کی بناپر جیل میں تھے[۶]۔ اسی زمانے میں حوزہ علمیہ قم کے خراسان سے تعلق رکھنے والے طلبا نے ان کی ہدایت اور رہنمائی سے اس وقت کے وزیراعظم حسن علی منصور کے نام امام خمینی کی گرفتاری جاری رہنے کے خلاف ایک احتجاجی خط تحریر اور شائع کیا۔ ان طلبا میں خود وہ، ابوالقاسم خزعلی اور محمد عبائی خراسانی شامل تھے[۷]۔ آیت اللہ خامنہ ای بہمن ۱۳۴۲ ش/ رمضان المبارک ۱۳۸۰ ھ کو دین کی تبلیغ اور اسلامی تحریک کے مسائل کو بیان کرنے کے لیے زاہدان گئے[۸]۔ زاہدان کی مساجد میں ان کی تقریروں اور عوام کی جانب سے ان کو کیے جانے کی بناپر حکومت نے ان کو گرفتار کرکے قزل قلعہ جیل میں ڈال دیا جہاں اس زمانے میں سیاسی

---

۱. شرح اسم، ص ۱۲۹- ۱۳۴۔
۲. مرکز اسناد، شمارہ ۶۱۴، ۱۲۳۱، ۱۳۳۲۔
۳. ایضاً، شمارہ ۱۲۳۳۔
۴. مشہد در بامداد نہضت اسلامی، ص ۲۰۵۔
۵. شرح اسم، ص ۱۵۶، ۱۵۷۔
۶. یاران امام، طالقانی، ج۱، ص ۴۶۸/۱۔
۷. صحیفہ نور، ج۴، ص ۳۹۲۔
۸. شرح اسم، ص ۱۶۲، ۱۶۶۔

قیدیوں کو رکھا جاتا تھا[۱]۔ ۱۴ اسفند ۱۳۴۲ ش/۱۹۶۳ء کو انہیں اس شرط پر جیل سے رہا کر دیا گیا کہ وہ تہران کی حدود سے باہر نہیں جائیں گے[۲]۔ اس کے بعد اسلامی انقلاب کی کامیابی تک سیکورٹی اہلکاروں نے ان کی سرگرمیوں کی مسلسل نگرانی کی۔

آیت اللہ خامنہ ای ۱۳۴۳ ش/۱۹۶۴ء کے موسم خزان میں قم سے واپس مشہد چلے گئے اور اپنے والد کی دیکھ بھال کرنے کے ساتھ ساتھ علمی و سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں[۳]۔ ان کا شمار ان علماء میں ہوتا تھا جنہوں نے امام خمینیؒ کی ترکی جلاوطنی کے کچھ عرصے کے بعد ۲۹ بہمن ۱۳۴۳ ش/۱۹۶۴ء کو اس وقت کی امیر عباس ہویدا کی حکومت کو خط لکھ کر ملک کے ناگفتہ بہ حالات اور امام خمینی کی جلاوطنی پر احتجاج کیا[۴]۔ وہ عبدالرحیم ربانی شیرازی، محمد حسینی بہشتی، علی فیض مشکینی، احمد آذری قمی، علی قدوسی، اکبر ہاشمی رفسنجانی، سید محمد خامنہ ای اور محمد تقی مصباح یزدی کے ہمراہ[۵] اس گیارہ رکنی گروہ کا حصہ تھے جو پہلوی حکومت کا مقابلہ کرنے اور حوزہ علمیہ قم کی اصلاح اور اس کی تقویت کے مقصد سے تشکیل پایا تھا۔ جدوجہد فکر و عقیدے کی بنیاد پر تھی اور یہی امر اس کی پیشرفت اور آگے بڑھنے کا باعث بنا تھا اور علماء بھی جدوجہد کے روح رواں تھے۔ وہ جدوجہد کے اس مرحلے میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ تنظیم کے نہ ہونے سے انہیں کم کامیابی حاصل ہو گی اور اس کا ہونا اس بات کا باعث بنے گا کہ حکومت کی جانب سے جدوجہد کو ختم ہونے سے روکا جاسکے۔ اس گروہ نے امام خمینی کی جلاوطنی کے زمانے میں جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے منصوبہ بندی کرنے کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس گروہ کو حوزہ علمیہ قم کی پہلی خفیہ تنظیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس گروہ کی سرگرمیوں کا ساواک نے ۱۳۴۵ ش/۱۹۶۶ء میں پتہ لگایا اور اس کے بعد اس کے بعض ارکان گرفتار کر لیے گئے اور آیت اللہ خامنہ ای سمیت بعض دیگر ارکان مطلوب قرار پائے[۶]۔ آیت اللہ خامنہ ای نے روپوشی کے

---

۱. مرکز اسناد، شمارہ ۱۲۳۴۔
۲. شرح اسم، ص ۱۸۷۔
۳. ایضاً، ۱۹۲، ۱۹۵۔
۴. اسناد انقلاب، ج ۳، ص ۱۲۸-۱۳۰۔
۵. ہاشمی رفسنجانی، اکبر، دوران مبارزہ، ج ۲، ص ۱۵۶۶۔
۶. یاران امام، قدوسی، ص ۸۶-۸۷؛ وہی حوالہ، ربانی، ص ۶۹، ۶۰۔

ان ایام میں کتاب «آیندہ در قلمرو اسلام» کے ترجمہ اور اشاعت کا کام انجام دیا۔ اس کتاب میں دو اہم موضوعات مغرب کے دباؤ اور کمیونزم کے پروپیگنڈے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور مستقبل کے بارے میں بتایا گیا ہے جو اسلام کی طرف جا رہا ہے[۱]۔ ساواک نے کتاب کو ضبط اور اس کو شائع کرنے والے افراد کو گرفتار کر لیا لیکن وہ (کتاب کے مترجم) آیت اللہ خامنہ ای کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی[۲]۔ آیت اللہ خامنہ ای ان دنوں میں کچھ عرصہ تہران اور کرج میں سرگرمیوں میں مصروف رہے لیکن حکومت مخالف باتیں نہ کرنے کا وعدہ نہ کرنے کی بنا پر کرج میں ان کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ تہران کی امیر المؤمنین مسجد میں کچھ عرصہ امامت کے فرائض انجام دیئے۔ فروردین ۱۳۴۶ ش/۱۹۶۷ء میں مشہد کی مسجد گوہر شاد میں حکومت مخالف تقریر کرنے کے نتیجے میں آیت اللہ سید حسن قمی کی گرفتاری اور جلاوطنی کے بعد آیت اللہ خامنہ ای نے آیت اللہ میلانی سے درخواست کی کہ وہ اس اقدام پر احتجاج کریں[۳]۔ ان کے اس اقدام کی وجہ سے ساواک کے اہلکاروں کو ان کی مشہد میں موجودگی کی اطلاع ہو گئی اور اسی سال ۱۴ فروردین کو آیت اللہ شیخ مجتبیٰ قزوینی کے جنازہ کے جلوس کے موقع پر انہیں گرفتار کر لیا گیا[۴]۔ انہیں اسی سال ۲۶ تیر کو رہا کر دیا گیا[۵]۔ رہائی کے کچھ عرصے کے بعد تہران میں سیاسی قیدیوں سے ملاقات کے لیے گئے[۶]۔

آیت اللہ خامنہ ای نے مختلف علاقوں میں مجاہدین کے ساتھ رابطے کے ذریعے انہیں اور جدوجہد کو منظم شکل دینے، مجاہدین اور انقلابیوں کی نئی نسلوں خاص طور پر دینی طلبا اور یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کی اسلامی نظریے کی بنیاد پر تربیت کرنے اور جدوجہد کے بنیادی اصولوں کو قرآن وحدیث سے حاصل کرنے، مادیت پسندی، مارکسزم اور لبرلیزم اور ان جیسے نظریات کا مقابلہ کرنے نیز امام خمینی کی تحریک کے تناظر میں جدوجہد اور اسلامی سوچ کو راسخ کرنے کی کوشش کی اور پہلوی حکومت کی کوششوں کے باوجود بہت

---

۱. آیندہ در قلمرو اسلام۔
۲. شرح اسم، ص ۲۳۵-۲۳۸۔
۳. یاران امام، میلانی، ۳/۷، ۵۔
۴. مرکز اسناد، شمارہ ۶۱۴۔
۵. ایضاً، شمارہ ۵۷۴۔
۶. بازرگان، مہدی، یادداشتہای روزانہ، ص ۴۲۳، ۴۲۲۔

زیادہ کامیابیاں حاصل کیں۔ جد وجہد کے بارے میں ان کی ہمہ گیر نظر، امام خمینیؒ کی تحریک کی اطلاع رسانی کے عظیم نیٹ ورک اور منبر کے پلیٹ فارم سے بھرپور استفادہ اس کے علاوہ ان کی عمل پسندی، ان کی کامیابی کے بعض اسباب ہیں۔

۹ شہریور ۱۳۴۷ ش/۱۹۶۸ء کو خراسان کے جنوب میں آنے والے تباہ کن زلزلے کے بعد آیت اللہ خامنہ ای کی سرپرستی میں خراسان کے علماء کا ایک وفد زلزلے سے متاثرہ افراد کی مدد اور امدادی سامان کی تقسیم کے کام میں مدد دینے کے لیے فردوس روانہ ہوا۔ ان کے اس اقدام کی مقامی حکام نے مخالفت کی لیکن امدادی گروہ نے زلزلہ زدگان کی امداد کے سلسلے میں مؤثر اقدامات انجام دیے۔ فردوس میں آیت اللہ خامنہ ای کی دو ماہ موجودگی اور امداد رسانی کے کاموں کی وجہ سے انہیں زلزلہ زدگان کی مشکلات کو قریب سے جاننے کا موقع ملا اور وہ ان سے مانوس ہو گئے اور مجالس میں اور منبروں پر اور اسی طرح مذہبی انجمنوں میں عوام کے سامنے اسلامی تحریک کا پیغام بیان کیا۔ ان سرگرمیوں کی وجہ سے خراسان کی پولیس اور خفیہ ادارے ساواک حساس ہو گئے اور انہوں نے فردوس میں ان کا قیام ختم کر دیا[۱]۔ انہوں نے اسی سال دی ماہ کے اواخر میں عراق کے مقدس مقامات کی زیارت اور امام خمینی(رہ) سے ملاقات کا ارادہ کیا لیکن ساواک نے اس کی مخالفت کی اور آپ کے وہاں جانے پر پابندی لگادی جو اسلامی انقلاب کی کامیابی تک جاری رہی[۲]۔

آیت اللہ خامنہ ای کو «گیارہ رکنی گروہ» میں رکنیت کے الزام میں چھ ماہ قید کی سزا سنائی گئی۔ روزنامہ کیہان میں اس خبر کی اشاعت اور آیت اللہ خامنہ ای کو اپیل کورٹ میں طلب کیے جانے کے بعد انہوں نے مشہد کے بعض علماء سے مشورہ کرنے کے بعد عدالت میں حاضر ہونے سے گریز کیا[۳]۔ اس کے باوجود کہ وہ مطلوب تھے لیکن سید محمود طالقانی، سید محمد رضا سعیدی، محمد جواد باہنر، محمد رضا مہدوی کنی، مرتضیٰ مطہری، اکبر ہاشمی رفسنجانی اور فضل اللہ محلاتی جیسے بعض مجاہد علماء کے ساتھ ان کے مشہد اور تہران میں رابطے تھے اور مشہد میں مقیم ہونے کے باوجود وہ تہران کے مجاہد علماء کے بہت سے اجلاس میں شرکت کرتے تھے[۴]۔ وہ

---

۱. مرکز اسناد، شمارہ ۶۱۴۔
۲. شرح اسم، ص ۳۰۴۔
۳. یاران امام، ہاشمی نژاد، ص ۲۴۸،۲۴۹۔
۴. یاران امام، سعیدی، ص ۲۴۸؛ وہی حوالہ، باہنر، ص ۳۵۵۔

بعض علماء کے ساتھ اجلاس منعقد کرکے علماء اور دینی طلبا کو مشہد کے نواحی دیہاتوں میں بھیجنے کا فیصلہ کرتے اور اس سلسلے میں اقدام کرتے تھے[۱]۔

آیت اللہ خامنہ ای نے اسلامی تحریک پر اعتقادی نگاہ کے ساتھ اور اس کی بنیاد پر لوگوں کی فکری تربیت کرکے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ وہ دینی علوم اور یونیورسٹی کے طلبا کے لیے تفسیر قرآن کی کلاسوں کا اہتمام اور عوام کے مختلف طبقات کے لیے تقریریں کرکے ان کی دینی اور اعتقادی بنیادوں کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ثقافتی کوششوں کے ذریعے اسلامی امنگوں اور آرزؤں کو حاصل کرنا ممکن ہے اور علم وآگہی کو فروغ دیے بغیر عوامی تحریکوں کو آگے نہیں بڑھایا جاسکتا۔ اس وقت روشن خیالی کی تحریک یونیورسٹیوں میں ایک فعال تحریک سمجھی جاتی تھی۔ اس تحریک کو مارکسزم سوچ کی حامی سیاسی تحریکوں کی سرگرمیوں کے رد عمل میں ضروری سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اسلامی مفکرین اور مجاہدین کی مدد سے علمی سرگرمیاں انجام دیں اور نشستیں منعقد کیں[۲]۔

آیت اللہ خامنہ ای کا جدوجہد کے میدان میں بہت سے مشہور روشن خیال افراد اور روشن خیالی کے مراکز کے ساتھ بھی رابطہ تھا اور وہ ان سے تعاون کرتے تھے۔ انہیں ۱۳۴۸ ش/۱۹۶۹ء کو جدوجہد کے موضوع پر تقریر کرنے کے لیے تہران میں حسینیہ ارشاد اور مسجد الجواد سمیت بعض فعال سیاسی و اسلامی مراکز میں دعوت دی گئی[۳]۔ آیت اللہ مرتضیٰ مطہری کی دعوت پر ۱۳۴۸ ش/۱۹۶۹ء میں حسینیہ ارشاد اور انجینیروں کی انجمن اسلامی کی دعوت پر تہران کی مسجد الجواد میں ان کی تقریریں نوجوان نسل خاص طور پر اسکولوں اور یونیورسٹی کے طلبا کو آگاہ و باخبر کرنے میں بہت مؤثر واقع ہوئیں[۴]۔ آیت اللہ خامنہ ای نے بہار ۱۳۴۹ ش/۱۹۷۰ء میں اسلامی تحریک کے عمل کو گہرا کرنے اور پہلوی حکومت کے خلاف اعتقادی جدوجہد کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لیے نشستیں منعقد کرنے کی بنیاد رکھی جن میں مرتضیٰ مطہری، سید محمود طالقانی، سید ابوالفضل زنجانی، مہدی بازرگان، اکبر ہاشمی رفسنجانی، یداللہ سحابی، عباس شیبانی اور کاظم سامی

---

۱. یاران امام، ص ۳۶۳؛ وہی حوالہ، مہدوی، ص ۱۱۴
۲. شرح اسم، ص ۳۲۷،۳۲۶۔
۳. ایضاً، ص ۳۳۲،۳۳۱۔ ۴۷۱،۴۷۰۔
۴. جودکی، ص ۲۳؛ یاران امام، ہاشمی نژاد، ص ۳۰۷،۳۰۶۔

جیسے افراد کو دعوت دی گئی اور ان میں اسلامی آئیڈیالوجی اور نظریہ کائنات کی تدوین پر مبنی اپنی جدوجہد کے نظریہ کو بحث کے لیے پیش کیا۔ ان نشستوں کے نتیجے میں اسلامی آئیڈیالوجی اور نظریہ کائنات کی تدوین انجام پائی[۱]۔

انہوں نے اسی زمانے میں اور ۲۰ خرداد ۱۳۴۹ ش/۱۹۷۰ء میں ساواک کے ہاتھوں آیت اللہ سید محمد رضا سعیدی کی شہادت کے بعد جو اس زمانے میں امام خمینی کی مرجعیت کے اہم ترین مروجین اور مبلغین میں سے تھے، دیگر مجاہدین کے ساتھ مل کر ان کی شہادت کے خلاف عوامی رد عمل اور احتجاج کی رہنمائی کر کے اس موقع سے جدوجہد کے حق میں فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

اس زمانے میں آپ کی کوششوں کے نتیجے میں دینی طلبا نے امام خمینی کی حمایت اور حکومت اور ساواک پر تنقید اور مخالفت میں پمفلٹ اور ہینڈ بل شائع کیے[۲]۔ اس کے بعد جدوجہد اور احتجاج میں شدت آنے سے[۳] مشہد کی ساواک نے ۲ مہر ۱۳۴۹ ش/۱۹۷۰ء کو انہیں گرفتار کر لیا اور ایک عرصے تک مشہد کی خراسان جیل میں قید رکھا[۴]۔ محرم ۱۳۹۱ ھ، اسفند ۱۳۴۹ ش/۱۹۷۱ء میں اس کے باوجود کہ آیت اللہ خامنہ ای پر تقریر کرنے کی پابندی تھی، انہوں نے انجمن انصار الحسین تہران میں تقریریں کیں[۵]۔ آیت خامنہ ای نے ۱۳۵۰ ش/ ۱۹۷۱ میں آیت اللہ طالقانی کی دعوت پر تہران کی مسجد ہدایت میں تقریریں کیں جو مجاہد نوجوانوں اور طلبا کا مرکز تھی[۶]۔

امام خمینی کی جانب سے ڈھائی ہزار سالہ جشن شہنشاہی کے بائیکاٹ کے بعد[۷] ساواک نے مجاہد علماء کی سرگرمیوں کی کڑی نگرانی شروع کر دی۔ اسی کے تحت مرداد ماہ ۱۳۵۰ ش/۱۹۷۱ء کو مشہد کی ساواک نے

---

۱. فارسی، جلال الدین، زوایای جام جم، ص ۲۱۵۔
۲. مرکز اسناد، شم ۱۳۰، ۱۸۳؛ یاران امام، سعیدی، ج ۱، ص ۳۲۔
۳. تقویم، ص ۲۲۵۔
۴. وہی حوالہ، میلانی، ج ۳، ص ۴۲۴، ۴۲۳۔
۵. یاران امام، محلاتی، ج ۲، ص ۳۷۔
۶. یاران امام، باہنر، ص ۵۲۱، ۵۲۰؛ دوران مبارزہ، ج ۲، ص ۱۱۳۴-۱۱۳۵۔
۷. صحیفہ نور، ج ۲، ص ۳۷۳، ۳۵۸۔

انہیں طلب کیا اور ایک عرصے تک انہیں لشکر خراسان جیل میں قید رکھا[۱]۔ انہوں نے رہا ہونے کے بعد اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور اسی سال انہیں مزید دو بار گرفتار کیا گیا؛ ایک مرتبہ آبان کے مہینے میں کچھ عرصے کے لیے لشکر خراسان جیل میں رکھا گیا۔ دوسری بار ۲۱ آذر کو داخلی سلامتی کے خلاف اقدام کرنے کے الزام میں انہیں تین ماہ قید کی سزا دی گئی[۲]۔

انہوں نے رہائی کے بعد اپنی سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا اور انجمن انصار الحسین اور مسجد نارمک تہران کی نشستوں میں کئی بار شرکت کی اور دینی و سیاسی موضوعات پر تقریریں کیں۔ مدرسہ میرزا جعفر، مسجد امام حسن اور مسجد قبلہ کے علاوہ مشہد میں ان کے گھر پر ان کی درس و تفسیر کی کلاسیں جاری رہیں۔ ان نشستوں اور کلاسوں میں اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا، دینی طلبا، نوجوان اور عوام کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگ ان کے مخاطب تھے کہ جن کو وہ سیاسی و انقلابی اسلام کی فکر و سوچ سے آگاہ کرتے تھے۔ ان کے درس اور نشستوں میں شرکت کرنے والے بہت سے افراد اور ان کے شاگردوں نے بعد میں جدوجہد کے عروج کے زمانے میں ملک کے مختلف علاقوں میں انقلابی سرگرمیاں انجام دیں۔ اہلکاروں کی رپورٹوں میں ان کے درسوں اور تقریروں کا کئی بار ذکر کیا گیا۔ ساواک کی نظر میں آیت اللہ خامنہ ای جیسے افراد حوزہ ہائے علمیہ کے روشن خیال اور انقلابی اساتذہ میں شمار ہوتے تھے جو طلبا اور نوجوانوں کے ساتھ رابطہ رکھنے کے ساتھ ساتھ امام خمینی کے نظریات کی ترویج کرنے والے اور دینی طلبا کو سیاسی و سماجی مسائل سے آگاہ کرنے کے خواہش مند تھے[۳]۔

آیت اللہ خامنہ ای فروردین ۱۳۵۲ ش/ مارچ ۱۹۷۳ء میں تبلیغ کے لیے نیشابور گئے اور اس شہر کی مسجد میں ہفتے میں ایک بار ہر منگل کو اصول عقائد کے دروس کا سلسلہ شروع کیا[۴]۔ ماہ خرداد ۱۳۵۲ ش/ ۱۹۷۳ء میں ساواک نے مسجد امام حسن اور ان کے گھر میں ان کے تفسیر کے دروس پر پابندی لگا دی[۵]۔

---

۱. مرکز اسناد، شمارہ ۱۲۳، ۶۱۴۔
۲. ایضاً، شمارہ ۶۱۴۔
۳. یاران امام، میلانی، ج ۳، ص ۵۹۰۔
۴. مرکز اسناد، شمارہ ۵۷۲، ۶۱۴۔
۵. ایضاً، شمارہ ۵۷۲، ۵۷۳، ۶۱۴۔

آیت اللہ خامنہ ای نے آذر ۱۳۵۲ ش. میں مسجد کرامت کے بانی اور واقف کی دعوت پر اس مسجد میں امامت کی ذمہ داری سنبھالی اور اپنے تفسیر کے دروس اسی مسجد میں منتقل کر لیے اور اس مسجد کو نوجوانوں اور طلبا کی سرگرمیوں کے مرکز میں تبدیل کر دیا[۱]۔ ساواک مشہد نے ان کی وسیع پیمانے پر سیاسی سرگرمیوں پر رد عمل ظاہر کرتے ہوئے انہیں اس مسجد میں امامت کے فرائض انجام دینے سے روک دیا[۲]۔

آبان ۱۳۵۳ش/ ۱۹۷۴ء میں مسجد جاوید تہران کے امام جماعت آیت اللہ محمد مفتح کی دعوت پر کہ جن پر ان دنوں منبر پر جانے پر پابندی تھی، اس مسجد میں تقریر کی۔ اس کے بعد ساواک نے آیت اللہ مفتح کو گرفتار اور مسجد جاوید کو جدوجہد کا ایک اہم مرکز ہونے کی وجہ سے بند کر دیا[۳]۔ اسی سال آذر کے مہینے میں ساواک نے آیت اللہ خامنہ ای کے گھر کی بھی تلاشی لی۔ ساواک نے مشہد میں اسلامی تحریک کے اہداف کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں مواقع سے فائدہ اٹھانے اور جدوجہد کو منظّم کرنے کے لیے افرادی قوت تیار کرنے کی ضرورت کے بارے میں خصوصی نشستوں میں ان کے بیانات کو اس تلاشی کی وجہ قرار دیا[۴]۔ آیت اللہ خامنہ ای کو دی ۱۳۵۳ ھ/ ۱۹۷۴ء میں چھٹی بار گرفتار کر لیا گیا اور اس بار انہیں تہران میں انسداد تخریب کاری کی مشترکہ کمیٹی کی جیل میں منتقل کیا گیا[۵] اور خود ان کے بقول قید کی دشوار ترین اور سخت ترین صورت حال کا تجربہ کیا۔ قید کے دوران انہیں کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی اور ان کی صورت حال اور جیل کے بارے میں ان کے اہل خانہ کو بھی اطلاع نہیں دی گئی تھی[۶]۔ انہیں ۲ شہریور ۱۳۵۴ ش. کو رہا کیا گیا لیکن وہ سیکورٹی اہلکاروں کی زیر نگرانی تھے اور نماز جماعت پڑھانے، تقریر و تدریس کرنے اور تفسیر کا درس دینے پر حتیٰ گھر میں بھی پابندی عائد کر دی گئی تھی[۷] لیکن انہوں نے تمام سیکورٹی و سیاسی پابندیوں کے تفسیر کے دروس اور اپنی انقلابی سرگرمیاں خفیہ طور پر جاری رکھیں اور دینی علوم کے طلبا میں امام خمینی کا

---

۱. مرکز اسناد، شمارہ ۶۱۴۔
۲. یاران امام، مطہری، ص ۴۵۵؛ آرکائیو مرکز اسناد، شمارہ ۵۷۳۔
۳. نیکبخت، رحیم، زندگی و مبارزات آیت اللہ شہید دکتر محمد مفتح، ص ۴۰۸۔
۴. مرکز اسناد، شمارہ ۵۷۳۔
۵. ایضاً، شمارہ ۶۱۴، ۵۷۴، ۵۷۲۔
۶. ایضاً، شمارہ ۵۷۵۔
۷. ایضاً، شمارہ ۳۸۹، ۳۰۴، ۵۷۵۔

وظیفہ تقسیم کرنے کا کام بھی جاری رکھا[۱]۔ ۱۳۵۴ ش. کے اواخر یعنی ۱۹۷۶ء کے اوائل میں کتاب «طرح کلی اندیشۂ اسلامی در قرآن» سید علی حسینی کے فرضی نام سے شائع کی۔ انہوں نے خرداد ۱۳۵۵ ش. میں قوچان میں سیلاب آنے کے بعد ایک گروہ تشکیل دیا جسے سیلاب سے متاثرہ افراد کی مدد کے لئے وہاں بھیجا گیا اور اس نے مدرسہ عوضیہ کو اپنا مرکز بنا کر اس شہر کے عوام کو مدد پہنچائی[۲]۔

ساواک کی دستاویزات میں آیت اللہ خامنہ ای اور ان کے والد کی ۱۳۵۵ ش. کے اواخر میں مشہد میں سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں رپورٹیں موجود ہیں کہ انہوں نے امام خمینی کی حمایت و طرفداری اور اسلامی تحریک کی تبلیغ کی۔

آیت اللہ خامنہ ای نے محرم ۱۳۹۶ ھ/ دی ماہ ۱۳۵۵ ش. میں حکومت کے خلاف تقریریں کیں اور فکری و ثقافتی فضا کے بیان اور وضاحت کے بارے میں، خاص طور پر یونیورسٹی طلبا اور نوجوانوں کے لیے بحث کی نشستیں منعقد کیں[۳]۔ اس کے علاوہ تہران کے علماء کی نشستوں میں شرکت کرکے جدوجہد کے عمل کو تیز کیا[۴]۔ دوسری جانب ساواک بھی ان کے اور دیگر مجاہدین کے خلاف ثبوت حاصل کرنے کے لیے ان نشستوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی[۵]۔ علی شریعتی کے لندن میں ۲۹ خرداد ۱۳۵۶ ش/۱۹۷۷ء میں انتقال کے بعد آیت اللہ خامنہ ای نے ان کی مجالس ترحیم میں شرکت کی۔ ان کی یہ شرکت شریعتی اور ان کے والد سے ان کے دیرینہ تعلق اور آشنائی کی بنا پر تھی[۶]۔

یکم آبان ۱۳۵۶ ش/۱۹۷۷ء میں نجف میں آیت اللہ سید مصطفیٰ خمینی کے انتقال کے بعد آیت اللہ خامنہ ای اور بعض مجاہدین نے ۶ آبان کو مسجد ملا ہاشم میں مجلس ترحیم کا انعقاد کیا[۷]۔ انہی دنوں انہوں نے

---

۱. مرکز اسناد، شمارہ ۵۷۶، ۵۷۲
۲. ایضاً، شمارہ ۳۸۹۔
۳. کتاب گفت و گوی چہار جانبہ۔
۴. یاران امام، مفتح، ص ۳۴۰؛ استاد، ص ۲۷۷۔
۵. مرکز اسناد، شمارہ ۵۸۳۔
۶. ایضاً، شمارہ ۵۷۲، ۳۸۹۔
۷. ایضاً۔

مشہد کے بعض علماء کے ہمراہ نجف میں امام خمینی کو ایک تعزیتی ٹیلی گرام بھیجا[۱]۔ آیت اللہ سید مصطفیٰ خمینی کے انتقال اور اس کے بعد آنے والی تبدیلیوں سے اسلامی تحریک اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو گئی اور انقلاب کی کامیابی کے لیے سنجیدہ اقدامات شروع ہو گئے۔ پہلوی حکومت نے بھی ان اقدامات کے رد عمل میں کھلی سیاسی فضا کی پالیسی کے اعلان کے باوجود مجاہدین کو کچلنے اور دبانے کے اقدامات کر کے ان کی سرگرمیوں کو محدود کر دیا۔ اس پالیسی پر عمل درآمد کے بعد بعض سرکردہ مجاہدین کو جلاوطن کر دیا گیا جن میں آیت اللہ خامنہ ای بھی شامل تھے۔

انہیں خراسان کے سماجی سلامتی کمیشن نے تین سال کے لیے ایرانشہر جلاوطن کرنے کی سزا سنائی[۲] اور ساواک کے کارندوں نے ۲۳ آذر ۱۳۵۶ ش/۱۹۷۶ء کو ان کے گھر پر چھاپہ مار کر انہیں گرفتار کر لیا اور ایرانشہر منتقل کر دیا۔ اس اقدام سے حکومت کا مقصد، عوام اور مجاہدین کے ساتھ ان کے رابطے اور تعلق کو ختم کرنا اور اس کے بعد حکومت کے خلاف ان کی جدوجہد کو ناکام بنانا تھا[۳] لیکن اہل سنت کے ساتھ ان کے تعاون اور گھل مل جانے کی وجہ سے ایرانشہر کے عوام میں وہ مشہور اور مقبول ہو گئے اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے ملک کے دور دراز علاقوں میں عوام تک انقلاب کا پیغام پہنچایا[۴]۔ ایرانشہر کی مسجد آل رسول میں ان کی تقریروں اور مجاہد علماء، انقلابی افراد اور عوام کے مختلف طبقات کی ان کے گھر میں آمدورفت کی وجہ سے سیکورٹی فورس کے اہلکاروں نے ان کی سرگرمیوں کو محدود کر دیا اور لوگوں کی آمدورفت کو روک دیا[۵]۔

انہوں نے ۱۹ فروردین ۱۳۵۷ ش/۱۹۷۸ء کو یزد میں عوام کے قتل عام کے بعد آیت اللہ محمد صدوقی کے نام خط میں پہلوی حکومت کے اس وحشیانہ اقدام کی مذمت کی اور عوام کو جدوجہد جاری رکھنے کی ترغیب

---

۱. صحیفہ نور، ج ۶، ص ۵۲۔
۲. مرکز اسناد، شمارہ ۵۷۶۔
۳. انقلاب اسلامی بہ روایت اسناد ساواک، ج ۱، ص ۲۶۳؛ یاران امام، مطہری، ص ۵۷۵۔
۴. ایضاً، ج ۲، ص ۳۲۶، ج ۱۰، ص ۵۱۔
۵. مرکز اسناد، شمارہ ۵۷۶؛ اسناد نہضت، ج ۹، ص ۲۳۴-۲۳۵۔

دینے کے ساتھ ساتھ اس واقعہ کے شہداء کو خراج عقیدت پیش کیا[۱]۔ یہ خط اعلامیہ اور پمفلٹ کی شکل میں پورے ملک میں تقسیم کیا گیا[۲]۔

۱۱ تیر ۱۳۵۷ ش/۱۹۷۸ء میں ایرانشہر میں آنے والے سیلاب کے موقع پر آیت اللہ خامنہ ای نے اپنے سابقہ تجربات کے پیش نظر امدادی گروہ کے سربراہ کی حیثیت سے یزد اور مشہد سمیت مختلف شہروں کے علماء کے ساتھ ہم آہنگی کرکے ایران کے مختلف علاقوں سے امداد جمع کی اور سیلاب سے متاثرہ افراد میں اسے تقسیم کر دیا[۳]۔

آیت اللہ خامنہ ای نے جلاوطنی کے دوران ایران کے شہروں میں صف اول کے مجاہدین اور علماء سے اپنا رابطہ برقرار رکھا اور اسلامی تحریک کے بارے میں مسلسل خط وکتابت کی اور اس طرح وہ بہت سے حالات و واقعات سے آگاہ اور باخبر ہوتے تھے اور خط وکتابت کے ذریعے علماء کے بہت سے اجتماعی فیصلوں میں شرکت کرتے تھے۔

اسلامی انقلاب کی جدوجہد میں تیزی آنے سے (۲۸ شعبان ۱۳۹۸ ھ/ ۲۸ تیر ۱۳۵۷ ش.) ماہ رمضان سے قبل حوزہ علمیہ مشہد کے بہت سے طلبا نے آیت اللہ خامنہ ای کی جلاوطنی پر احتجاج کیا اور ان کی مشہد واپسی کا مطالبہ کیا جس پر پولیس اہلکاروں نے مداخلت کی[۴]۔ ایرانشہر اور اس کے اطراف کے علاقوں اور شہروں میں جدوجہد کو منظم کرنے میں آیت اللہ خامنہ ای کی بڑھتی ہوئی انقلابی اور عوامی سرگرمیوں نے ایک طرف اور اس علاقے کے عوام کے مختلف طبقوں میں ان کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ اور مقبولیت نے دوسری طرف سیکورٹی حکام کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ان کو جیرفت شہر جلاوطن کر دیں جو ایرانشہر سے زیادہ دور افتادہ تھا اور وہاں پابندیاں اور محدودیت بھی زیادہ تھی۔ اس بنا پر انہیں ۲۲ مرداد کو جیرفت منتقل کر دیا گیا[۵]۔ آیت اللہ خامنہ ای کی سیاسی جدوجہد جیرفت میں بھی نہیں رکی اور انہوں نے شہر میں داخل

---

۱. یاران امام، صدوقی، ۱۲۸-۱۳۱۔
۲. مرکز اسناد، شمارہ ۵۷۶۔
۳. ایضاً۔
۴. ایضاً۔
۵. ایضاً، شمارہ ۱۰۲۔

ہونے کے فوراً بعد اس شہر کی جامع مسجد میں تقریر کرکے پہلوی حکومت کی سیاہ کاریوں کا پردہ چاک کیا۔ ۱۵ شہریور ۱۳۵۷ ش/۱۹۷۸ء کو ان کی تقریر کے بعد لوگوں نے مظاہرہ کیا اور انقلابی نعرے لگائے[۱]۔ یہ واقعہ اس وقت رونما ہوا جب چھوٹے شہروں میں مظاہرے شروع نہیں ہوئے تھے۔ وہ ان جلاوطن علماء میں سے تھے جنہوں نے آیت اللہ سید عبدالحسین دستغیب کے نام خط لکھ کر ملک کے حالات اور شیراز، مشہد، اصفہان اور جہرم میں پہلوی حکومت کے مظالم اور جرائم کا ذکر کیا اور پہلوی حکومت کے خاتمے تک اسلامی تحریک کو جاری رکھنے کے لیے اقدامات تجویز کیے[۲]۔ وہ اس دوران خفیہ طور پر کہنوج گئے اور انقلابی کیں[۳]۔

عوامی جدوجہد میں اضافے اور اس کے پھیلنے، حکومت کے ارکان کے کمزور ہونے اور انقلاب کے عمل کو روکنے میں اس کی ناکامی کے بعد آیت اللہ خامنہ ای یکم مہر ۱۳۵۷ ش/۱۹۷۸ء کو جیرفت سے مشہد واپس آگئے اور انہوں نے انقلاب کے امور کو منظّم کرنے، جدوجہد کے عمل کو تیز کرنے اور تحریک کے گوناگوں مسائل کا جائزہ لینے کے سلسلے میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں[۴]۔ فرانس میں امام خمینی کے قیام کے دنوں میں انہوں نے مشہد کے بعض مجاہد علماء کے ہمراہ ایک ٹیلی گرام بھیج کر فرانس میں امام خمینی کے عارضی قیام کو عوام کے دل میں امید اور یقین کی لہر پیدا ہونے کا باعث اور ایران کی مسلمان امت کی نجات کے راستے میں امام خمینی کے عزم راسخ کی نشانی اور علامت قرار دیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے ضروری احکامات جاری کریں۔ آخر میں امام خمینی کی ایران واپسی کی بھی اپیل کی گئی[۵]۔

مشہد میں آیت اللہ خامنہ ای کی مجاہدانہ سرگرمیاں تھوڑی ہی عرصے میں تیز ہو گئیں اور انہوں نے عوامی مظاہروں اور اقدامات کو منظّم کرنے کے ساتھ ساتھ مشہد کے عوامی اجتماعات میں انقلابی تقریریں

---

۱. مرکز اسناد، شمارہ ۱۱۱۔
۲. اسناد انقلاب، ج ۳، ص ۳۴۸-۳۵۷۔
۳. مؤسسہ، ۱۸۸۹۔
۴. مرکز اسناد، شمارہ ۵۷۶۔
۵. اسناد انقلاب، ج ۳، ص ۴۰۲؛ آرکائیو مرکز اسناد، شمارہ ۲۰۹۔

کیں[۱]۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کا امام خمینی کے دفتر اور دیگر مجاہدین کے ساتھ رابطہ تھا اور ان سے صلاح و مشورہ کرتے تھے اسی کے نتیجے میں سید احمد خمینی نے ۱۰ آبان ۱۳۵۷ ش/۱۹۷۸ء کو پیرس سے آیت اللہ صدوقی سے رابطہ کیا اور کہا کہ امام خمینی ان سے اور آیت اللہ خامنہ ای سے ملنا چاہتے ہیں[۲]۔ آیت اللہ خامنہ ای ان علماء میں شامل تھے جنہوں نے مشہد کے سعد آباد اسٹیڈیم میں اس شہر کے اساتذہ کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب میں امام خمینی کی واپسی اور اسلامی حکومت کی تشکیل کا مطالبہ کیا[۳]۔ وہ آبان ماہ کے آخری دنوں میں سید عبدالکریم ہاشمی نژاد کے ہمراہ قوچان، شیروان اور بجنورد گئے اور ان شہروں میں تقریریں کرکے انقلاب کی تحریک کو مضبوط بنانے کی کوشش کی۔ آیت اللہ خامنہ ای کی مشہد میں بڑھتی ہوئی اور مؤثر سرگرمیوں کی وجہ سے پہلوی حکومت کے سیکورٹی حکام نے انہیں گرفتار کر لیا۔ ساواک کی رپورٹوں میں آیت اللہ خامنہ ای کو خراسان میں انقلاب کا ایک ممتاز علمبردار قرار دیا گیا ہے[۴]۔

انہوں نے ۱۹ اور ۲۰ آذر ۱۳۵۷ ش. یعنی نو اور دس محرم کو مشہد کے عظیم جلوس میں پرجوش تقریر کی اور امام رضا علیہ السلام کے روضہ مبارک میں خطبۂ شب عاشورا کو امام خمینی کے نام پر پڑھا اور اس انقلابی اقدام سے پہلوی حکومت کے ایک روایتی اقدام کو کہ اس سے پہلے مذکورہ رسم محمد رضا پہلوی کے لیے دعا کے ساتھ سرکاری اور رسمی طور پر ادا کی جاتی تھی، ختم کرکے رکھ دیا[۵]۔ اسی طرح انہوں نے عاشورا کے دن مشہد کے عوام کے عظیم جلوس کو منظّم کیا اور ان کے عظیم اجتماع میں تقریر کی[۶]۔ ان کا شمار ان علماء میں ہوتا تھا جنہوں نے ۲۴ آذر کو مشہد کے شاہ رضا اسپتال (موجودہ امام رضا اسپتال) پر پہلوی حکومت کے اہلکاروں کے حملے کے خلاف اسی اسپتال میں احتجاجی دھرنا دینے کا پروگرام بنایا[۷]۔ دھرنے کے لیے جانے کے

---

۱. انقلاب اسلامی بہ روایت اسناد ساواک، ج ۱۴، ص ۴۷۲، ۱۹۲۔
۲. صحیفہ نور، ج ۷، ص ۶۰۳؛ یاران امام، صدوقی، ۴۳۱۔
۳. مرکز اسناد، شمارہ ۳۸۹، ۵۷۲۔
۴. ایضاً، شمارہ ۳۸۹۔
۵. ایضاً، شمارہ ۵۷۲؛ مؤسسہ، شمارہ ۱۹۲۱۔
۶. روزشمار، ج ۸، ص ۳۳۹، ۳۵۲۔
۷. انقلاب اسلامی بہ روایت اسناد ساواک، ج ۲۰، ص ۳۳۔

راستے میں بہت سے لوگ ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور انہوں نے دھرنے میں شرکت کی[۱]۔ دھرنا دینے والوں نے ایک اعلامیہ جاری کر کے پہلوی حکومت کے اہلکاروں کے جرائم کی تشریح کرتے ہوئے ان کے خلاف کاروائی کا مطالبہ کیا[۲] اور پہلوی حکومت کے خاتمے اور امام خمینی کی واپسی پر زور دیا۔ ان کے اس اقدام کا وسیع رد عمل سامنے آیا اور ان کے ساتھ یکجہتی اور حمایت میں پورے ایران میں متعدد اعلامیے جاری ہوئے[۳]۔

آیت اللہ خامنہ ای نے ۹ دی ۱۳۵۷ ش. کو مشہد کے بعض علماء کے ہمراہ ایک بڑے عوامی جلوس کی قیادت کرتے ہوئے خراسان کے گورنر ہاؤس کے ملازمین کو انقلابی تحریک میں شامل کرنے کے لیے اس کی عمارت کی جانب حرکت کی لیکن ان کی پرامن کوششوں کے باوجود گورنر ہاؤس میں تعینات پولیس اہلکاروں نے عوام پر فائرنگ کر دی جس کے بعد مظاہرین سڑکوں پر نکل آئے اور بعض حکومتی مراکز اور عمارتوں کو نذر آتش کر دیا۔ اس واقعہ کی رات آیت اللہ خامنہ ای سمیت مشہد کے علماء نے ایک اجلاس منعقد کر کے اگلے روز جھڑپوں اور عوام کے مزید قتل کو روکنے کی کوشش کی لیکن پہلوی حکومت کے اہلکاروں نے مظاہرہ کرنے والے لوگوں کا قتل عام کر کے ۱۰ دی ۱۳۵۷ ش. کے خونریز اتوار کے المیہ کو جنم دیا[۴]۔ ان واقعات کے رونما ہونے کے بعد آیت اللہ خامنہ ای نے مشہد کے بعض مجاہد علماء کے ساتھ مل کر اس واقعہ کی مذمت میں اور تحریک کو جاری رکھنے کے سلسلے میں ایک اعلامیہ جاری کیا[۵]۔

پہلوی حکومت کا شیرازہ بکھرنے کے عمل میں تیزی آنے اور اسلامی انقلاب کی حتمی کامیابی کی علامات ظاہر ہونے کے بعد امام خمینی نے ۲۲ دی ماہ ۱۳۵۷ ش. کو اسلامی انقلاب کی کونسل تشکیل دینے کا فرمان جاری کیا[۶]۔ آیت اللہ خامنہ ای جنہیں امام خمینی نے اس کونسل کا رکن منتخب کیا تھا، اپنے مرکزی کردار کے

---

۱. شمس آبادی، حسن، نقش علمای مشہد در انقلاب اسلامی، ص ۳۱۶، ۳۱۵۔
۲. اسناد انقلاب، ج ۳، ص ۴۹۳، ۴۹۲۔
۳. انقلاب اسلامی بہ روایت اسناد ساواک، ج ۲۱، ص ۱۸۸، ۱۲۳-۱۲۴۔
۴. نقش علمای مشہد در انقلاب اسلامی، ص ۳۲۵-۳۲۸
۵. روزشمار، ج ۱۰، ص ۲۱۶-۲۱۷۔
۶. صحیفہ نور، ج ۵، ص ۴۲۸، ۴۲۶۔

ساتھ کہ جو انہوں نے مشہد میں اسلامی انقلاب کی تحریک میں ادا کیا تھا، اس شہر کو چھوڑ کر دی ماہ ۱۳۵۷ش. کے اواخر میں تہران آ گئے اور مدرسہ رفاہ کو اپنا مرکز قرار دیا اور دیگر مجاہدین خاص طور پر آیت اللہ بہشتی، مطہری اور مفتح کے ساتھ مل کر اسلامی انقلاب کی کامیابی کے حتمی مرحلے کی تیاری اور مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے فعال کردار ادا کرنے کی ذمہ داری سنبھالی[۱]۔ اسلامی انقلاب کی کونسل کی جانب سے امام خمینی کے استقبال کی کمیٹی کی تشکیل کے بعد[۲] اس کی پروپیگنڈہ کمیٹی کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی گئی۔

بختیار کے حکم سے ملک کے تمام ایئرپورٹ بند کیے جانے اور امام خمینی کی ایران واپسی پر پابندی کے بعد آیت اللہ خامنہ ای نے آیت اللہ بہشتی اور کئی دیگر سرکردہ مجاہد علماء کے ساتھ مل کر حکومت کے اس اقدام کے خلاف تہران یونیورسٹی کی مسجد میں ایک بہت بڑے دھرنے کا اہتمام کیا جس میں علماء، یونیورسٹی کے طلبا و اساتذہ اور عوام کی ایک بڑی تعداد کی شمولیت سے اس نے وسیع شکل اختیار کر لی[۳]۔ دھرنے کے آغاز سے ایک رات پہلے آیت اللہ بہشتی نے بہشت زہرا میں تقریر کی اور آیت اللہ خامنہ ای نے اپنی تیار کردہ قرارداد لوگوں کے سامنے پڑھی اور اس پروگرام سے تہران یونیورسٹی کی مسجد میں اگلے روز دھرنے کا پروگرام حتمی ہو گیا۔

آیت اللہ خامنہ ای نے دھرنے کے دوران دھرنا دینے والے بعض مجاہدین کے ساتھ مل کر کچھ اقدامات انجام دیئے جن میں تقریر، اعلامیہ کی اشاعت اور تحصن یعنی گھیراؤ دھرنا نام کا ایک رسالہ شامل تھا[۴]۔ دھرنا دینے والوں نے آٹھ بہمن کو ایک اعلامیہ جاری کرکے اس بات پر زور دیا کہ امام خمینی کے لیے ایئرپورٹ کھلنے تک وہ اپنا دھرنا جاری رکھیں گے[۵]۔ اس دھرنے نے کہ جو بارہ بہمن کی صبح تک جاری رہا[۶]، تہران یونیورسٹی کی مسجد کو جدوجہد کے ایک مؤثر مرکز میں تبدیل کر دیا۔

---

۱. او بہ تنہایی، ص ۶۳؛ حدیث، ج ۲، ص ۴۰۔
۲. دہۂ سرنوشت ساز، ص ۹۲-۹۴۔
۳. ہاشمی رفسنجانی، اکبر، انقلاب و پیروزی، ص ۱۶۲، ۱۶۱؛ اطلاعات، شمارہ ۱۷۷۵۷، ۱۳۵۷/۱۱/۹۔
۴. مصاحبہ ہا، ۱۳۶۳-۱۳۶۳، ص ۱۸۳، ۱۸۲۔
۵. اسناد انقلاب اسلامی، ج ۴، ص ۱۴۷۔
۶. پابہ پای آفتاب، ج ۲، ص ۱۹۵۔

۱۲ بہمن ۱۳۵۷ ش/۱۱ فروری ۱۹۷۹ء کو امام خمینی کی وطن واپسی کے تاریخی لمحے میں آیت اللہ خامنہ ای جو امام کے ساتھ ملاقات کے شوق میں پل پل گن رہے تھے، علماء اور اسلامی مجاہدین کے ہمراہ امام خمینی کے استقبال کے لیے مہرآباد ہوائی اڈے گئے۔ اسلامی انقلاب کے عشرہ فجر کے دوران آیت اللہ خامنہ ای مسلسل امام خمینی کے ساتھ رہے اور بہت سے امور میں ان کو مشورے دیتے رہےاور اسی طرح اسلامی حکومت کے داخلی اور خارجی مخالفین کی خبری اور تشہیراتی سازشوں اور مختلف سیاسی جماعتوں اور گروہوں کی موقع پرستی کا مقابلہ کرنے اور امام کے نام سے ایک میگزین کی اشاعت اور خبروں کی تیاری اور اشاعت کے مقصد سے دفتر امام کی تشہیراتی اور پریس کمیٹی کے بھی انچارج تھے۔ خود بھی کئی مقالے لکھے اور اس میگزین میں شائع کیے[۱]۔

اسلامی انقلاب کا پہلا عشرہ : (بہمن ۱۳۵۷-خرداد ۱۳۶۸)

انقلابی کونسل

اسلامی جمہوری نظام کی تشکیل کے عمل میں آیت اللہ خامنہ ای کے کردار کا پہلا میدان، انقلابی کونسل میں ان کی رکنیت اور فعالیت تھی۔ یہ کونسل مہرماہ ۱۳۵۷ ش. میں امام خمینی کی فرانس ہجرت، اسلامی انقلاب کی کامیابی کی علامات ظاہر ہونے اور اسلامی تحریک کے انقلاب کے مرحلے میں داخل ہونے کے بعد امام خمینی کے حکم سے آبان ماہ کے اوائل میں قائم کی گئی اور اس کے ارکان کا امام خمینی نے بتدریج انتخاب کیا لیکن مختلف امور کا خیال رکھنے کے لحاظ سے انقلاب کی کامیابی سے ایک ماہ قبل ۲۲ دی ماہ ۱۳۵۷ ش. کو اس کا باضابطہ اعلان کیا گیا[۲]۔ مرتضیٰ مطہری، سید محمد حسینی بہشتی، سید عبدالکریم موسوی اردبیلی، محمد رضا مہدوی کنی، سید علی خامنہ ای، محمد جواد باہنر اور اکبر ہاشمی رفسنجانی اس کونسل کے اولین ارکان تھے۔ بعد میں کئی دیگر افراد بھی اس کونسل کے رکن بنے[۳]۔

---

۱. قصہ انقلاب، ص ۹۵۔
۲. صحیفہ نور، ج ۵، ص۴۲۸،۴۲۶۔
۳. خاطرات آیت اللہ مہدوی کنی، ص ۱۸۳۔

آیت اللہ خامنہ ای نے دی ماہ کے اواخر میں اس کے اجلاس میں شرکت کی[۱]۔ اس موقع پر جدوجہد کے بارے میں اہم فیصلے کرنے کی ذمہ داری اس کونسل کی تھی۔ ان میں پہلوی حکومت اور امریکہ سمیت غیر ملکی حکام کے ساتھ مذاکرات اور امام خمینی کے استقبال کی کمیٹی کی تشکیل کا فیصلہ شامل تھا[۲]۔ کامیابی سے پہلے انقلابی کونسل کا ایک اور اہم اقدام عبوری حکومت کے سربراہ کے طور پر مہدی بازرگان کا نام امام خمینی کو پیش کرنا تھا[۳]۔

انقلاب کی کامیابی کے بعد انقلابی کونسل کے ذمہ جو کام تھے وہ درج ذیل ہیں:

مقنّنہ کی غیر موجودگی میں قانون سازی کرنا، تیر ماہ ۱۳۵۸ ش. میں عبوری حکومت اور انقلابی کونسل کے ادغام کے بعد انتظامیہ کے بعض فرائض اور ذمہ داریوں کو انجام دینا اور ۱۴ آبان ۱۳۵۸ ش. کو عبوری حکومت کے استعفے کے بعد اس کی تمام ذمہ داریوں کو انجام دینا۔

ان اصلی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ نو تشکیل شدہ اسلامی جمہوری نظام کو درپیش بحرانوں اور مشکلات سے نجات دلانا اور امام خمینی کو مشورے دینا بھی انقلابی کونسل کے فرائض میں شامل تھا[۴]۔ ۲۹ تیر ۱۳۵۹ ش. میں انقلابی کونسل کی سرگرمیوں کے اختتام تک اس کے چار ادوار میں اس کے ارکان میں کئی بار تبدیلیوں کے باوجود آیت اللہ خامنہ ای اس کے مستقل رکن رہے[۵]۔ شوریٰ کے «لبرل» کے نام سے ارکان کے خاص موقف اور نظریات کے سامنے استقامت و پائیداری، ایران کی تودہ پارٹی اور اسلامی انقلاب کی مخالف جماعتوں اور گروہوں کے افراد اور حامیوں کی فوج اور ملک کے ثقافتی شعبے میں داخلے کو روکنے کی ضرورت کے بارے میں بار بار انتباہات، شوریٰ کے اجلاس اور فیصلوں میں ان کے اہم مواقف میں شامل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انقلابی کونسل میں معاشرے کے مختلف طبقات کے نمائندے موجود ہونے چاہئیں[۶]۔

---

۱. پابہ پای آفتاب، ج ۲، ص ۱۹۲۔
۲. دہۂ سرنوشت ساز، ص ۹۲-۹۴۔
۳. ہاشمی رفسنجانی، اکبر، انقلاب و پیروزی، ص ۱۶۹۔
۴. سائلی کردہ دہ، مجید، شورای انقلاب اسلامی ایران، ص ۱۱۔
۵. ایضاً، ص ۶۲، ۴۹۔
۶. شورای انقلاب اسلامی ایران، جلسہ ۱۰/۱۲/۱۳۵۷۔

کردستان، سیستان و بلوچستان اور ملک کے دیگر علاقوں کے مسائل اور اتحاد کو باقی رکھنے کی ضرورت انقلابی کونسل میں ان کے پیش نظر اہم موضوعات میں شامل تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ عبوری حکومت نے کردستان کے معاملے میں کمزوری کا مظاہرہ کیا ہے اور اسے مختلف راستوں سے حل کرنا چاہیے اور اسے مختلف اقوام کے حامل ملک کے دیگر علاقوں تک پھیلنے سے روکنا چاہیے[۱]۔ سیستان و بلوچستان کے علاقے کے بارے میں بھی اپنی جلاوطنی کے زمانے میں اس علاقے میں اپنی موجودگی کے تجربے اور اس علاقے کے سیاسی و سماجی حالات سے باخبر ہونے کی بنیاد پر وہ اس علاقے کے عوام کی معاشی اور اقتصادی صورت حال کو بہتر بنانے پر زور دیتے تھے[۲]۔ اس سلسلے میں ۹ فروردین ۱۳۵۸ ش. کو امام خمینی کی جانب سے انہیں ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ایک وفد کے ہمراہ اس علاقے میں جائیں اور لوگوں کی مشکلات و مسائل اور مطالبات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اس علاقے کی صورت حال کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کریں[۳]۔ اس سفر میں اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے علاوہ انہوں نے علاقے کے بعض مقامی سرداروں اور ناقدین سے ملاقات کی اور ان کے سامنے اسلامی جمہوری نظام کی پالیسیوں کو کھل کر بیان کیا۔

سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی اور جہاد سازندگی (تعمیری جہاد) جیسے انقلابی اور عوامی اداروں کے قیام اور انہیں مضبوط بنانے کی حمایت انقلابی کونسل میں ان کے اصولی مواقف میں شامل تھی[۴]۔

تیر ماہ ۱۳۵۸ ش. کے آخر میں عبوری حکومت اور انقلابی کونسل کے ادغام سے انقلابی کونسل کے بعض ارکان اس کونسل کی جانب سے حساس وزارت خانوں میں چلے گئے اور آیت اللہ خامنہ ای کو وزارت دفاع کے انقلابی امور کا سربراہ چنا گیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر مصطفیٰ چمران وزیر دفاع تھے[۵]۔ اسی طرح انقلابی اور عبوری حکومت کے ادغام کے دوران جو انتظامیہ کی توجہ زیادہ مرکوز کرنے کے مقصد سے انجام پایا، انہیں سکورٹی وزراء کے کمیشن کا رکن منتخب کیا گیا اور گنبد، کردستان اور خوزستان کے بحرانوں اور انقلاب مخالف

---

۱. ایضاً، جلسہ ہای ۱۳۵۷/۱۲/۲۹؛ ۱۳۵۸/۶/۴؛ ۱۳۵۸/۷/۱۵؛ ۱۳۵۸/۹/۲۔
۲. ایضاً، جلسہ ہای ۱۳۵۸/۱/۱۵؛ ۱۳۵۸/۱/۱۹؛ ۱۳۵۸/۶/۱۱؛ ۱۳۵۸/۸/۲۸؛ ۱۳۵۸/۱۰/۶ اور ۱۳۵۸/۱۰/۸۔
۳. صحیفہ نور، ج ۶، ص ۴۲۹۔
۴. ایضاً، جلسہ ہای ۱۳۵۸/۴/۱۰؛ ۱۳۵۸/۶/۱۴؛ ۱۳۵۸/۹/۴۔
۵. دولتہای ایران از میرزا نصراللہ خان مشیرالدولہ تا میر حسین موسوی، ص ۴۵۷، ۴۵۹۔

جماعتوں اور گروہوں کے اقدامات کا مقابلہ کرنے سمیت پولیس، فوج اور سکورٹی کے تمام امور کی سرپرستی اور ذمہ داری ان کے کاندھوں پر تھی[۱]۔

انقلابی کونسل کی جانب سے ان کی دیگر ذمہ داریوں میں سے مرکز اسناد کی ذمہ داری اور ۳ آذر ۱۳۵۸ ش. کو سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی کی سرپرستی بھی تھی[۲]۔ وہ اس سے پہلے بھی انقلابی کونسل کی نمائندگی کرتے ہوئے سپاہ پاسداران کے بعض اجلاس میں شرکت کرتے تھے۔ ان کو سپاہ کا سرپرست منتخب کرنے کی وجہ سپاہ کے ادارے میں بعض اختلافات کا باقی رہنا تھا جو اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد کے ابتدائی مہینوں میں پیدا ہوئے تھے اور ثالثی کی کوششوں سے حل نہیں ہوئے تھے[۳]۔ وہ عوامی فوج خاص طور پر سپاہ کے حامیوں میں سے تھے، انہوں نے اس ادارے میں اپنی موجودگی کے عرصے میں اس میں موجود اختلافات کو دور کرنے اور اسے مناسب نظم و ضبط دینے کی کوشش کی۔ انہوں نے ۱۵ اسفند ۱۳۵۸ ش. کو پارلیمنٹ یعنی مجلس شورای اسلامی کے پہلے دور کے انتخابات میں امیدوار نامزد ہونے کی وجہ سے سپاہ کی سرپرستی کی ذمہ داری سے استعفیٰ دے دیا[۴]۔

جمہوری اسلامی پارٹی

آیت اللہ خامنہ ای اسلامی انقلاب کی تحریک کی کامیابی کے آخری دنوں میں اور اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد انقلابی کونسل میں اپنی مؤثر موجودگی اور عبوری دور میں انقلاب کے امور کو چلانے کے ساتھ ساتھ[۵]، سید محمد حسینی بہشتی، اکبر ہاشمی رفسنجانی، سید عبدالکریم موسوی اردبیلی اور محمد جواد باہنر کے ساتھ مل کر ایک انقلابی تنظیم اور جماعت قائم کرنے کے لیے کوشش کر رہے تھے[۶]۔ ۲۹ بہمن ۱۳۵۷ ش. کو جمہوری اسلامی پارٹی کے نام سے اس جماعت کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا گیا لیکن اس کے قیام کی تاریخ کا تعلق مشہد میں

---

۱. شورای انقلاب اسلامی ایران، ص ۱۱۷-۱۱۸۔
۲. خلاصہ، جلسہ ۱۳۵۸/۹/۳۔
۳. رسالت، شمارہ ۹۹۷، ص ۱۰۔
۴. انقلاب و پیروزی، ص ۴۴۹۔
۵. ایضاً، ص ۱۲۵۔
۶. انقلاب و پیروزی، ص ۲۱۵، ۲۱۸۔

موسم گرما ۱۳۵۶ ش. میں ہونے والے اجلاس سے ہے جن میں جمہوری اسلامی پارٹی کے بانیوں سمیت بعض مجاہدین پہلوی حکومت کے خلاف سرگرمیوں اور اسلامی فکر و سوچ کو فروغ دینے کے لیے ایک تنظیم یا جماعت قائم کرنا چاہتے تھے[۱]۔ اس بنیاد پر پارٹی نے اسلامی انقلاب کی تحریک کی کامیابی کے آخری مہینوں میں اجتماعات منعقد کرنے اور تقریروں کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا اور اس سلسلے میں آیت اللہ خامنہ ای نے اہم اور قابل ذکر سرگرمیاں انجام دیں[۲]۔

جمہوری اسلامی پارٹی کے قیام کے اسباب و دلائل میں سے بعض درج ذیل ہیں:

نو تشکیل شدہ اسلامی جمہوری نظام کی حمایت و حفاظت کے لیے منظّم جماعت کے فقدان سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنا، انقلاب کو جاری رکھنے، اتحاد و یکجہتی کے تحفظ اور میدان میں عوام کی موجودگی میں مدد دینا، اسلامی جمہوری نظام کی بنیادیں رکھنا، انقلاب کی کامیابی کے بعد کے عرصے میں امام خمینی کے کردار کی مرکزیت کی حفاظت کرنا، لوگوں کے ذہنوں میں خالص اسلامی سوچ کو راسخ کرنا، لوگوں کی لحہ بہ لحہ سیاسی ہدایت و رہنمائی کرنا، اسلامی انقلاب کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے انتظامی اداروں کو افرادی قوت مہیا کرنے میں مدد دینا، اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے ہتھکنڈوں اور فریبوں کے مقابل واضح اور صحیح موقف اختیار کرنا[۳]۔ وہ پارٹی کا منشور اور دستورالعمل بنانے والوں میں شامل تھے۔ پارٹی ارکان کے فرائض و ذمہ داریوں کی تقسیم میں بھی پارٹی کے تشہیراتی اور پروپیگنڈہ شعبے کے وہ انچارج تھے[۴]۔ آیت اللہ خامنہ ای پارٹی کے بانی رکن اور مرکزی کونسل کے رکن تھے اور مجموعی طور پر پارٹی کے قیام کے زمانے میں انہوں نے زیادہ تر اس کے بارے میں وضاحت اور تشریح کا کردار ادا کیا اور پارٹی کے موقف کو تقریر اور تحریر کی شکل میں پیش کیا۔ انہوں نے مشہد میں پارٹی کا شعبہ قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اس شعبے کے دفتر کا ۲۶ اسفند ۱۳۵۷ ش. کو افتتاح کیا۔

---

۱. جاسبی، ج ۴، ص ۱۴۹۔
۲. ایضاً، ج ۴، ص ۱۴۶-۱۴۷۔
۳. کارنامۂ ۴ سالۂ حزب جمہوری اسلامی از تأسیس تا تشکیل اولین کنگرہ، ص ۴-۷۔
۴. جاسبی، ج ۴، ص ۱۴۶۔

پارٹی کے پہلے اور دوسرے سیکرٹری جنرل آیت اللہ بہشتی اور ڈاکٹر محمد جواد باہنر کے بعد آیت اللہ خامنہ ای شہریور ۱۳۶۰ ش. میں پارٹی کی مرکزی کونسل کی جانب سے پارٹی کے تیسرے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے[۱]۔ انقلاب کی کامیابی کے بعد کے برسوں میں ۱۳۶۰ ش. کے عشرے میں اسلامی جمہوری نظام کے استحکام کے زمانے تک جمہوری اسلامی پارٹی حاکمیت کے ایک اہم رکن کی مانند رسمی سیاسی ڈھانچے سے ہٹ کر کام کر رہی تھی اور وہ اسلامی جمہوری نظام کی بنیادوں کا سہارا تھی[۲]۔ آیت اللہ خامنہ ای اسلامی جمہوری پارٹی کو نو تشکیل شدہ اسلامی جمہوری نظام کی حفاظت کے لیے ایک ضروری ادارہ سمجھتے تھے۔ اردی بہشت ۱۳۶۲ ش. کو پارٹی کی پہلی کانگرس منعقد ہوئی اور آیت اللہ خامنہ ای کو دوسری بار پارٹی کا سیکرٹری جنرل اور مرکزی کونسل[۳] اور پارٹی کی ثالثی کونسل کا رکن منتخب کیا گیا[۴]۔ وہ اپنے دور صدارت کے دوران تہران دوسرے شہروں میں جمہوری اسلامی پارٹی کے اجلاس میں شرکت کرتے تھے اور پارٹی کے اہداف و مقاصد اور ذمہ داریوں کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ دفاتر اور شعبوں کے ارکان اور پارٹی کے ارکان کے سوالوں کے جواب دیتے تھے[۵]۔

اپنی صدارت کے دوسرے دور میں بھی وہ جمہوری اسلامی پارٹی کے سیکرٹری جنرل تھے۔ اس دور میں مختلف وجوہات کی بناپر اس کی سرگرمیاں کم ہو گئیں اور آخرکار امام خمینی کے حکم سے ۱۱ خرداد ۱۳۶۶ش. کو پارٹی کی سرگرمیاں ختم کر دی گئیں۔

تہران کے امام جمعہ

امام خمینی نے ۲۴ دی ۱۳۵۸ ش. میں آیت اللہ خامنہ ای کو ان کے شاندار ماضی اور علم و عمل میں شائستگی کی وجہ سے تہران کا امام جمعہ مقرر کیا[۶]۔ آیت اللہ خامنہ ای نے ۲۸ دی ماہ ۱۳۵۸ ش. کو پہلی نماز جمعہ کی

---

۱. ہاشمی رفسنجانی، اکبر، عبور از بحران، ص ۲۶۳۔
۲. ہاشمی رفسنجانی، اکبر، آرامش و چالش، ص ۲۶۷۔
۳. خاطرات سید مرتضیٰ نبوی، ص ۱۶۸۔
۴. جاسبی، ج ۴، ص ۳۰۰۔
۵. جمہوری اسلامی، شمارہ ۱۵۴۱، ص ۱۵؛ شمارہ ۱۵۴۳، ص ۲۔
۶. صحیفہ نور، ج ۱۲، ص ۱۱۶۔

امامت کی[۱]۔ اس تاریخ سے لے کر ۶ تیر ماہ ۱۳۶۰ ش. کے واقعہ تک جب تہران کی مسجد ابوذر میں ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا اور اس کے نتیجے میں وہ شدید زخمی ہو گئے، (۲۱ بہمن سے لے کر ۶ اسفند ۱۳۵۹ ش. کے عرصے کے علاوہ جب وہ ایک تبلیغی دورے پر ہندوستان گئے تھے) تہران کی نماز جمعہ کی امامت کی[۲]۔ اس کے بعد بھی وہ ہمیشہ اس عہدے پر رہے۔ نماز جمعہ کے بارے میں ان کا اہم اقدام ملک کے اندر اور عالم اسلام میں ائمہ جمعہ کے نیٹ ورک کو منظّم کرنے کی غرض سے ائمہ جمعہ کا سمینار منعقد کرنے کی تجویز تھی اور امام خمینی کی رضامندی کے بعد مدرسہ فیضیہ قم میں پہلا سمینار منعقد ہوا اور اس کے بعد متعدد سمینار منعقد ہوئے[۳]۔ انہوں نے ایک اہم اور مؤثر پلیٹ فارم کی حیثیت سے نماز جمعہ کے خطبوں میں اسلامی جمہوری کے اصولی اور اسٹریٹجک موقف بیان کیے اور اسی طرح معاشرے کی سیاسی دانش و بصیرت اور دینی فکر و سوچ کو مضبوط بنانے کی کوشش کی، نماز جمعہ میں عربی زبان میں خطبے دینا بھی جن کا مخاطب عالم اسلام کے مسلمان تھے، ان کے خطبوں کی ایک خصوصیت تھی۔

مجلس شورای اسلامی (پارلیمنٹ) میں

آیت اللہ خامنہ ای اسفند ۱۳۵۸ ش. میں مجلس شورای اسلامی کے قانون سازی کے پہلے دور کے انتخابات میں امیدوار بنے تو جامعہ روحانیت مبارز تہران، جمہوری اسلامی پارٹی اور کئی دیگر اسلامی تنظیموں اور گروہوں پر مشتمل خطِ امام کی طاقتوں کے اتحاد نے ان کی حمایت کی[۴] اور وہ تہران کے انتخابی حلقے سے جیت کر پارلیمنٹ کے رکن بنے۔ پارلیمنٹ میں وہ دفاعی امور کمیشن کے رکن اور سربراہ تھے۔ اس کمیشن کی سربراہی کے دور میں کئی بلوں، منصوبوں اور موضوعات کا جائزہ لیا گیا جن میں سے اہم ترین موضوعات، سپاہ پاسداران کی بھرتی کی ضروریات کو پورا کرنا، کردستان کا مسئلہ، سرحدی مسائل، بلوچستان کا مسئلہ اور

---

۱. درمکتب...، ج ۲، ص ۱-۳۔
۲. ایضاً، ۲ جم/ ۳ جم۔
۳. فرہنگ...، ص ۳۱۱۔
۴. رضوی، ص ۳۸۴۔

فوج کی تنظیم نو تھے[۱]۔ پارلیمنٹ کی رکنیت کے دوران ان کے اہم ترین مواقف میں سے صدر کے عہدے کے لیے بنی صدر کی سیاسی نااہلی کی تجویز اور تحریک کی حمایت میں ان کی اہم اور مستدل باتوں کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے[۲]۔ ۳۱ شہریور ۱۳۵۹ ش. کو ایران اور عراق کی جنگ شروع ہونے کے بعد اور محاذ جنگ پر موجود ہونے کی وجہ سے وہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں کم شریک ہوئے اور ۶ تیر ۱۳۶۰ ش. کو شدید زخمی ہونے کے بعد پارلیمنٹ کے اجلاس میں بعض مواقع پر شریک ہوئے۔ مہرماہ ۱۳۶۰ ش. میں ملک کے صدر منتخب ہونے کے بعد پارلیمنٹ کی رکنیت سے دستبردار ہو گئے۔

دفاع مقدس

آیت اللہ خامنہ ای نے ایران اور عراق کی جنگ شروع ہوتے ہی جنگ کے مسائل کو سلجھانے میں اہم اور بھرپور کردار ادا کیا۔ انہوں نے ایران پر حملہ شروع ہونے کے چند گھنٹے کے اندر ایران پر عراق کی بعثی فوج کی جارحیت کے بارے میں پہلا بیان تیار کیا اور ریڈیو کے ذریعے اسے عوام تک پہنچایا[۳]۔ جنگ شروع ہونے کے دوسرے روز عراق کی فوجی جارحیت کا مقابلہ کرنے کا جائزہ لینے کے لیے فوج کے ہیڈ کوارٹر میں ہونے والے اجلاس میں انہوں نے شرکت کی اور جب یہ طے ہوا کہ ان میں سے ایک شخص مسئلے کا جائزہ لینے کے لیے محاذ جنگ پر جائے گا، تو جس پہلے شخص نے یہ تجویز قبول کی وہ آیت اللہ خامنہ ای تھے[۴]۔ ۵ مہر ۱۳۵۹ کو امام خمینی کی اجازت کے بعد فوجی وردی میں محاذ جنگ پر گئے[۵] تاکہ محاذ اور وہاں پر موجود ایرانی فوجیوں کے وسائل و امکانات کی صورت حال کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کریں اور دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے فوجیوں کو منظّم اور مسلح کرنے میں مدد دیں[۶]۔ اس مقصد کے تحت وہ جنوبی محاذ پر گئے اور ۱۳۶۰ ش. کے

---

۱. آشنایی با مجلس شورای اسلامی، ص ۹۰-۹۱۔
۲. خلاصہ، جلسہ ہای ۱۶۶-۱۶۸۔
۳. خاطرات ماندگار، ص ۱۲۔
۴. ایضا، ص ۱۱۔
۵. اطلاعات، شمارہ ۲۱۸۸۹، ص ۹۔
۶. جمہوری اسلامی، شمارہ ۳۸۷، ص ۱۔

موسم بہار کے وسط تک اس محاذ پر موجود رہے۔ اس کے بعد وہ مغربی محاذ پر گئے۔ تہران کی نماز جمعہ کی امامت، امام خمینی سے ملاقات اور انہیں رپورٹ پیش کرنے یا ضروری اجلاس، دوروں اور تقریروں کے علاوہ وہ مسلسل محاذ جنگ پر موجود رہے[۱]۔ انہوں نے کئی فوجی کاروائیوں یا ان کی منصوبہ بندی میں شرکت کی۔ جنگ کے میدان میں ان کی سرگرمیوں میں بسیج اور سپاہ کی فورسز کی ہتھیاروں کی ضرورت اور دیگر ضروریات پوری کرنا شامل تھا۔ محاذ جنگ پر ان کا زیادہ تر وقت ڈاکٹر مصطفیٰ چمران کی جانب سے تشکیل دی جانے والی کمیٹی کے اجلاس میں چھاپہ مار جنگوں کی منصوبہ بندی اور ان کی حمایت اور رہنمائی میں صرف ہوتا تھا[۲]۔ اس کمیٹی کے خصوصی اقدامات میں سے جس میں آیت اللہ خامنہ ای کا براہ راست کردار تھا، ٹینکوں کو تباہ کرنے کے خصوصی فوجی دستوں کی تشکیل تھی۔ خرمشہر، آبادان اور سوسنگرد کے محاذوں کو مدد کرنے میں ان کا اہم کردار تھا اور سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی اور بسیج (رضاکار فورس) جیسی عوامی فوجی طاقتوں کو مضبوط بنانے اور ان کی فنی، تکنیکی اور فوجی ضروریات کو پورا کرنے میں انہوں نے انتہائی اہم کردار ادا کیا[۳]۔ ان کی دیگر کوششوں میں محاذ جنگ اور فوجی کاروائیوں میں سپاہ اور فوج کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا شامل تھا[۴]۔

امام خمینی کے حکم سے ۲۰ مہر ۱۳۵۹ ش. کو جنگ کے تمام امور اعلیٰ دفاعی کونسل کے سپرد کر دیے گئے[۵] اور آیت اللہ خامنہ ای امام خمینی کے حکم کے مطابق ۲۰ اردی بہشت ۱۳۵۹ ش. کو اس کونسل میں ان کے نمائندے[۶] اور اس کے ترجمان بن گئے[۷]۔ اس دوران وہ جنگ کے امور اور مسائل میں امام خمینی کے مشیر

---

۱. مصاحبہ (۱۳۶۰)، ص ۷-۸۔
۲. امید انقلاب، شمارہ ۱۴۷، ص ۸-۹۔
۳. خاطرات و حکایت ہا، ج ۱۰، ص ۷-۲۰۔
۴. کیہان، شمارہ ۱۱۱۵۵، ص ۴۔
۵. صحیفہ نور، ج ۱۳، ص ۲۶۳-۲۶۴۔
۶. صحیفہ نور، ج ۱۲، ص ۲۸۱۔
۷. جمہوری اسلامی، شمارہ ۴۰۹، ص ۶۔

بھی تھے[۱]۔ وہ عام طور پر اعلیٰ دفاعی کونسل کے اجلاس کے اختتام پر کونسل کی بحثوں اور فیصلوں کے بارے میں پریس کانفرنس کرتے تھے اور کونسل کے فیصلوں سے عوام کو آگاہ کرتے تھے[۲]۔

آبادان کے محاصرہ کو توڑنے کی کاروائی میں[۳] انہوں نے براہ راست شرکت کی اور خرمشہر کے بارے میں ان کا اس بات پر یقین تھا کہ صحیح فوجی تدابیر اور اقدامات کرکے اس کے سقوط کو روکا جاسکتا ہے۔ حتیٰ انہوں نے اس سلسلے میں اس وقت کے صدر اور فوج کے کمانڈر ان چیف ابوالحسن بنی صدر کو ایک خط لکھا جس میں کہا گیا کہ اگر سوسنگرد کے ارد گرد دو بکتر بند بریگیڈ تعینات کر دیے جائیں تو اس شہر کو سقوط کرنے سے روکا جاسکتا ہے لیکن بنی صدر نے اس خط پر کوئی توجہ نہیں دی[۴]۔

جنگ شروع ہونے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد بعض شخصیات اور بین الاقوامی اداروں نیز بعض ملکوں نے دونوں ملکوں کے درمیان صلح کروانے کے لیے اقدامات انجام دیے۔ آیت اللہ خامنہ ای کا اس سلسلے میں خیال تھا کہ جب تک عراق ایران کی اصلی شرطیں یعنی بین الاقوامی سرحدوں پر واپسی، تاوان کی ادائیگی اور حملہ آور کو سزا دینا قبول نہیں کرتا صلح پائیدار نہیں ہوگی اور اگر عراق نے یہ شرطیں قبول نہیں کیں تو ہم طاقت کے زور پر اسے اپنی سرزمین سے باہر نکال دیں گے۔ اسی طرح ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مسلط کردہ صلح جنگ سے بدتر ہے[۵]۔ اس کے باوجود وہ امن وفود کی آمدورفت کو اس لحاظ سے مفید سمجھتے تھے کہ یہ صدام حسین اور اس کی فوج کے جرائم کے پہلو نمایاں ہونے کا باعث بن رہی تھی اور ایران کی مظلومیت اور صدام کی جارحیت کو ثابت کرنے میں مدد دے رہی تھی[۶]۔

آیت اللہ خامنہ ای کی صدارت کے دور میں جنگ ملک کا اہم ترین موضوع اور سب سے اہم مسئلہ تھا۔ ۱۳۶۰ سے ۱۳۶۴ ش. تک جنگ کے میدان میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور مجموعی طور پر جنگ کے

---

۱. بنی لوحی، علی و دیگران، نبردہای شرق کارون بہ روایت فرماندہان، ص ۱۷۲-۱۷۳۔
۲. جمہوری اسلامی، شمارہ ۴۰۹، ص۶۔
۳. از جنوب لبنان تا جنوب ایران، ص ۱۷۴؛ اطلاعات، شمارہ ۱۹۱۵۳، ص۵۔
۴. مصاحبہ ہا (۱۳۶۰)، ص ۵۹۔
۵. در مکتب، ج۵۹/۸/۹۔
۶. جمہوری اسلامی، شمارہ ۵۰۹، ص۲۔

محاذوں پر توازن ایران کے حق میں ہو گیا۔ عراقی فوجیوں کو بیشتر مقبوضہ علاقوں سے باہر نکال دیا گیا اور اعلیٰ دفاعی کونسل کے صدر کی حیثیت سے آیت اللہ خامنہ ای سمیت ملک کے اعلیٰ حکام کی اتفاق رائے سے کئی فوجی آپریشنوں کی منصوبہ بندی اور ان پر عمل درآمد کیا گیا۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی میدان میں ایران کی سفارتی موجودگی بھی زیادہ ہوئی اور اسے فعال بنایا گیا۔ انہوں نے اپنی صدارت کے آٹھ برسوں میں سے سات برسوں کا بہت سا حصہ جو جنگ کا زمانہ تھا، بین الاقوامی، اسلامی اور علاقائی اداروں یا اہم علاقائی اور بین الاقوامی شخصیات کے امن وفود کے ساتھ، کہ جو ثالثی کے مشن پر تھے، مذاکرات میں گزارا۔ صدارت کے دور میں امام خمینی کی جانب سے محاذ جنگ پر جانے کی مخالفت کی وجہ سے انہوں نے محدود دوروں اور معائنوں پر اکتفا کیا لیکن جنگ کے اختتام کے موقع پر اور قرارداد قبول کرنے کے بعد محاذوں کی ناگفتہ بہ اور خطرناک صورت حال نے انہیں امام خمینی سے اجازت لینے کے بعد عظیم تبدیلی لانے کے لیے محاذ جنگ پر جانے پر مجبور کر دیا۔

آیت اللہ خامنہ ای صدارت کے دور میں جنگ کی حمایت و پشتیبانی کی اعلیٰ کونسل کے سربراہ بھی تھے۔ یہ کونسل ۱۳۶۵ ش. میں جنگ کے خاص حالات کی بنا پر اور جنگ میں ملک کے وسائل بہتر سے بہتر طریقے سے استعمال کرنے اور جنگ کے محاذوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے سلسلے میں افرادی قوت اور وسائل کی فراہمی میں مؤثر اقدامات انجام دینے کے لیے قائم کی گئی[۱]۔ امام خمینی نے ان کی درخواست کے جواب میں ۱۹ بہمن ۱۳۶۶ ش. کو اس کونسل کے فیصلوں کو جنگ کے خاتمے تک لازم الاجراء قرار دیا[۲]۔

موسم گرما ۱۳۶۷ ش. میں (آیت اللہ خامنہ ای کی صدارت کے آخری برس میں) ایران کی جانب سے قرارداد ۵۹۸ کو قبول کرنے کے بعد ایران کے ساتھ عراق کی جنگ ختم ہوئی۔ ۲۶ تیر ۱۳۶۷ ش. کو آیت اللہ خامنہ ای کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں جس میں ملک کے اعلیٰ رتبہ حکام بھی شریک تھے، قرارداد ۵۹۸ قبول کرنے کی منظوری دی گئی اور امام خمینی نے بھی اس کی توثیق کر دی[۳]۔ امام خمینی نے ایرانی عوام کے نام ایک پیغام میں قرارداد قبول کرنے کو ایک انتہائی تلخ اور ناگوار مسئلہ قرار دیا اور فرمایا کہ

---

۱. جمہوری اسلامی، شمارہ ۲۰۸۸۔
۲. صحیفہ نور، ج ۲۰، ص ۴۶۷۔
۳. درودیان، محمد، سیری، مدارک فرہنگی انقلاب اسلامی، ص ۱۶۳۔

اسے صرف اسلامی جمہوری نظام اور انقلاب کی مصلحت کی وجہ سے قبول کیا گیا۔ انہوں نے فرمایا: "اس مسئلے کو قبول کرنا میرے لیے زہر سے زیادہ تلخ ہے؛ لیکن میں خدا کی رضا پر راضی ہوں اور اس کی رضا اور رضامندی کے لیے میں نے یہ زہر کا پیالہ پیا ہے۔۔۔ اس قرارداد کو قبول کرنے کا فیصلہ صرف ملکی حکام نے خود پر بھروسہ کرتے ہوئے کیا ہے اور کسی شخص یا ملک کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے"[۱]۔ اس فیصلے کے بعد آیت اللہ خامنہ ای نے ملک کے صدر کی حیثیت سے ۲۷ تیر ۱۳۶۷ ش. کو اقوام متحدہ کے اس وقت کے سیکرٹری جنرل خاویر پیرز ڈیکوئیار کے نام ایک خط میں ایران کی جانب سے قرارداد ۵۹۸ منظور کرنے کا اعلان کیا[۲]۔

تبلیغی اور تربیتی سرگرمیاں

اسلامی انقلاب کی کامیابی سے لے کر صدر منتخب ہونے تک آیت اللہ خامنہ ای کی سیاسی و مذہبی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ، اسلامی جمہوری نظام کو قائم کرنے اور اسے مضبوط بنانے کے سلسلے میں تبلیغی سرگرمیوں پر مشتمل تھا۔

آیت اللہ مرتضیٰ مطہری کی شہادت کے نتیجہ میں یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ کے درمیان پیدا ہونے والے خلا کے بعد امام خمینی نے ۲۳ خرداد ۱۳۵۸ ش. کو یونیورسٹی طلبا کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے آیت اللہ خامنہ ای کو ایک فہیم، سمجھدار اور سخنور شخص قرار دیا اور انہیں طلبا کے فکری و اعتقادی مسائل کو حل کرنے اور یونیورسٹیوں کے اندر اسلامی جمہوری نظام کے مخالف گروہوں اور جماعتوں خاص طور پر مارکسسٹوں کا مقابلہ کرنے کی ذمہ داری سونپی[۳]۔ وہ اس تاریخ سے لے کر ۳۱ شہریور ۱۳۵۹ ش. تک یعنی ایران اور عراق کی جنگ شروع ہونے تک ہر پیر کو تہران یونیورسٹی کی مسجد میں طلبا کے اجتماع میں شرکت کرتے تھے اور نماز ظہر اور عصر کی امامت اور اس دور کے اہم مسائل کے بارے میں تقریر کرنے کے بعد ان

---

۱. صحیفہ نور، ج ۲۰، ص ۹۲-۹۵۔
۲. ولایتی، علی اکبر، تاریخ سیاسی جنگ تحمیلی عراق علیہ جمہوری اسلامی ایران، ص ۲۷۸-۲۷۹۔
۳. صحیفہ نور، ج ۸، ص ۱۳۸۔

کے فکری و سیاسی سوالوں کے جواب دیتے تھے۔ اس قسم کی نشستیں بعد میں تہران کی اہم مساجد میں بھی منعقد کی گئیں۔ ابوذر مسجد میں ان پر قاتلانہ حملے کا واقعہ بھی ایسی ہی ایک نشست کے دوران رونما ہوا[۱]۔

ان کا ایک اور اقدام ان کوششوں کا مقابلہ کرنا تھا جو عبوری حکومت کے بعض ارکان آئین کی مجلس خبرگان کو تحلیل کرنے کے لیے انجام دے رہے تھے۔ ان ارکان نے عبوری حکومت کے پندرہ وزیروں اور ارکان کے دستخط سے ایک خط تیار کر رکھا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ امام خمینی کو اطلاع دینے اور ان کی طرف سے رائے کے اظہار سے پہلے ہی مجلس خبرگان کی تحلیل کی اطلاع عوام کو دے دیں اور اگر امام خمینی نے مخالفت کی تو وہ اجتماعی طور پر استعفیٰ دے دیں[۲]۔ آیت اللہ خامنہ ای نے جو انقلابی کونسل کی جانب سے کابینہ کے اجلاس میں شرکت کرتے تھے، اجلاس میں اس خط کو پیش کیے جانے کے بعد سختی سے اس کی مخالفت کی اور اسے نشر کرنے سے پہلے امام خمینی کو اطلاع دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ امام خمینی نے اس مسئلے سے آگاہ اور باخبر ہونے کے بعد ان کی درخواست مسترد کر دی اور آئین کی مجلس خبرگان کے قانونی کام کو جاری رکھنے پر زور دیا[۳]۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی کی دوسری سالگرہ کے موقع پر اسلامی تبلیغات کی اعلیٰ کونسل کے فیصلے کے مطابق اسلامی جمہوری نظام کی طرف سے مختلف وفود دنیا کے مختلف ملکوں میں بھیجے گئے تاکہ وہ دوسری قوموں خاص طور پر مسلمان قوموں کے سامنے اسلامی جمہوریہ ایران کے موقف اور نظریات اور اسلامی انقلاب کی خصوصیات بیان کریں۔ آیت اللہ خامنہ ای ہندوستان جانے والے وفد کے سربراہ تھے۔ انہوں نے ۱۳۵۹ ش. بہمن کے اواخر اور اسفند کے اوائل میں دو ہفتے تک دہلی، حیدرآباد، بنگلور[۴] اور کشمیر کے علاقے کا دورہ کیا[۵] اور اپنی تقریروں، ملاقاتوں، پریس کانفرنسوں خاص طور پر مقامی صحافیوں، یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ، ہندوستان کی اسلامی شخصیات اور تنظیموں کے ساتھ ملاقات اور بات چیت میں ایران کے

---

۱. جمہوری اسلامی، شمارہ ۱۱۳، ص ۸، شمارہ ۱۸۲، ص ۱۰، شمارہ ۱۹۲، ص ۱۰۔
۲. مصاحبہ ہا (۱۳۶۰)، ۱۱۲-۱۱۴۔
۳. صحیفہ نور، ج ۱۰، ص ۳۲۰۔
۴. کیہان، شمارہ ۱۱۲۲، ص ۴۔
۵. جمہوری اسلامی، شمارہ ۴۹۸، ص ۳۔

اسلامی انقلاب کے حقیقی چہرے اور اسلامی جمہوری نظام اور اس کی نمایاں خصوصیات خاص طور پر عراق کے ساتھ جنگ کے اہم مسائل کو بیان کیا[۱]۔ اسی طرح انہوں نے اس وقت کی ہندوستان کی وزیراعظم اندرا گاندھی سے کہ جن کا شمار اہم بین الاقوامی شخصیات میں ہوتا تھا، ملاقات اور گفتگو کی[۲]۔

آزاد خیال افراد اور بنی صدر سے مقابلہ

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ابتدائی برسوں میں ایرانی معاشرے کا ایک اہم ترین مسئلہ ملک کے سرکاری سیاسی ڈھانچے میں خطِ امام کے پیرو اور لبرل سے موسوم دو اہم اور مؤثر گروپ کی موجودگی اور فعالیت تھی۔ آیت اللہ خامنہ ای سمیت امام خمینی کے بیشتر ساتھی، قریبی افراد اور مشیر خطِ امام کے پیرو گروپ میں شامل تھے۔ لبرل گروپ کا کہ جو سیاسی فکر وسوچ کے لحاظ سے خطِ امام کے پیرو گروپ سے بہت زیادہ اختلاف رکھتا تھا، نمایاں ترین چہرہ ابوالحسن بنی صدر تھا۔ آیت اللہ خامنہ ای بنی صدر کو اس تحریک کا نمائندہ سمجھتے تھے جو ملک کے اعلیٰ حکام کی سطح پر تفرقہ اور محاذ آرائی کا سبب تھی اور اس کے نتیجے میں معاشرے میں تفرقہ اور اختلاف کا باعث تھی[۳] لیکن بنی صدر اور اس کی حامی اور ہم خیال تحریک کے ساتھ بنیادی اختلاف رائے کے باوجود، معاشرے میں اتحاد قائم رکھنے کے لیے اور امام خمینی کی تاکید کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ عوامی حلقوں میں اپنی مخالفت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بعض مواقع پر آپ اس مسئلہ کو امام خمینی کے پاس لے جاتے تھے۔ آئین اور اسلامی انقلاب کی حقیقت و ماہیت سے بنی صدر کے واضح انحراف اور صدر کے عہدے کے لیے اس کے سیاسی طور پر نااہل ہونے کی تحریک پیش کیے جانے کے بعد ۳۰ خرداد ۱۳۶۰ ش. کو آیت اللہ خامنہ ای نے نااہلی کی تحریک کے حق میں مدلل اور مؤثر تقریر کی[۴]۔

آیت اللہ خامنہ ای نے ۱۳۵۸ سے لے کر یکم تیر ۱۳۶۰ ش. تک لبرل اور قوم پرست گروپ کے خلاف مختلف مواقع پر مخالف موقف اختیار کیا۔ انہوں نے عبوری حکومت کی جانب سے نام کی تبدیلی کے ساتھ

---

۱. کیہان، شمارہ ۱۱۲۱۸، ص ۱۲؛ جمہوری، شمارہ ۴۹۷، ص ۳۔
۲. درمکتب، ج ۳، ص ۱۱۴۔۱۱۸۔
۳. زندگی نامہ مقام معظم رہبری، ص ۱۶۶-۱۷۲۔
۴. مشروح...، دورۂ اول، جلسہ ۱۶۷۔

ایران میں امریکہ کے فوجی مشاورت کے دفتر کو باقی رکھنے کی مخالفت کی[۱]۔ وہ وزیروں اور نائب وزیروں کے انتخاب اور حکومتی دفتروں اور اداروں میں تطہیر کے مسئلے کے بارے میں ایسے افراد کے انتخاب کی مخالفت کرتے تھے جو انقلاب کے راستے پر نہیں تھے اور امریکہ کے ساتھ ساز باز کی سوچ کے حامی تھے[۲]۔

آیت اللہ خامنہ ای ۶ تیر ۱۳۶۰ ش. میں تہران کے جنوبی علاقے میں واقع ابوذر مسجد میں نماز ظہر کی امامت کے بعد تقریر کے دوران ٹیپ ریکارڈر میں نصب بم کے دھماکے میں شدید زخمی ہو گئے[۳]۔ امام خمینی نے آیت اللہ خامنہ ای کے نام پیغام میں ان پر قاتلانہ حملے کی مذمت اور آپ کی تعریف کی[۴]۔ اس قاتلانہ حملے میں آپ کے سینے، کاندھے اور دائیں بازو پر شدید زخم آئے۔ غیر سرکاری رپورٹوں میں ایران کے منافقین کی دہشت گرد تنظیم مجاہدین خلق کو اس واقعہ کا ذمہ دار قرار دیا گیا[۵]۔ آیت اللہ خامنہ ای وہ پہلے شخص تھے پر صدر اور کمانڈر اِن چیف کے عہدے سے بنی صدر کی برطرفی کے بعد قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ ۱۸ مرداد ۱۳۶۰ش. کو انہیں اسپتال سے فارغ کر دیا گیا اور وہ ایک بار پھر سماج اور سیاست کے میدان میں واپس آ گئے اور ۲۶ مرداد ۱۳۶۰ ش. سے مجلس شورای اسلامی (پارلیمنٹ) کے اجلاس میں شرکت کرنا شروع کر دی[۶]۔

دور صدارت

اسلامی جمہوریہ ایران کے دوسرے صدر محمد علی رجائی کی شہادت کے بعد جمہوری اسلامی پارٹی کی مرکزی کونسل اور حوزہ علمیہ قم کے اساتذہ کی تنظیم جامعہ مدرسین نے اتفاق رائے سے اور آیت اللہ خامنہ ای کی

---

۱. مصاحبہ ہا (۱۳۶۳-۱۳۶۴)، ۱۱۴-۱۱۶۔
۲. خلاصہ، جلسہ ہای متعدد۔
۳. ہاشمی رفسنجانی، اکبر، انقلاب در بحران، ص ۱۷۶۔
۴. صحیفہ نور، ج ۱۴، ص ۵۰۴۔
۵. جرعہ نوش کوثر، ص ۲۱۷-۲۱۸۔
۶. مشروح، دورۂ اول، جلسۂ ۱۹۹۔

مخالفت کے باوجود انہیں صدارتی امیدوار کے لیے منتخب کر لیا اور امام خمینی نے جو پہلے علمائے دین کے صدر بننے کے حامی نہیں تھے، ان کے صدارتی امیدوار بننے کی منظوری دے دی[۱]۔

صدارتی امیدوار بننے اور ماہرین کی کونسل یعنی شورای نگہبان کی جانب سے ان کی اہلیت کی توثیق کے بعد مختلف گروہوں اور شخصیات نے ان کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ آیت اللہ خامنہ ای کے اہم ترین حامیوں میں خطِ امام کے گروہوں کا اتحاد شامل تھا[۲]۔ صدارتی انتخابات ۱۰ مہر ۱۳۶۰ ش. کو منعقد ہوئے اور آیت اللہ خامنہ ای اکثریتی ووٹ (۱۱۔۹۵ ٪) حاصل کر کے صدر منتخب ہو گئے[۳]۔ ۱۷ مہر ۱۳۶۰ ش. کو امام خمینی نے ان کی صدارت کی توثیق کر دی[۴] اور انہوں نے ۲۱ مہر کو مجلس شورای اسلامی میں اسلامی جمہوریہ ایران کے تیسرے صدر کی حیثیت سے حلف لیا[۵]۔

۲۷ مہر ۱۳۶۰ ش. کو انہوں نے علی اکبر ولایتی کا نام جو جمہوری اسلامی پارٹی کی مرکزی کونسل کے رکن اور خط امام کے پیروؤں میں شامل تھے، وزیر اعظم کے طور پر مجلس شورای اسلامی میں پیش کیا[۶]۔ لیکن وہ ۳۰ مہر ۱۳۶۰ ش. کو ہونے والی ووٹنگ میں مطلوبہ ووٹ حاصل نہ کر سکے[۷]۔ ۴ آبان ۱۳۶۰ ش. کو نے جمہوری اسلامی کی مرکزی کونسل کے رکن، اخبار جمہوری اسلامی کے ایڈیٹر انچیف اور رجائی، باہنر اور مہدوی کنی کی حکومتوں میں وزیر خارجہ میر حسین موسوی کا نام[۸] وزیر اعظم کے طور پر مجلس شورای اسلامی میں پیش کیا[۹]۔ انہوں نے ۶ آبان ۱۳۶۰ ش. کو مجلس کے اراکین کی اکثریت کے ووٹ حاصل کر لیے[۱۰]۔

---

۱. زوایای جام جم، ص ۵۴۳-۵۴۴۔
۲. جمہوری اسلامی، شمارہ ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ص ۱، ۱۱۔
۳. ایضاً، شمارہ ۶۷۸، ص ۱۱۔
۴. صحیفہ نور، ج ۱۵، ص ۲۷۸۔
۵. مشروح، دورۂ اول، جلسۂ ۲۲۴۔
۶. ایضاً، جلسۂ ۲۲۶۔
۷. ایضاً، جلسۂ ۲۲۷۔
۸. دولتہای ایران از میرزا نصراللہ خان مشیر الدولہ تا میر حسین موسوی، ص ۴۶۱، ۴۶۷، ۴۷۲، ۴۸۲۔
۹. مشروح، دورۂ اول، جلسۂ ۲۲۹۔
۱۰. ایضاً، جلسۂ ۲۳۰۔

آیت اللہ خامنہ ای نے اپنی صدارت کا دور ایک ایسے وقت میں شروع کیا جب صدارتی دفتر کا نظام اور انتظام مناسب نہیں تھا۔ اپنے قانونی فرائض کی انجام دہی میں صدر کی مدد کے لیے مشاورتی گروپ اور ورکنگ گروپ تشکیل نہیں دیے گئے تھے جس سے صدر کو کام کرنے میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ صدارتی دفتر میں کئی مشاورتی اور ورکنگ گروپ قائم کیے گئے[۱]۔ آیت اللہ خامنہ ای نے ابتدا میں اپنی کوششیں صدارتی دفتر کے لیے نظام بنانے پر مرکوز کیں۔ بعد میں صدر کے فرائض و ذمہ داریوں کی تشریح میں ابہام اور پہلے دور صدارت کے دوران خاص طور پر وزیر اعظم کے ساتھ تعاون کے سلسلے میں ان میں کمی ہونے کی وجہ سے، صدر کے اختیارات کا قانون تیار کیا گیا اور ۱۶ اردی بہشت ۱۳۶۵ ش. کو مجلس شورای اسلامی نے اس کی منظوری دی[۲]۔

آیت اللہ خامنہ ای کے پہلے چار سالہ دور صدارت میں ان کے اہم پروگرام درج ذیل تھے:

مسلط کردہ جنگ سے متعلق امور کا جائزہ لینا اور اقدام کرنا، مرکز سے دور افراد اور مستضعفین (کمزور طبقات) کی حمایت میں اقتصادی پالیسیاں تیار کرنا اور ان پر عمل درآمد کرنا، ایرانی عوام کی دفتری، سماجی اور سیاسی زندگی کے تمام شعبوں میں نمود و نمائش کا خاتمہ، ٹیکنیک سے لے کر فن و ہنر تک تمام میدانوں میں انسانی استعداد و صلاحیت سے استفادہ کرنا، عوام کی بہتر اور مؤثر خدمت کے لیے دفتری اور عدالتی اور سماجی سلامتی فراہم کرنا، کسی بھی فکر و سوچ کے حامل اسلامی جمہوری نظام کے وفادار تمام افراد کی آزادی اور سلامتی کا تحفظ کرنا[۳]۔

دوسرے چار سالہ دور میں بھی پہلے دور صدارت کے پروگرام جاری رہنے کے ساتھ ساتھ کہ جن میں مسلط کردہ جنگ سرفہرست تھی، درج ذیل پروگرام بھی آیت اللہ خامنہ ای کے اہم پروگراموں میں شامل تھے:

صدر کے اختیارات کے بل کی تدوین، حکومت کے اختیارات کم کرکے بہت سے امور عوام کے حوالے کرنا، عوام کی زندگی اور معاشرے میں موجود طویل غربت کا خاتمہ، عوام میں زرعی زمینوں کی تقسیم، حکومتی صنعتوں کو نجی شعبے کے حوالے کرنا، ملازمین اور مزدوروں کو کارخانوں میں شریک بنانا، غیر پٹرولیم

---

۱. خاطرات...، ص ۷۔
۲. مشروح، دورۂ دوم، جلسۂ ۲۶۸۔
۳. حاج سید جوادی، فرید، روایت انتخابات، ص ۱۰۳، ۱۰۴۔

برآمدات میں اضافہ اور تیل کی آمدنی پر حکومت کے انحصار کو کم کرنا، ملک کی ثقافتی پالیسی کو ثقافتی استقلال اور خود مختاری کی جانب لے جانا[۱]۔

خارجہ پالیسی اور تعلقات کے میدان میں ان کے پروگرام کچھ اس طرح تھے

دنیا کے ہر ملک کے بارے میں خود مختار اور متوازن پالیسی اختیار کرنا اور ملک اور نظام کی مصلحت اور مفاد کی بنیاد پر ٹھوس اور واضح فیصلہ کرنا، مشرق اور مغرب سے عدم وابستگی[۲]، دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان وحدت و اتحاد کو اہمیت دینا، عالمی طاقتوں سے دنیا کے مسلمانوں کے حقوق واپس لینے کے لیے سنجیدہ کوششیں کرنا اور علاقے میں بڑی طاقتوں کے تسلط کے لیے انجام پانے والے ہر قسم کے اقدام کا مسلسل مقابلہ کرنا، مسئلہ قدس اور فلسطین کے دیگر مقبوضہ علاقوں کیلئے سنجیدہ اقدام کرنا، دشمنوں اور لٹیروں کے سدراہ کی حیثیت سے بین الاقوامی میدان میں اصل اور مالا مال اسلامی ثقافت کی جانب بازگشت، بین الاقوامی میدانوں میں موثر موجودگی اور فعالیت میں اضافہ[۳]۔

آیت اللہ خامنہ ای پہلے چار سالہ دور صدارت میں مشکلات و مسائل اور وزیر اعظم اور کابینہ کے بعض ارکان کے ساتھ اختلاف نظر کے تجربے کے پیش نظر دوسری بار صدارتی انتخابات میں حصہ لینا نہیں چاہتے تھے لیکن جب امام خمینی نے اسے ان کی شرعی ذمہ داری قرار دیا تو انہوں نے صدارتی انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور امام خمینی سے درخواست کی کہ وزیر اعظم کے انتخاب میں انہیں اختیار حاصل ہو اور امام نے بھی یہ قبول کیا[۴]۔

دوبارہ صدر منتخب ہونے کے بعد اور وزیر اعظم کے انتخاب سے قبل جب یہ معلوم ہوا کہ آیت اللہ خامنہ ای وزیر اعظم کی جانب سے ملک کا انتظام چلانے کی صورت حال پر راضی نہ ہونے کی وجہ سے کسی اور شخص کا نام وزیر اعظم کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں تو بعض فوجی حکام نے امام خمینی کے پاس جا کر اس بات کا اظہار کیا کہ جنگ کے محاذوں پر پیشرفت اور پیش قدمی انجینئر میر حسین موسوی کے دوبارہ وزیر اعظم بننے پر

---

۱. جمہوری اسلامی، شمارہ ۱۷۹۹، ص ۱۰-۱۱۔
۲. نوازنی، بہرام، گاہ شمار سیاست خارجی ایران از دی ماہ ۱۳۵۶ تا مرداد ماہ ۱۳۶۷، ج۱، ص۲۹۸، ۳۰۰، ۳۳۹، ۳۹۲۔
۳. علی بابائی، ج ۶، ص ۱۳۰۔
۴. ہاشمی رفسنجانی، اکبر، امید و دلواپسی، ص ۲۲-۲۳؛ جرعہ نوش، ص ۲۳۷۔

منحصر ہے۔ امام خمینی نے بھی جنگ کی مصلحت کی وجہ سے ان کی رائے قبول کی اور آیت اللہ خامنہ ای کو حکم دیا کہ وہ انجینئر میر حسین موسوی کا نام وزیر اعظم کے طور پر پیش کریں۔ آیت اللہ خامنہ ای نے امام کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے اور اپنی مخالفت کے باوجود، ان کا نام پارلیمنٹ میں پیش کیا[۱]۔ آیت اللہ خامنہ ای کے دوسرے دور صدارت میں صدر اور وزیر اعظم کے اختلافات بدستور جاری رہے اور کابینہ کے ارکان کے انتخاب جیسے مواقع پر ان میں شدت بھی آئی۔

۸ شہریور ۱۳۶۲ ش. کو آیت اللہ خامنہ ای کو امام خمینی کے حکم کے مطابق ثقافتی انقلاب کے ادارے میں پہلی ترمیم کی ذمہ داری سونپی گئی۔ امام خمینی نے یہ حکم یونیورسٹیوں کے کھلنے کی مناسبت سے آیت اللہ خامنہ ای کی درخواست کے جواب میں جاری کیا[۲]۔ اسی طرح انہوں نے ثقافتی انقلاب کے ادارے میں دوسری ترمیم امام خمینی کے حکم کی بنیاد پر ۱۹ آذر ۱۳۶۳ ش. کو انجام دی[۳]۔ اس ترمیم میں ثقافتی انقلاب کا نام تبدیل کرکے ثقافتی انقلاب کی اعلیٰ کونسل رکھ دیا گیا اور صدر اس کے سربراہ بن گئے[۴]۔ آیت اللہ خامنہ ای تیر ماہ ۱۳۶۸ ش. تک یعنی اپنے دوسرے دور صدارت کے آخر تک اس عہدے پر باقی رہے اور اس دوران انہوں نے ملک کی اہم ثقافتی پالیسیوں کو مرتب کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا[۵]۔

آیت اللہ خامنہ ای کے آٹھ سالہ دور صدارت میں ایران کی خارجہ پالیسی اور ڈپلومیسی بہت زیادہ فعال ہو گئی۔ خارجہ پالیسی اور تعلقات میں توسیع اور فروغ کا ایک اہم سبب، تعلقات کو فروغ دینے کے لیے صدر مملکت کے مختلف ملکوں کے دورے تھے جو پہلے صدارتی دور میں شروع ہوئے اور دوسرے دور میں ان میں اضافہ ہوا[۶]۔ انہوں نے اپنے دور صدارت میں ۱۵ سے ۲۰ شہریور ۱۳۶۳ ش. تک شام، لیبیا اور الجزائر اور دوسرے دور میں ۲۳ دی ماہ سے ۳ بہمن ۱۳۶۴ ش. تک ایشیائی اور افریقی ممالک، پاکستان،

---

۱. ایضا، ص ۲۲-۲۳؛ جرعہ نوش، ص ۲۳۷۔
۲. صحیفہ نور، ج ۱۸، ص ۸۳-۸۴۔
۳. ایضاً، ج ۱۹، ص ۱۱۰، ۱۱۱۔
۴. بیست سال...، ص ۷-۸۔
۵. صحیفہ نور، ج ۱۹، ص ۱۷۱، ۳۱۶؛ ج ۲۱، ص ۱۴۸، ۳۴۳؛ نک: بیست سال، جم۔
۶. آرشیو مرکز پژوہش...، پروندہ ہای دورۂ ریاست جمہوری آیت اللہ خامنہ ای۔

تنزانیا، زمبابوے، انگولا اور موزمبیک کا دورہ کیا۔ ۱۱ سے ۱۵ شہریور ۱۳۶۵ ش. تک ہرارے میں ہونے والے ناوابستہ تحریک کے آٹھویں سربراہی اجلاس میں شرکت کے لیے ایک بار پھر انہوں نے زمبابوے کا دورہ کیا۔ اس دورے کے دوران انہوں نے سربراہی اجلاس میں تقریر کی اور ناوابستہ تحریک کے رکن ممالک کے بعض سربراہوں سے ملاقات اور گفتگو کی[۱]۔ ۲ سے ۶ اسفند ۱۳۶۷ ش. تک انہوں نے یوگوسلاویہ اور رومانیہ[۲] اور ۱۹ سے ۲۶ اردی بہشت ۱۳۶۸ ش. تک چین اور شمالی کوریا کا دورہ کیا[۳]۔

آیت اللہ خامنہ ای نے ۳۱ شہریور ۱۳۶۶ ش. کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے بیالیسویں اجلاس میں شرکت کی اور اپنی تقریر میں دنیا کے سربراہوں کے لیے اسلامی جمہوریہ ایران کے اصولی موقف اور نظریات کی وضاحت کی۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر کی یہ پہلی شرکت تھی[۴]۔ اقوام متحدہ کے دورے میں ایک اہم بات نیویارک میں مقیم ایرانیوں اور مسلمانوں اور اسی طرح بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کی جانب سے ان کا عظیم الشان استقبال اور اسلامی انقلاب اور مسلط کردہ جنگ کے حالات اور ایران کے بارے میں عالمی سامراج کی پالیسیوں کو بیان کرنے کے لیے ان کی سرگرمیوں کی بھرپور کوریج تھی۔ نیویارک کے مسلمانوں کی نماز جمعہ کی امامت اور اس کے خطبوں میں تقریر بھی اس دورے کی اہم اور نمایاں بات تھی۔

خارجہ پالیسی کے میدان میں آیت اللہ خامنہ ای کے دیگر اقدامات میں سے افغانستان، عراق اور لبنان میں شیعہ سیاسی گروہوں کے ساتھ گہرا رابطہ قائم کرنا اور ان کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے نیز مجلس اعلای انقلاب اسلامی عراق کی تشکیل کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ان کے درمیان اختلافات کو ان کے مشترکہ دشمن کے خلاف وحدت واتحاد میں تبدیل کر دیا۔ افغانستان کی آٹھ جماعتوں پر مشتمل حزب وحدت اسلامی کی تشکیل کہ جس نے ان کی نقصان دہ محاذ آرائی کا خاتمہ کر دیا اور مجلس اعلای انقلاب اسلامی عراق کی تشکیل اس کے اہم مصادیق میں سے ہے۔ اس دور میں ایران کی جانب سے لبنان، فلسطین،

---

۱. جمہوری اسلامی، شمارہ ۱۹۲۱، ص ۱۲۔
۲. ایضاً، شمارہ ۲۸۲۶، ص ۱۲، شمارہ ۲۸۲۷، ص ۱۱۔
۳. ایضاً، شمارہ ۲۸۸۶، ص ۱۲؛ شمارہ ۲۸۸۹، ص ۲۔
۴. ایضاً، شمارہ ۲۴۱۳، ص ۱۰۔

عراق اور افغانستان میں اسلامی مجاہدین کی حمایت میں اضافہ ہوا اور ایران کی حمایت و پشت پناہی نے ان ملکوں میں اسلامی گروہوں اور جماعتوں کو علاقائی اور بین الاقوامی پوزیشن عطا کی۔

عوام کے مختلف طبقات سے ملاقات، مختلف اداروں کا معائنہ، منصوبوں کی افتتاحی تقریب میں شرکت، کانفرنسوں میں شرکت اور صوبوں کے دورے، اپنے دور صدارت میں آیت اللہ خامنہ ای کے پروگراموں اور اقدامات میں شامل تھے۔ عوام خاص طور پر شہداء کے اہل خانہ کے ساتھ رابطے اور تعلق کو قائم رکھنا، دور صدارت میں آیت اللہ خامنہ ای کی بنیادی حکمت عملی میں شامل تھا۔ اس بنیاد پر مختلف مناسبتوں اور مواقع پر عوامی ملاقاتیں اور شہداء کے اہل خانہ سے ملاقات خاص طور پر ان کے گھروں میں جانا ان کے مستقل پروگراموں میں شامل تھا اور حکمرانوں اور عوام کے تعلق اور رابطے کے سلسلے میں یہ ان کا اہم اقدام شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح عوام کے مختلف طبقات خصوصاً کمزور اور پسماندہ طبقے سے ملاقات کے مقصد سے ملک کے مختلف صوبوں اور علاقوں کے دورے، قریب سے ان کی مشکلات اور مسائل سے آگاہی، مقامی حکام کے اختلافات کو دور کرنا، سپاہ انقلاب اور فوج کے تعاون اور جنگ سے متعلق مسائل کا جائزہ لینا، شہروں اور دیہاتوں کے علماء اور اہم شخصیات سے ملاقات، اقتصادی مسائل و مشکلات کا جائزہ لینا اور ان جیسے دیگر اقدامات، ان کے اہم اقدامات شمار ہوتے ہیں اور یہ مسلسل جاری رہے اور انتہائی مؤثر ثابت ہوئے۔

۱۶ دی ۱۳۶۶ ش. کو امام خمینی نے آیت اللہ خامنہ ای کے نام ایک خط میں، ولایت فقیہ اور اسلامی حکومت کے اختیارات کی حدود کے بارے میں تہران کی نماز جمعہ کے خطبوں میں ان کے بیانات کے تناظر میں، اسلامی حکومت کو اسلام کے احکام اولیہ میں سے اور تمام فرعی احکام پر مقدم قرار دیا اور فرمایا کہ ولایت فقیہ مطلقہ ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای نے امام خمینی کے خط کے جواب میں، امام خمینی کے نقطۂ نظر سے اپنی اعتقادی اور عملی پیروی اور اتباع کا اعلان کیا۔ اسی طرح امام خمینی کی خدمت میں حاضر ہو کر نماز جمعہ کے خطبوں میں اپنے بیانات کے مقصد اور مطلوب کے بارے میں انہیں آگاہ کیا۔ امام خمینی نے بھی اسی روز اس خط کا جواب دیا اور آیت اللہ خامنہ ای کی تعریف کرتے ہوئے خط میں لکھا کہ: "میرا آپ سے انقلاب سے پہلے کے برسوں سے قریبی رابطہ اور تعلق رہا ہے اور یہ تعلق بحمد اللہ ابھی تک قائم و باقی ہے، میں آپ کو اسلامی جمہوریہ کا ایک مضبوط اور توانا بازو سمجھتا ہوں اور آپ کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں جو فقہی مسائل سے آگاہ اور ان کا پابند ہے اور ولایت مطلقہ فقیہ سے متعلق بنیادی فقہی اصولوں کی سخت حمایت و طرفداری کرتا

ہے، اور آپ ان نادر اور گنے چنے افراد میں سے ہیں جو اسلام اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کی پابندی کی وجہ سے آفتاب کی مانند روشنی پھیلاتے ہیں"[۱]۔

مختلف بلوں کی منظوری میں مجلس شورای اسلامی (پارلیمنٹ) اور مجلس خبرگان (ماہرین کی کونسل) کے اختلافات کے بعد امام خمینی نے (آیت اللہ خامنہ ای سمیت) ملکی حکام کے خط کے جواب میں ۱۷ بہمن ۱۳۶۶ ش. کو مجمع تشخیص مصلحت کی تشکیل سے اتفاق کیا[۲]۔ اس کے مطابق آیت اللہ خامنہ ای مجمع تشخیص مصلحت کے پہلے سربراہ بنے[۳]۔ وہ اپنے دور صدارت کے اختتام تک اس عہدے پر فائز رہے[۴]۔

آیت اللہ خامنہ ای اپنے آٹھ سالہ دور صدارت میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد کے برسوں کی مانند امام خمینی کے ایک قریبی ساتھی، مشیر اور قابل اعتماد فرد تھے۔ اسی بنا پر امام خمینی نے بہت سے مواقع پر صدر کے فرائض سے ہٹ کر انہیں کئی ذمہ داریاں سونپیں یا مختلف امور اور مسائل میں ان کی تجاویز قبول کیں؛ اور ۱۵ فروردین ۱۳۶۲ ش. کو فوج اور سپاہ انقلاب کے امور ان کے سپرد کیے[۵]۔ امام خمینی نے یکم آبان ۱۳۶۲ ش. کو آیت اللہ خامنہ ای کو امریکہ اور دیگر ملکوں سے ایران کی دولت اور رقم واپس لینے کی ذمہ داری سونپی[۶]۔ اسی سال یکم آذر کو انہوں نے فوج کی اطلاعات کی حفاظت کا ادارہ تشکیل دینے کے لیے آیت اللہ خامنہ ای کی تجویز منظور کی[۷]۔ ۹ دی ۱۳۶۲ ش. کو تعزیرات کے بل کا دوبارہ جائزہ لینے کی ذمہ داری ان کو سونپی گئی[۸]۔ امام خمینی نے ۲۳ بہمن ۱۳۶۷ ش. کو آیت اللہ خامنہ ای کو مامور کیا کہ وہ سپریم جوڈیشل کونسل کے ارکان کو دعوت دیں کہ وہ ملک کے تینوں بڑے اداروں کے سربراہی اجلاس میں شرکت کریں

---

۱. صحیفہ نور، ج ۲۰، ص ۴۵۲، ۴۵۵۔
۲. ایضاً، ج ۲۰، ص ۴۶۳، ۴۶۵۔
۳. گفت وگو با...، ص ۵۲۔
۴. ایضاً، ص ۶۸-۶۹۔
۵. صحیفہ نور، ج ۱۷، ص ۳۹۷۔
۶. ایضاً، ج ۱۸، ص ۱۸۸۔
۷. ایضاً، ص ۲۲۸۔
۸. ایضاً، ص ۲۷۲۔

اور اس کونسل کے کام کو بہتر بنانے کے لیے کام کی تقسیم کے بارے میں اپنی تجاویز پیش کریں[۱]۔ بالآخر انہوں نے تینوں اداروں کے سربراہی اجلاس میں جائزہ لیے جانے والی تجویز کی بھی منظوری دی[۲]۔ ۴ ۱۳۶۷ ش. کو بھی امام خمینی نے ایک خط میں انہیں ایران میں مقیم عراقی باشندوں کے مسائل کا جائزہ لینے اور انہیں حل کرنے کا انچارج بنایا[۳]۔

امام خمینی نے ۴ اردی بہشت ۱۳۶۸ ش. کو آیت اللہ خامنہ ای کو مخاطب کرتے ہوئے آیت اللہ خامنہ ای سمیت بیس افراد پر مشتمل ایک وفد معین کیا تاکہ وہ مجلس شورای اسلامی کی طرف سے منتخب کردہ پانچ ارکان پارلیمنٹ کے ہمراہ آئین کا جائزہ لینے کی کونسل تشکیل دے اور پانچ موضوعات اور مسائل میں آئین پر نظرثانی اور اس کی تکمیل کا کام کرے[۴]۔ اس کونسل کی تشکیل کے بعد آیت اللہ مشکینی اس کے آیت اللہ خامنہ ای سینیئر نائب صدر اور اکبر ہاشمی رفسنجانی نائب صدر منتخب ہوئے[۵]۔ اس کونسل نے اپنے اجلاس کے دوران پانچ اصلی موضوعات اور امور: رہبر کی شرائط، عدلیہ اور انتظامیہ میں تمرکز، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ادارے کی انتظامیہ میں تمرکز، مستقبل میں آئین کے ممکنہ جائزے کے طریقہ کار اور مجلس شورای اسلامی (پارلیمنٹ) کے ارکان کی تعداد، کے بارے میں بحث کی اور ان کا جائزہ لیا اور اس بارے میں فیصلہ کیا گیا[۶]۔ یہ اجلاس امام خمینی کی رحلت کے بعد تک جاری رہے۔

رہبری اور قیادت کا دور

بانی انقلاب اسلامی امام خمینی کی رحلت کے بعد اسلامی جمہوری نظام کے رہبر کے طور پر آیت اللہ خامنہ ای کا انتخاب اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد کے دور میں ایران کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔

---

۱. ایضاً، ج ۲۱، ص ۲۵۸
۲. ایضاً، ۲۶۴
۳. ایضاً، ص ۳۱۵
۴. ایضاً، ص ۳۶۳-۳۶۴
۵. صورت مشروح مذاکرات شورای بازنگری قانون اساسی جمہوری اسلامی ایران، ج ۱، ص ۱-۲۹
۶. صورت مشروح مذاکرات شورای بازنگری قانون اساسی جمہوری اسلامی ایران ج ۱-ص ۴

۱۴ خرداد ۱۳۶۸ ش. کو ایک ایسے وقت میں کہ جب حکام امام خمینی کے جسد خاکی کی تکفین وتدفین کی تیاری کر رہے تھے، حکومتی اور فوجی حکام کی موجودگی میں صدر مملکت آیت اللہ خامنہ ای نے امام خمینی کا سیاسی ـالٰہی وصیت نامہ پڑھ کر سنایا۔ رہبر کے انتخاب کی کونسل مجلس خبرگان رہبری نے اسی روز عصر کے وقت ایک اجلاس منعقد کیا تاکہ اسلامی جمہوری نظام کے لیے رہبر یا قیادت کونسل کا انتخاب کیا جائے۔ ۱۳۵۸ ش. میں پاس ہونے والے آئین کے آرٹیکل ۱۰۷ کے مطابق رہبر کا انتخاب مجلس خبرگان کے ارکان کی ذمہ داری ہے۔ رہبر یا قیادت کونسل کی بحث میں مجلس خبرگان کے اکثر ارکان نے قیادت کونسل کے حق میں ووٹ نہیں دیا اور جب رہبر کے انتخاب کی بحث سامنے آئی تو آیت اللہ خامنہ ای کا نام پیش کیا گیا۔ مجلس خبرگان کے بعض ارکان نے کہ جو امام کی رحلت کے بعد اسلامی جمہوری نظام کے رہبر کے لیے آیت اللہ خامنہ ای کی صلاحیت پر مبنی امام خمینی کی نظر کے بارے میں کہ جو امام خمینی نے ملکی اداروں کے سربراہوں، وزیراعظم اور حاج سید احمد خمینی کی موجودگی میں بیان کی تھی، اجمالی طور پر اطلاع رکھتے تھے، عینی شاہدین اور گواہوں سے اس بارے میں وضاحت کے لیے کہا۔ امام خمینی کی اس نظر کو نقل کرنے والے دو گواہوں نے جو خود بھی مجلس خبرگان کے رکن تھے، اس بات کی تصدیق کی کہ امام نے ایسا کہا تھا۔ اسی طرح آیت اللہ خامنہ ای کے چین اور شمالی کوریا کے دورے کے دوران امام خمینی کی اس بات کو بھی واسطہ کے ساتھ نقل کیا گیا کہ آیت اللہ خامنہ ای رہبر بننے کی شائستگی اور لیاقت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ووٹنگ کی گئی اور مجلس خبرگان کے ارکان کی اکثریت نے امام خمینی کی نظر اور آیت اللہ خامنہ ای کی دینی، علمی اور سیاسی صلاحیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں اسلامی جمہوری نظام کا رہبر منتخب کر لیا[1]۔ آیت اللہ خامنہ ای نے خود اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں: جب تک میں نے انتخاب کے موضوع کو متعین نہ جانا، میں اسے قبول کرنے سے گریز کر رہا تھا[2]۔ آئین پر نظر ثانی اور ریفرنڈم انجام پانے کے بعد مجلس خبرگان رہبری نے ایک بار پھر نئے آئین کی بنیاد پر ان کی رہبری کے بارے میں ووٹنگ کی اور واضح اکثریت نے ایک بار پھر ان کو نظام کے رہبر کے طور پر منتخب کر لیا۔

---

۱. چگونگی...، ص ۱۸؛ بازسازی وسازندگی، ص ۱۴۹-۱۵۱

۲. حدیث، ج ۱، ص ۱۸۲-۱۸۳

آیت اللہ خامنہ ای کی قیادت و رہبری کے سلسلے میں امام راحل کی نظر ان امور پر استوار تھی:

اسلامی حکومت کے قیام کے لیے طویل جد وجہد، اسلامی انقلاب اور اسلامی جمہوری نظام پر پختہ اور روشن یقین، اسلامی جمہوری نظام کے قیام کے لیے ایک دہائی سے زائد عرصے پر محیط بھرپور سیاسی، انتظامی اور ثقافتی سرگرمیاں، دینی روشن خیالی، بنیادی دینی تعلیمات پر علمی تسلط اور عبور، فردی اور اجتماعی رویہ اور زہد و تقویٰ۔ امام خمینی نے مختلف مواقع پر اسلامی جمہوری نظام کی خدمت کے راستے میں آیت اللہ خامنہ ای کے کام اور خدمات، فرض شناسی اور لیاقت و اہلیت کی تائید کی تھی۔ انہوں نے ۷ تیر ۱۳۶۰ ش. میں آیت اللہ خامنہ ای پر قاتلانہ حملے کی مناسبت سے اپنے پیغام میں فرمایا: "اب انقلاب کے دشمنوں نے آپ پر کہ آپ رسول اکرم ﷺ کی اولاد اور حسین ابن علی علیہما السلام کے خاندان میں سے ہیں اور اسلام اور اسلامی ملک کی خدمت کرنے کے علاوہ آپ کا کوئی اور جرم نہیں ہے اور آپ جنگ کے محاذ پر فداکار سپاہی، محراب میں درس دینے والے معلم، جمعہ و جماعات میں بہترین خطیب اور انقلاب کے میدان میں ایک ہمدرد رہنما ہیں، قاتلانہ حملہ کرکے آپ کی سیاسی فکر و سوچ کی بلندی، عوام کی حمایت و طرفداری اور ظالموں اور ستمگروں کی مخالفت کو ثابت کر دیا۔ انہوں نے آپ پر قاتلانہ حملہ کرکے پورے ملک بلکہ دنیا میں لاکھوں مومن انسانوں کے جذبات کو مجروح کیا۔ وہ سیاسی بصیرت سے اس قدر بے بہرہ ہیں کہ مجلس اور جمعہ میں آپ کی تقریر کے بعد بلا جھجھک اور ملت کے سامنے اس جرم کا ارتکاب کر ڈالا، انہوں نے اس شخص پر قاتلانہ حملہ کیا جس کی صلاح و اصلاح کی دعوت کی آواز دنیا کے مسلمانوں کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں عزیز خامنہ ای آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ محاذ جنگ پر فوجی لباس میں اور محاذ جنگ کے پیچھے علماء کے لباس کے ساتھ اس مظلوم قوم کی خدمت کی اور خداوند متعال سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت جاری رکھنے کے لیے آپ کی صحت و سلامتی کی دعا کرتا ہوں"[۱]۔ امام خمینی نے ۸ شہریور ۱۳۶۵ ش. کو سیاسی افراد اور شخصیات کو نصیحت کی کہ وہ اپنی باتوں میں مستقل عیب تلاش کرنے کے بجائے آیت اللہ خامنہ ای کی طرح بنیں جو ہمیشہ دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں اور اپنی خدمات پر اتراتے نہیں ہیں[۲]۔

---

۱. صحیفہ نور، ج ۱۴، ص ۵۰۴

۲. ایضاً، ج ۲۰، ص ۱۲۷

حجت الاسلام والمسلمین سید احمد خمینی نے جو امام خمینی کے قریبی ترین فرد، فرزند اور مکمل طور پر قابل اعتماد تھے، نقل کیا ہے کہ امام نے آیت اللہ خامنہ ای کے غیر ملکی دورے کے بعد کہا: "بے شک یہ قیادت و رہبری کی لیاقت واہلیت رکھتے ہیں"[۱]۔ امام خمینی کی بیٹی زہرا مصطفوی نے بیان کیا ہے کہ جب انہوں نے امام خمینی سے نظام کے آئندہ رہبر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے آیت اللہ خامنہ ای کا نام لیا اور جب آیت اللہ خامنہ ای کے علمی مقام و مرتبے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے آیت اللہ خامنہ ای کے اجتہاد کی تائید کی[۲]۔

آیت اللہ ہاشمی رفسنجانی نے بھی نقل کیا ہے کہ جب امام خمینی آیت اللہ منتظری کو آئندہ قیادت و رہبری سے ہٹانا چاہتے تھے تو ایک اجلاس میں جو امام کے گھر پر منعقد ہوا اور اس میں تینوں اداروں کے سربراہ، وزیر اعظم (میر حسین موسوی) اور حاج سید احمد خمینی شریک تھے، رہبر کے جانشین کے بارے میں بحث ہوئی، امام نے نظام کے آئندہ رہبر کے لیے آیت اللہ خامنہ ای کا نام لیا۔ انہوں نے اسی طرح بیان کیا ہے کہ انہوں نے امام راحل کے ساتھ ایک خصوصی نشست میں مستقبل میں قیادت و رہبری کی صورت حال کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا اور امام نے جواب میں آیت اللہ خامنہ ای کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "آپ تعطل کا شکار نہیں ہوں گے، ایسا فرد آپ کے درمیان ہے آپ کو خود کیوں پتہ نہیں ہے؟"[۳]۔

بلاشبہ آیت اللہ خامنہ ای کے نظام کے رہبر کے طور پر انتخاب کا زمانہ خاص اہمیت اور حساسیت کا حامل تھا۔ امام خمینی کی بیماری کے بعد جو تشویش پیدا ہوئی تھی وہ ان امور سے عبارت تھی:

۱۔ امام خمینی کے بعد کے دور میں ملک کا انتظام چلانا[۴]؛

۲۔ آئین پر نظر ثانی اور اصلاح کا نامکمل ہونا؛

۳۔ عراق کی جانب سے جنگ بندی کی مسلسل خلاف ورزی کے پیش نظر، عراق، امریکہ اور منافقین کے حملے یا فوجی سرگرمیوں اور جنگ میں خود کو کامیاب اور فاتح قرار دینے کے لیے ان کے وسیع پروپیگنڈے پر تشویش؛ ۴۔ خارجہ پالیسی کے میدان میں کتاب شیطانی آیات کی اشاعت کی سازش سے پیدا ہونے

---

۱. جرعہ نوش، ص ۲۶۵

۲. جمہوری اسلامی، شمارہ ۵۲-۵۳، ص ۲

۳. مرجعیت...، ص ۷۰

۴. جمہوری اسلامی، شمارہ ۲۹۰۵، ص ۱۴-۱۵

والے بحران کا جاری رہنا اور اس کے مصنف سلمان رشدی کے مرتد ہونے پر مبنی امام خمینی کا تاریخی فتویٰ کہ جس پر مغربی ملکوں نے سخت رد عمل ظاہر کیا[۱]۔

لیکن جس چیز نے ان تمام تشویشوں کو امید میں تبدیل کر دیا، وہ عبارت تھی:

۱۔ آیت اللہ خامنہ ای کا رہبر کے طور پر انتخاب جو کم ترین مدت میں انجام پایا۔

۲۔ دسیوں لاکھ افراد نے امام خمینی کے جلوس جنازہ میں شرکت کی۔ ایک عوامی رہنما کے جلوس جنازہ میں دنیا میں سب سے زیادہ لوگوں کی شرکت نے ایک عظیم طوفان کی مانند دشمن کی ہر قسم کی سازش کے امکان کو ختم کر دیا۔

۳۔ نظام کے اعلیٰ حکام، بیت امام، مراجع، علماء، دانشوروں اور دینی مدارس اور یونیورسٹیوں کی شخصیات، شہداء کے اہل خانہ اور عوام کے مختلف طبقات کی تائید اور بیعت۔

۴۔ ملک میں قوت و طاقت کی علامت اداروں نے رہبر کی حیثیت سے آیت اللہ خامنہ ای کے انتخاب کی حمایت کی اور ان کی اطاعت کے لیے اپنی آمادگی کا اعلان کیا[۲]۔

۵۔ حاج سید احمد خمینی نے رہبر کے طور پر حضرت آیت اللہ خامنہ ای کے انتخاب کے چند گھنٹے بعد ان کے نام تہنیتی پیغام ارسال کرکے کہا: "حضرت امام خمینی نے بارہا ہمارے اسلامی نظام کی قیادت و رہبری کے لیے بہترین فرد اور مسلّم مجتہد کی حیثیت سے آپ کا نام لیا تھا۔ میں اور بیت امام کے تمام ارکان تہہ دل سے مجلس خبرگان کے محترم مجتہدین کرام کا شکریہ ادا کرتے ہیں کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ ہمارے پیارے امام کی روح اس انتخاب سے خوش اور پرسکون ہوئی ہے۔ میں ایک بار پھر ایک چھوٹے بھائی کی مانند اس ولی فقیہ کے احکامات کی پیروی خود پر لازم و ضروری سمجھتا ہوں"[۳]۔

۶۔ وسیع پیمانے پر ہونے والی بیعت اس پیغام کی حامل تھی کہ امام خمینی کا جانشین قول و فعل کے میدان میں امام کے راستے اور سوچ پر پختہ یقین اور عقیدہ رکھتا ہے اور وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اسے جاری رکھے گا۔ یہ بیعت بالمشافہ، ریلیوں میں شرکت، اطلاعیہ اور مبارک باد کے پیغامات جاری کرکے

---

۱. جمہوری اسلامی، شمارہ ۲۸۵۲، ص ۳؛ کیہان، شمارہ ۱۳۶۲۱، ص ۱۲،۱

۲. حدیث، ج ۱، ج۴

۳. جمہوری اسلامی، ۲۹۲۴، ص ۳

اور طومار پر دستخط کے ذریعے کی گئی[1]۔ امام خمینی کے چہلم کے موقع پر امام کے ساتھ میثاق اور رہبر کی بیعت کے قافلے پورے ایران سے تہران کی طرف چلے[2] اور ملک کے بعض سرحدی اور اسٹریٹجک علاقوں میں "رہبر کی بیعت کے نام سے فوجی مشقیں انجام دی گئیں"[3] اور اس کے علاوہ "امام کے ساتھ میثاق اور رہبر کی بیعت" کے عنوان سے سمیناروں کا انعقاد کیا گیا[4]۔ آیت اللہ خامنہ ای کی بیعت کا سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہا اور اس نے دنیا والوں پر ثابت کر دیا کہ ایران آیت اللہ خامنہ ای کی قیادت و رہبری میں بدستور امت اسلامی کا علمبردار ہے۔

۷۔ آیت اللہ خامنہ ای نے بار بار اپنے اس موقف پر زور دیا کہ وہ راہ امام کو جاری رکھیں گے، عوام اور رہبر کے درمیان باہمی اعتماد کو قائم رکھیں گے اور اتحاد کا تحفظ کریں گے، دینی اصول، شرع اور فقہ اسلامی کے تحفظ پر اصرار کریں گے، معاشرے کے کمزور، پسماندہ اور نچلے طبقے کی بے دریغ حمایت کریں گے، مظلوم کے ساتھ یکجہتی اور اتحاد قائم کریں گے اور اسلام اور مسلمان قوموں کی عزت و سربلندی کے لیے کوشش کریں گے اور عالمی طاقتوں کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوں گے۔ آیت اللہ خامنہ ای نے امام خمینی کو "انقلاب کے شجرہ طیبہ کی جڑ" قرار دیا اور اعلان کیا کہ "ہم راہ امام کی بنیاد پر اپنے راستے کو جاری رکھیں گے"[5]۔

داخلی پالیسی

داخلی سیاست اس دور میں پانچویں صدارتی انتخابات نیز ۱۳۵۸ ش. میں پاس کیے گئے آئین میں ترمیم کے ریفرنڈم سے شروع ہوتی ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای کی قیادت و رہبری کے دور کے آغاز سے لے کر اب تک (یہ کتاب لکھنے تک) سات حکومتیں عوام کے براہ راست ووٹوں سے تشکیل پا چکی ہیں۔ اس دور میں

---

۱. کیہان، شمارہ ۱۳۶۳۱
۲. جمہوری اسلامی، شمارہ ۲۹۲۹
۳. ایضاً، شمارہ ۲۹۷۲
۴. ایضاً، شمارہ ۲۹۷۹
۵. حدیث، ج ۱، ص ۳-۵، ۹۵، ۳۱۴

حکومتوں کی تشکیل کی ایک اہم خصوصیت مقابلے سے بھرپور انتخابات کا انعقاد تھا۔ رہبر انقلاب اسلامی نے ہمیشہ حکومتوں کی حمایت کا رویہ اپنایا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ حکومتوں کے بعض اقدامات اور کارکردگی کا تنقیدی جائزہ بھی لیا۔ آیت اللہ خامنہ ای نے ڈھکے چھپے انداز میں اور کھل کر بھی حکومتوں کو اہم احکامات دیے اور نصیحتیں کیں۔ ان کی بعض نصیحتیں درج ذیل ہیں:

کمزور اور پسماندہ طبقات پر توجہ، شریعت کے راستے پر گامزن ہونا اور اس سے انحراف نہ کرنا، امام خمینی کے راستے کو جاری رکھنا اور عوام کے ساتھ رابطہ۔

صوبائی دورے

عوام کے ساتھ رابطہ اور ان کی خدمت کو جاری رکھنے کے لیے رہبر انقلاب اسلامی کا ایک اہم ترین اقدام، صوبائی دورے تھے۔ آیت اللہ خامنہ ای صوبائی دوروں کی اہمیت کو، عوام کے ساتھ ملاقات، مختلف طبقات کی احوال پرسی، ان کے درمیان موجودگی، ان کے حالات سے آگاہی اور عوام کی زندگی اور مسائل کے بارے میں قریب سے معلومات حاصل کرنا قرار دیتے ہیں[1]۔ انہوں نے صدور مملکت کے صوبائی دوروں کو بھی ہمیشہ عوام کے ساتھ حکومت کے رابطے اور تعلق کو قائم رکھنے اور قریب سے ان کی مشکلات و مسائل کو جاننے کے لیے ایک اہم اقدام قرار دیا ہے اور ان کو جاری رکھنے پر زور دیا ہے[2]۔ رہبر انقلاب اسلامی کی نظر میں حکام کے صوبائی دوروں کے درج ذیل اثرات مرتب ہوتے ہیں:

ان دوروں سے عوام کے ساتھ ان کا تعلق اور اسلامی جمہوری نظام کے ساتھ عوام کا رابطہ مضبوط ہوتا ہے، پسماندگی کے خاتمے اور ملک کی اقتصادی، صنعتی، اجتماعی اور ثقافتی ترقی میں مدد ملتی ہے؛ پورے ملک میں سماجی انصاف کے قیام اور عوام کے مختلف طبقات اور قوموں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان دوروں کے دیگر مقاصد بھی ہیں جیسے فیصلہ سازوں اور انتظامیہ کے افراد کا براہ راست رابطہ، دانشوروں اور مقامی حکام کے ساتھ رابطہ، شہداء کے اہل خانہ اور غازیوں کی تکریم و ستائش، ملک کے مقامی

---

۱. چہار محال و بختیاری کے صوبائی دورے کے اختتام پر ایک انٹرویو ۱۳۷۱/۷/۷
۲. بیانات، ۱۳۸۴/۱۲/۸

خدمت گذاروں کو خراج تحسین پیش کرنا، پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور اسی طرح جنگ کے خاتمے کے بعد حالیہ برسوں کے دوران پسماندہ علاقوں کا دورہ اسلامی جمہوری نظام کے لیے ایک اہم حکمت عملی تھا۔

خارجہ پالیسی

آئین کے آرٹیکل ۱۱۰ کے مطابق مجمع تشخیص مصلحت نظام کے ساتھ صلاح و مشورے کے بعد خارجہ پالیسی سمیت نظام کی کلی اور مجموعی پالیسیوں کا تعین کرنا اور اسی طرح ان کی نگرانی رہبر انقلاب اسلامی کی ذمہ داری ہے۔ خارجہ پالیسی کو منظور یا اسے مسترد کرنا اسلامی جمہوری نظام کے رہبر کے اختیارات میں شامل ہے اور خارجہ پالیسی کے اہم معاملات میں ان کی نظر، حتمی ہے[۱]۔ آئین اور ولایت مطلقہ فقیہ کے نتیجے میں حاصل اختیارات کے مطابق رہبر انقلاب اسلامی خارجہ پالیسی اور فیصلوں میں اصل کردار کے حامل ہیں[۲]۔ آیت اللہ خامنہ ای نے اپنی قیادت کے دور کے آغاز سے ہی امام خمینی کے مد نظر خارجہ پالیسی کے راستے پر قدم بڑھانے کے ساتھ ساتھ اسلامی جمہوریہ ایران کی خارجہ پالیسی کو بین الاقوامی حالات اور ایران کی حیثیت اور مقام و مرتبہ کے مطابق تیار کیا ہے؛

۱۔ نہ شرقی نہ غربی کا اصول

یہ سیاسی اصول اسلامی جمہوریہ ایران کی خارجہ پالیسی کی بنیاد ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں یہ ایک اصول ہے نہ کہ سیاست، بلکہ اسلامی جمہوری نظام کی بنیاد[۳] اور اسلامی جمہوریہ ایران کی خارجہ پالیسی کی اساس ہے[۴]۔

۲۔ لبنان اور فلسطین کے عوام کی حمایت

---

۱. ملکی، عباس، تصمیم گیری در سیاست خارجی، ص ۳۹
۲. دہقانی فیروزآبادی، جلال، سیاست خارجی جمہوری اسلامی ایران، ص ۲۶۲
۳. حدیث، ج ۲، ص۸۷؛ راہبرد حماسہ و دریا، ص ۳۵
۴. ایضاً، ص ۴۹

رہبر انقلاب اسلامی دنیا کے کمزور اور مظلوم عوام کی حمایت کے اصول پر عمل درآمد کو بیان کرتے ہوئے اسے حیات طیبہ کی جانب حرکت کے لیے ایک اہم قدم قرار دیتے ہیں جو مؤمنین اور مستضعفین کی حاکمیت سے عملی شکل اختیار کرے گا۔ عصر حاضر میں مستضعفین اور مظلوموں کا ایک واضح مصداق فلسطین اور لبنان کے ستم رسیدہ عوام ہیں۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد امام خمینی نے ہمیشہ فلسطین اور لبنان کی قوموں کی اخلاقی اور عملی حمایت کی اور یہ پالیسی آیت اللہ خامنہ ای کی قیادت و رہبری کے دور میں بھی زیادہ قوت اور وسعت کے ساتھ جاری رہی ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای کے نقطۂ نظر کے مطابق وہ اسلام جس سے ابو جہل اور ابوسفیان نہ ڈریں، اسلام نہیں ہے[۱]۔ آیت اللہ خامنہ ای نے امام خمینی کی پہلی برسی کی مناسبت سے ۱۰ خرداد ۱۳۶۹ کو ملت ایران کو مخاطب کرتے ہوئے ایک پیغام جاری کیا جس کے ذریعے اسلامی جمہوری نظام کے مستقبل کے خطوط بھی وضع کیے اور ان کی وضاحت کی۔ اس پیغام میں اسلامی جمہوریہ ایران کی خارجہ پالیسی کے اصلی خطوط کا بھی اعلان کیا گیا۔ اس پیغام میں مسئلہ فلسطین کو سب سے بڑے اسلامی بین الاقوامی مسئلے کے طور پر پیش کیا گیا[۲]۔

آیت اللہ خامنہ ای نے صیہونی حکومت کے خلاف جہاد کی اخلاقی، سیاسی اور مالی حمایت اور اسی طرح براہ راست حمایت کو ایران کا ہدف و مقصد قرار دیا[۳]۔ لبنان کے مسئلے میں خاص طور پر لبنانیوں اور صیہونی حکومت کی ۳۳ روزہ جنگوں میں اس پالیسی پر عمل درآمد کیا گیا جس کے نتیجے میں لبنان اور فلسطین کی قوموں کو کامیابی حاصل ہوئی[۴]۔

۳۔ اسلامی بیداری کی حمایت

---

۱. بیانات، ۱۳۶۸/۱۱/۱۰
۲. سیمای اسلام ناب محمدی، ص ۳۳
۳. بیانات، ۱۳۶۹/۹/۴
۴. خطبہ ہا، ۱۳۹۰/۱۱/۱۴

آیت اللہ خامنہ ای کی فکر و سوچ میں اسلامی بیداری بہت قدیمی ہے۔ کتاب آینده در قلمرو اسلام کا ترجمہ اور اشاعت ۱۳۴۵ ش. میں، اور کتاب ادعا نامہ ای علیہ تمدن غرب ۱۳۴۹ ش. میں (یہ دونوں کتابیں سید قطب کی ہیں) اس دعوے کا عینی مصداق ہیں۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد کے دور میں خصوصاً قیادت و رہبری کے دور میں انہوں نے اس پر اسلامی جمہوریہ ایران کی خارجہ پالیسی میں اصلی دعوت کے تناظر میں عمل کیا۔ انہوں نے ۲۰ بہمن ۱۳۶۸ ش. کو اسلامی بیداری کی کھل کر حمایت کی اور مسلمانوں کو اسلامی زندگی کی طرف بازگشت اور واپسی کی نوید دی (خطبہ ہا)۔ اسلامی بیداری نے تین اصولوں اسلام کی طرف بازگشت، عالم اسلام میں اتحاد اور سامراج دشمنی کی بنیاد پر نئی شکل اختیار کی[۱]۔ اسلامی بیداری میں استبداد اور استعمار مخالف حریت پسند تحریکوں کے لیے نمونہ پیش کرنا قیادت و رہبری کے دور میں آیت اللہ خامنہ ای کے جملہ اقدامات میں شامل ہے۔ انہوں نے سال ۱۳۹۰ ش. کے ابتدائی دنوں میں اور علاقے کے بعض ممالک میں عوامی تحریکیں شروع ہونے کے بعد اسلامی اہداف کی سمت اسلام کے نعرے کے ساتھ امت اسلامی اور قوموں کی بیداری کو قوموں کی عام بیداری کی علامت قرار دیا[۲]۔

رہبر انقلاب اسلامی عالم اسلام میں اسلامی بیداری شروع ہونے کو ایران کے اسلامی انقلاب اور ملت ایران کی کامیابی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ وہ امام خمینی کو اسلامی بیداری کا مظہر قرار دیتے ہیں اور اس سلسلے میں امام خمینی کی منطق کو عقل کی منطق کہتے ہیں[۳]۔ آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں اسلامی بیداری کی سوچ کی اور خصوصیت اس کا اسلامی آئیڈیل ازم اور امنگوں کا خطِ اعتدال پر ہونا ہے۔[۴] وہ حتی غیر مسلمان قوموں میں بھی بیداری پیدا ہونے کو یقینی سمجھتے ہیں (بیانات، ۱۳۶۸/۶/۲۲)۔ انہوں نے "قوموں کی بیداری" (بیانات، ۱۳۶۸/۶/۲۲)، "عوام کی بیداری" (بیانات، ۱۳۶۹/۱/۲)، "مظلوم قوموں کی بیداری" (بیانات، ۱۳۶۸/۱۱/۱۹)، "انقلابی بیداری" (بیانات، ۱۳۶۸/۴/۱۴)، "معنوی بیداری" (بیانات،

---

۱. بیانات، ۱۳۸۲/۲/۲۲، ۱۳۸۹/۱۲/۲

۲. بیانات، ۱۳۹۰/۱/۱

۳. ایضاً، ۱۳۸۴/۶/۱۱

۴. صوفی نیارکی، تقی، بیداری اسلامی ہویت تمدنی و چالشای پیش رو در اندیشہ ہای حضرت امام خمینی و رہبر معظم انقلاب حضرت آیت اللہ خامنہ ای، ص ۱۸۵، ۱۸۴

۱۳۷۰/۷/۱۷)، "ایمان کی بیداری" (بیانات، ۱۳۷۲/۱۱/۱۷)، اور "عالمی بیداری" (بیانات، ۱۳۷۷/۸/۱۲) جیسی معرکۃ الآرا اصطلاحات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بیداری یورپ کے قلب تک آگے جائے گی۔ ایک اور مقام پر وہ قرآن کی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے اسلامی بیداری کو امت اسلامی کی علم و آگہی پر مبنی مزاحمت و استقامت کے نتیجے میں الٰہی مدد و نصرت کا وعدہ پورا ہونا قرار دیتے ہیں[۱]۔ رہبر انقلاب اسلامی مشرق وسطیٰ اور عالم اسلام کے عوام کی بیداری کے اسلامی تشخص کا جائزہ لیتے ہوئے ان عوام کی جانب سے جمہوریت کی خواہش کو اس کا مضبوط اور مرکزی نقطہ قرار دیتے ہیں جو اسلام کے مطابق زندگی گزارتے اور سوچتے ہیں[۲]۔ انہوں نے بیداری کی عمومی طور پر اور اسلامی بیداری کی خصوصی طور پر اندرونی اور بیرونی مشکلات اور نقصانات کو بیان کیا۔ انہوں نے اسلامی بیداری کی تقویت اور اسے مضبوط بنانے کے لیے جو اقدامات تجویز کیے وہ خدا پر توکل اور اس پر اعتماد؛ میدان میں آمادگی، غفلت اور غرور کے نہ ہونے، انقلاب کے اصول کو یاد رکھنے، مذہبی، نسلی، قبائلی اور سرحدی اختلافات سے پرہیز، نظام کو بنانے اور نوجوان نسل پر اعتماد کرنے سے عبارت ہیں[۳]۔

۴۔ عزت، حکمت اور مصلحت

آیت اللہ خامنہ ای کا یہ خیال ہے کہ عزت، حکمت اور مصلحت ہمارے بین الاقوامی رابطوں اور تعلقات کے لیے ایک ضروری مثلث ہے[۴]۔ دین اسلام ایک عقلانی دین ہے اور ہمیں خارجہ پالیسی میں حکیمانہ اور مدبرانہ انداز میں عزت کے موقف کے ساتھ حرکت کرنی چاہیے[۵]۔ عزت کا معنی و مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظام اور معاشرہ اپنے بین الاقوامی تعلقات میں اس طرح کا برتاؤ نہ کرے جو اسلام اور مسلمانوں کی ذلت و

---

۱. معتمد رضایی، مہدی ، فرہنگی انقلاب اسلامی، ص ۶۱-۷۰
۲. مرادی، عبداللہ، گفتمانی از ہویت و مؤلفہ ہای بیداری اسلامی بر مبنای بیانات مقام معظم رہبری ، ص ۷۶
۳. یوسفی، بتول، پژوہشی پیرامون مبانی نظری بیداری اسلامی در قرن اخیر با تأکید بر اندیشہ ہای حضرت آیت اللہ العظمی سید علی خامنہ ای رہبر معظم انقلاب اسلامی، ص ۱۹۱- ۲۲۷
۴. منشور دولت اسلامی، ص ۱۸۹
۵. راہبر دہا، ص ۴۶

رسوائی کا باعث بنے۔ حکمت کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ اسلامی نظام کو حکیمانہ انداز میں اور جذبات و احساسات سے ہٹ کر کام کرنا چاہیے[۱]۔

۵۔ انقلابی ڈپلومیسی

خارجہ پالیسی پر عمل درآمد اور اسے آگے بڑھانے کا ایک ذریعہ ڈپلومیسی ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں اسلامی جمہوریہ ایران کی ڈپلومیسی انقلابی ہونی چاہیے اور ڈپلومیسی میں انقلاب پسندی یہ ہے کہ ہم اسلامی اور انقلابی مواقف کو ٹھوس طریقے سے، بغیر کسی رو رعایت اور لحاظ کے اور مرعوب ہوئے بغیر باقی رکھیں۔ ڈپلومیسی ایک جنگ ہے۔ تمام سفارت کار جنگ میں مصروف ہیں اور اس جنگ کا اثر اور اس کی اہمیت بعض اوقات فوجی جنگ سے بھی زیادہ ہے[۲]۔ ڈپلومیسی کے میدان میں ایران کے مواقف کو واضح طور پر بیان کرنا چاہیے[۳]۔ ڈپلومیسی سیاسی نظام کی طاقت و قدرت کا ایک کامیاب وسیلہ اور ملک کی مشکلات اور مسائل کے حل کا توانا بازو ہے۔ اس ڈپلومیسی کو اسلامی نظام کی امنگوں کے راستے پر ہونا چاہیے[۴]۔ اس کے مقابل وہ دفاعی ڈپلومیسی کو ڈپلومیسی کی بدترین قسم قرار دیتے ہیں کہ اسلامی جمہوریہ ایران کی ڈپلومیسی کو اس سے سخت پرہیز کرنا چاہیے[۵]۔

خارجہ پالیسی میں آیت اللہ خامنہ ای کے پیش نظر دیگر محوروں میں سے کوالٹی ڈپلومیسی کے فروغ، حکومت کے ساتھ تعلقات کے ساتھ ہی ساتھ قوموں کے ساتھ تعلقات کے فروغ، افریقہ کے ساتھ تعلقات خاص طور پر اقتصادی تعلقات میں توسیع، کشیدگی کے خاتمے خارجہ پالیسی میں تنظیم سازی، جیسے علاقائی تعاون کی تنظیموں کی تشکیل، قومی مفادات کی بنیاد پر ترجیحات میں تبدیلی، دنیا میں اسلامی مواقف

---

۱. منشور دولت اسلامی، ص ۱۸۳
۲. حدیث، ج ۲، ص ۷۲- ۷۴
۳. بیانات، ج ۵/۲، ص ۱۳۷۴
۴. راہبر دہا، ص ۸۸- ۸۹
۵. بیانات، ۱۳۷۹/۵/۲۵

کے اعلان، سامراج کے مقابلے میں کمزوری اور نرمی سے پرہیز، خطرات کو سنجیدگی سے لینے اور واقعات کا ہوشیاری سے مشاہدہ کرنے اور جائزہ لینے کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے[۱]۔

۶۔ امریکہ کے ساتھ تعلقات

آیت اللہ خامنہ ای کی قیادت و رہبری کے دور میں خارجہ پالیسی میں ایک اہم موضوع امریکہ کے ساتھ تعلقات اور رابطہ رہا ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای نے رہبر انقلاب اسلامی منتخب ہونے کے بعد ابتدائی مہینوں میں واضح طور پر اعلان کیا کہ جب تک امریکہ اسلامی جمہوریہ ایران کے ساتھ دشمنی، ظلم اور زور و زبردستی کی پالیسیاں جاری رکھے گا اور ایران کے دشمنوں کی حمایت کرے گا اور اپنے غلط طریقوں کی اصلاح نہیں کرے گا، ہم اس کے ساتھ تعلقات برقرار نہیں کریں گے[۲]۔ ان کی نظر میں امریکی حکومت کے ساتھ تعلقات اور مذاکرات سے ملت ایران کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، کیونکہ ان کے قول و فعل میں سچائی اور صداقت نہیں ہے[۳]۔ ایران اور امریکہ کے تعلقات میں اہم ترین مسئلہ صہیونی حکومت کے ساتھ اس کے تعلقات ہیں اور جب تک اس حکومت کے خلاف جدوجہد جاری ہے، امریکہ کے ساتھ دو طرفہ اور مساوی تعلقات کی برقراری کا امکان نہیں ہے یا بہت سخت ہے[۴]۔ آیت اللہ خامنہ ای کا یہ خیال ہے کہ کسی بھی ایسے مسئلے میں امریکہ کے ساتھ مذاکرات کا جس میں اس حکومت نے اپنے لیے خصوصی مقام و مرتبہ اور مفاد پیش نظر رکھا ہے، کوئی فائدہ نہیں ہے، کیونکہ یہ سامراجی ملک ہے اور سر تسلیم خم نہیں کرے گا[۵]۔ رہبر انقلاب اسلامی اصولی طور پر مذاکرات کے قائل ہیں؛ لیکن مذاکرات میں ایک قدر مشترک تک پہنچنے کے لیے دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کو قبول کرنا چاہیے؛ ایک حد وسط موجود ہونی چاہیے؛ وہ مذاکرات کریں تاکہ اس حد وسط تک پہنچ سکیں۔ ان کی نظر میں مذاکرات مضبوط اور قوی موقف کے ساتھ ہونے چاہئیں۔ جو

---

۱. راہبر دہا، ص ۲۳، ۳۰، ۳۸، ۳۹، ۴۲، ۴۳، ۴۶، ۵۵، ۵۸، ۹۶

۲. بیانات، ۱۳۶۸/۵/۳۱؛ ۱۳۷۲/۸/۱۳

۳. خطبہ ہا، ۱۳۷۶/۱۰/۲۶

۴. بیانات، ۱۳۷۸/۸/۱۲

۵. ایضاً، ۱۳۸۰/۸/۸

لوگ دھونس اور دھمکی کے حالات میں مذاکرات کے بارے میں سوچتے ہیں، وہ اپنی کمزوری کا بلند آواز سے اعلان کرتے ہیں۔ یہ اقدام انتہائی غلط ہے[۱]۔

آیت اللہ خامنہ ای کو کبھی بھی امریکہ کے ساتھ مذاکرات کے بارے میں خوش فہمی نہیں تھی اور ان کا خیال تھا کہ ایران اور امریکہ کے اختلافات اسلامی جمہوری نظام اور اسلامی انقلاب کے بنیادی اور جوہری مسائل کے بارے میں ہیں اور امریکی حکومت نے کھلم کھلا اسلامی نظام، ہمارے عوام کے اسلامی ایمان اور اسلامی تشخص کی مخالفت کا اعلان کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام اس بات کا باعث بنا کہ یہ ملت اپنے موقف پر قائم اور ڈٹی رہی اور ان کے سامنے نہیں جھکی[۲]۔ رہبر انقلاب اسلامی کہتے ہیں کہ ہم نے ہر گز یہ کہا کہ ہم امریکہ کے ساتھ کبھی تعلق قائم نہیں کریں گے ۔اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم کسی ملک یا حکومت کے ساتھ ہمیشہ کے لئے تعلقات منقطع کرلیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس حکومت کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ اس کے ساتھ تعلقات ہمارے لیے نقصان دہ ہیں۔ انسان کسی بھی ملک کے ساتھ تعلقات کسی فائدے کے لیے قائم کرتا ہے۔ جس دن امریکہ کے ساتھ تعلقات مفید ہوئے تو جو پہلا شخص کہے گا کہ امریکہ کے ساتھ تعلقات قائم ہونے چاہیئں، خود میں ہوں[۳]۔ آیت اللہ خامنہ ای کا خیال ہے کہ گزشتہ تین عشروں کے امریکہ دوران اسلامی جمہوری نظام کے خلاف سازشوں کا مرکز رہا ہے۔ اس کے باوجود ان کی ماہیت کو ثابت کرنے کے لیے امریکی حکام کے ساتھ براہ راست مذاکرات پر آپ نے رضامندی ظاہر کی[۴]۔

۷۔ جوہری ہتھیار معاملہ

جوہری ہتھیار معاملے میں رہبر انقلاب اسلامی کی پالیسی، اسلامی جمہوریہ ایران کے برحق موقف پر اصرار اور تاکید ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای نے ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری اور استعمال کو حرام قرار دیتے ہوئے ہمیشہ عالمی ایٹمی ترک اسلحہ اور ایٹمی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے معاہدے (این پی ٹی) پر مکمل عمل درآمد پر زور

---

۱. ایضاً، ۱۳۸۰/۱۲/۲۷
۲. ایضاً، ۱۳۸۱/۲/۱۱
۳. بیانات، ۱۳۸۶/۱۰/۱۳
۴. ایضاً، ۱۳۹۲/۱/۱

دیا ہے[۱]۔ شجاعانہ نرمی اور لچک ایٹمی معاملے کے سلسلے میں رہبر انقلاب اسلامی کی تازہ ترین تعبیر ہے۔ وہ اس عبارت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شجاعانہ نرمی و لچک، مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہنرمندانہ مظاہرے کے معنی میں ہے؛ اس کا مطلب یہ ہے کہ راہ خدا کے سالک کو جب وہ مختلف اسلامی امنگوں اور آرزوؤں کی جانب قدم اٹھاتا ہے، تو جس شکل میں اور جس طرح بھی ہے، معینہ مطلوب اور مقصد تک پہنچنے کے لیے مختلف طریقوں سے استفادہ کرنا چاہیے[۲]۔ شجاعانہ نرمی اور لچک یعنی عزت، حکمت اور مصلحت نامی تین اصولوں کے تحت قدرت و طاقت اور لچک کے درمیان مظاہرے کی طاقت۔ رہبر انقلاب اسلامی نے مذاکرات کے دوران اس بات کی کوشش کی کہ ایران کے ایٹمی حقوق پر تاکید کے ساتھ ساتھ اسلامی جمہوریہ ایران کی سرخ لکیروں کو بھی وضع کریں۔ یہ وضع کردہ سرخ لکیریں نہ صرف ایٹمی مذاکراتی ٹیم کے لیے مشعل راہ میں تبدیل ہو گئیں بلکہ ایک حصار کی مانند تھیں جس نے مغربی فریقوں کو بھی ان موضوعات کے قریب آنے سے باز رکھا۔ رہبر معظم کا یہ طرز عمل اس بات کا باعث بنا کہ ایران کی مذاکراتی ٹیم پورے اطمینان کے ساتھ مذاکرات میں بھرپور اور فعال کردار ادا کرے۔

اقتصادی اصول و نظریات

آیت اللہ خامنہ ای ایسے حالات میں رہبر انقلاب اسلامی کے عہدے کے لیے منتخب ہوئے جب ملک ابھی مسلط کردہ جنگ سے پیدا ہونے والے سیاسی و اقتصادی بحرانوں سے باہر نہیں نکلا تھا اور اسے جنگ سے پیدا ہونے والی خرابیوں کی تعمیر نو اور بنیادی تنصیبات کی تعمیر کے لیے بنیادی اقدامات کی اشد ضرورت تھی۔ اس موقع پر ملک کی اقتصادی پالیسیوں کے بارے میں سیاسی شخصیات اور گروہوں کے درمیان موجود اختلاف نظر جو اسلامی انقلاب کی کامیابی کے پہلے عشرے سے شروع ہو گیا تھا، بدستور جاری تھا اور افراد اور گروہوں کے اقتصادی موقف اور نظریات دو طرح کے تھے: پہلا نظریہ حکومتی اقتصاد کے حامیوں کا تھا جس میں اقتصادی کفایت شعاری اور جنگ کے دور کی کنٹرول شدہ پالیسیوں پر بدستور زور دیا جاتا تھا۔ دوسرا نظریہ اقتصاد میں حکومتی عمل دخل کے مخالفین کا تھا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ حکومتی پالیسیوں پر انحصار اور بھروسہ

---

۱. پیامہا، ۱۳۸۹/۱/۲۸؛ بیانات، ۱۳۸۴/۱/۱

۲. بیانات، ۱۳۹۲/۸/۲۹

کرنے کا دور اور زمانہ ختم ہو گیا ہے اور نجی کاری کے ذریعے اور اقتصادی سرگرمیوں میں نجی شعبے کو شریک کرکے اور غیر ملکی سرمائے کو ملک میں لا کر اقتصادی ترقی حاصل کی جاسکتی ہے[1]۔

آیت اللہ خامنہ ای کے اقتصادی اصول اور ترجیحات

قیادت و رہبری کے دور میں آیت اللہ خامنہ ای کی اقتصادی سوچ ایک واضح اور ثابت اصول کی حامل رہی ہے۔ ان کا اقتصادی طرز عمل مجموعی طور پر اسلامی اصول و اقدار کو مد نظر رکھتے ہوئے اقتصادی انصاف کے ساتھ ملک کی ترقی و پیشرفت کی ضرورت پر استوار رہا ہے۔ انہوں نے اس بنیاد پر اس قسم کے محوروں پر تاکید کی ہے؛ ملک کی ترقی کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت، سماجی انصاف، محروم اور پسماندہ طبقات پر توجہ، اقتصادی بدعنوانیوں کا مقابلہ، فضول خرچی اور خود نمائی سے پرہیز، اسمگلنگ کی روک تھام، داخلی پیداوار میں اضافہ، زراعتی شعبے میں خود کفالت، صنعت اور روزگار کے شعبے کو مضبوط بنانا، غیر پٹرولیم اقتصاد، مالی اور اقتصادی نظم و ضبط، ٹیکسوں کی وصولی، قومی کرنسی کی قدر کو مضبوط بنانے کے لیے اقدامات، افراط زر اور مہنگائی کا مقابلہ، غیر ملکی سرمایہ کاری پر توجہ، تعمیر نو اور سرمایہ داری نظام کا تنقیدی جائزہ[2]۔

آیت اللہ خامنہ ای کی اقتصادی پالیسیاں

انتظامیہ کو نصیحت اور رہنمائی:

جن اصولوں اور محوروں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے وہ اہم اور اسٹریٹجک پروگراموں اور منصوبوں کی جامعیت پر منتج ہوئے ہیں جو گزشتہ چند برسوں کے دوران مختلف مواقع پر نظام کی بالادستی کی دستاویزات کے قالب میں ملک کی انتظامیہ کے حوالے کیے گئے ہیں۔ رہبر انقلاب اسلامی کی اقتصادی پالیسیوں پر نظری پالیسیوں اور عملی پالیسیوں کے قالب میں توجہ دی جاسکتی ہے۔ نظری پالیسیاں، تقریروں اور بیانات میں اور عملی پالیسیاں کلی پالیسیوں اور اقتصادی پالیسیوں کے باضابطہ حکمناموں میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ پالیسیاں حکومتوں کی مختلف اقتصادی پالیسیوں کے باوجود، ہر حکومت کے حالات اور خصوصیات کے مطابق تقریروں، پیغامات

---

۱. شادلو، عباس، تکثر گرایی در جریان اسلامی، ص ۱۵۸، ۱۵۹

۲. منشور، ص ۹۷، ۹۸

اور سرکاری حکمناموں میں مد نظر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے مذکورہ راستے سے پالیسیوں، منصوبوں اور کارکردگی میں بھٹکنے کی نصیحت اور یاددہانی کے ذریعے نشان دہی کی ہے۔ مثال کے طور پر جس دور میں تعمیر نو اور اقتصادی ترقی پر زور دیا جاتا تھا، وہ تعمیر نو کے ساتھ ساتھ انقلابی جذبے کے تحفظ، سماجی انصاف، تجملات، مادیت پسندی اور فضول خرچی سے پرہیز پر زور دیتے تھے[1]۔ اسی طرح جس دور میں حکومت کی ترجیحات میں اقتصادی مسائل سے زیادہ سیاسی مسائل شامل تھے، وہ اقتصادی پالیسیاں پیش کر کے، روزگار، قومی کرنسی کی قدر کے تحفظ اور افراط زر اور اقتصادی بد عنوانیوں کا مقابلہ کرنے سمیت مشکلات و مسائل کو ختم کرنے کے لیے صحیح اقتصادی منصوبہ بندی کی جانب حکومت کی رہنمائی کرتے تھے[2]۔ نویں اور دسویں حکومتوں میں جب سماجی انصاف کے فروغ کا نعرہ لگایا گیا، انہوں نے عجلت سے پرہیز کرنے، صحیح منصوبہ بندی کرنے اور حکومت کے اپنے اہداف کو حاصل کرنے کے لیے ترقی و پیشرفت کے ایرانی ـ اسلامی نمونے پر توجہ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ مجموعی طور پر سماجی انصاف، کمزور اور پسماندہ طبقات پر توجہ، فضول خرچی سے پرہیز اور بچت و کفایت شعاری کی ضرورت، اقتصادی بدعنوانی کا مقابلہ اور ملک کی ترقی و پیشرفت کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت جیسے مسائل مختلف ادوار میں ان کے لیے باعث تشویش رہے ہیں اور انہوں نے ان کے حل کی ضرورت پر ہمیشہ زور دیا ہے۔

آیت اللہ خامنہ ای ملک کے مختلف شہروں میں مختلف مسائل سے آشنائی اور ان کا جائزہ لینے پر زور دیتے تھے اور اسی بنا پر اپنی قیادت کے عرصے میں انہوں نے ملک کے تمام صوبوں کا دورہ کیا ہے جن کے نتیجے میں اقتصادی مشکلات سمیت ملک کے مختلف صوبوں کے مسائل دور کرنے کے لیے فیصلے کیے گئے اور منصوبے بنائے گئے۔

آیت اللہ خامنہ ای کے اقتصادی نظریات کا سرچشمہ دینی نقطہ نظر ہے، اس کے علاوہ یہ اسلامی انقلاب کے اہداف و مقاصد اور اقدار خاص طور پر امام خمینی کی جانب سے پیش کی گئی ترجیحات پر استوار ہیں۔ ان میں سے ان نکات کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے:

---

۱. حدیث، ج ۷، ص۱۶۸، ۱۷۱

۲. بیانات، ۱۳۷۸/۶/۲

کمزور طبقات کی حمایت، عوام اور حکام میں فضول خرچی اور اسراف سے پرہیز اور سماجی انصاف پر توجہ دینے کی ضرورت، اقتصادی خود مختاری، ملک کی تعمیر نو اور ترقی و پیشرفت میں تیزی پر تاکید، اسلامی انقلاب کے ابتدائی اور اولین مقاصد اور امام خمینی کی تعلیمات کی جانب حرکت، ملک کے امور میں منصوبہ بندی کی ضرورت پر بھرپور تاکید، مختلف مسائل خاص طور پر اقتصادی شعبے میں عارضی اور عجلت پر مبنی فیصلے کرنے سے پرہیز، اسی طرح انہوں نے ہمیشہ قومی تشخص اور دینی تعلیمات کے ساتھ اقتصادی پالیسیوں کی ہم آہنگی کی ضرورت پر اس حد تک تاکید کی ہے کہ اخلاق اور معنویات پر توجہ دیے بغیر مادی ترقی کے معنی میں اقتصادی ترقی کو کم اہمیت قرار دیا ہے۔

غیر معمولی اور بالادستی کی دستاویزات کے لیے دائرہ کار کا تعین

نظام کی بالادستی کی دستاویزات کے عنوان سے ملک کے درمیانی مدت اور طویل مدت کے غیر معمولی اہم منصوبوں کے خاکے کو جو ملک کی اقتصادی صورت حال کی اصلاح اور اسے بہتر بنانے کے لیے تدوین کئے گئے ہیں، انھیں رہبر انقلاب اسلامی نے معین کیا ہے۔ وہ غیر معمولی اور اہم ترین منصوبے کچھ اس طرح ہیں:

ملک کے پنج سالہ ترقیاتی منصوبے، مختلف شعبوں میں اسلامی جمہوری نظام کی مجموعی پالیسیاں، اقتصادی بدعنوانی کا مقابلہ کرنے کا آٹھ نکات پر مشتمل فرمان، ملک کا بیس سالہ فکری و عملی منصوبہ بندی، آئین کے آرٹیکل ۴۴ کی مجموعی پالیسیاں، ترقی و پیشرفت، انصاف اور استقامتی اقتصاد کے عشرے کی تفصیلات کا اعلان۔

آیت اللہ خامنہ ای کے مد نظر اقتصادی پالیسیوں میں سے ان موارد کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے:

پسماندہ طبقات کی مدد کرنا اور سماجی انصاف کے قریب پہنچنا؛ اقتصادی رونق اور ترقی اور سماجی انصاف کے مقدمہ اور پیش خیمہ کے عنوان سے تعمیر نو کی کوشش[1]؛ قومی پیداواری صلاحیت کو بہتر بنانا؛ تیل کے اقتصاد پر انحصار کو کم کرنے کے لیے غیر پٹرولیم اشیاء کی برآمدات میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا؛ معاشرے کی غذائی اور خوراک کی ضروریات کے لیے دوسروں سے بے نیازی اور زراعت جیسی بنیادی اور

---

۱. دوسرے پروگرام میں حکومت اور نظام کی پالیسیوں کا دائرہ کار معین کرنے کے لیے حجت الاسلام والمسلمین ہاشمی رفسنجانی کے نام خط، ۱۳۷۲/۸/۱۸

مرکزی پالیسیوں کا انتخاب؛ ملک کی جغرافیائی اور فطری صلاحیتوں، استعداد اور گنجائش کے پیش نظر روزگار کے مواقع پیدا کرنا، جائز سرمایہ کاری کے لیے مکمل تحفظ فراہم کرنا؛ بدعنوانی، رشوت خوری، اجارہ داری اور حرام دولت کو وجود میں آنے سے روکنا[۱]؛ حق اور انصاف کے محور پر افراد کی رشد و نمو کے مقصد سے ایرانی ـ اسلامی ترقی کے نمونے کی تدوین، اسلامی اور انقلابی اقدار کی بنیاد پر معاشرے کی تشکیل اور ریاست کے تینوں ستونوں یعنی مجریہ، مقنّنہ اور عدلیہ کے ذریعے اقتصادی اور سماجی انصاف کے اصولوں پر عمل درآمد[۲] عوامی فلاح و بہبود کا قیام، اقتصادی رونق اور ترقی، اقتصادی انصاف کے لیے راستہ ہموار کرنا اور ملک میں غربت کا خاتمہ؛ عام حالات میں حکومتی، کارپوریٹ اور نجی شعبوں کے لیے اقتصادی سرگرمیوں کے یکساں اور منصفانہ حالات، استعمال کو مفید اور مؤثر بنانا، خام تیل اور قدرتی گیس کے بجائے تیل و گیس اور پیٹرو کیمیکل کی مصنوعات کی برآمدات؛ ملک کے توانائی کے ذرائع میں تنوع اور ایٹمی علم اور ٹیکنالوجی حاصل کرنے کے لیے کوشش اور ایٹمی بجلی گھر قائم کرنا (ریاست کے تینوں اداروں کے سربراہوں کے نام خط اور نظام اور حکومت کی مجموعی پالیسیوں کا ابلاغ (۱۳۷۹/۱/۲۰)؛ اقتصادی بدعنوانیوں کا مقابلہ کرنا، آٹھ نکاتی حکم نامہ کی صورت میں حکومتی وسائل کا غلط استعمال کرنے والوں اور بدعنوان افراد کا مقابلہ کرنا؛ قابل اعتماد، صحیح اور امین افراد کو کام سپرد کرنا؛ حکومت کی اہم اقتصادی سرگرمیوں اور کاموں میں کمزور نکات کی نشان دہی؛ آٹھ نکاتی حکم نامہ کی صورت میں بدعنوانی کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں ہر قسم کے ظاہری پروپیگنڈے اور کھوکھلے نعروں کا عدم استعمال اور امتیاز اور تفریق سے کام نہ لینا[۳]؛ ۱۴۰۴ ش. کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلامی جمہوریہ ایران کے بیس سالہ فکری و عملی منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگرام کی تدوین کی ضرورت پر تاکید اور ۱۳آبان ۱۳۸۲ کو اس بارے میں تدوین شدہ پروگرام تینوں اداروں کے سربراہوں کو ارسال کرنا[۴]؛ آئین کے آرٹیکل ۴۴ کی مجموعی پالیسیوں کا ابلاغ۔

اس ابلاغی پیغام کی مرکزی اور بنیادی پالیسیاں درج ذیل تھیں:

۱. حکومتی تجاویز کا جائزہ لینے کے لیے تشخیص مصلحت نظام کے سربراہ کے نام پیغام، ۱۳۷۸/۱/۱۹
۲. بیانات، ۱۳۶۸/۵/۳۱؛ ۱۳۷۲/۸/۱۳
۳. تینوں اداروں کے سربراہوں کے نام خط، ۱۳۸۰/۲/۱۰
۴. ابلاغ سند چشم انداز بیست سالہ، ۱۳۸۲/۸/۱۳

قومی اقتصادی ترقی میں تیزی لانا، سماجی انصاف کے قیام کے لیے عوام کی سطح پر ملکیت کو فروغ دینا؛ اقتصادی اداروں کی افادیت میں اضافہ کرنا؛ ٹیکنالوجیکل، انسانی اور مادی ذرائع اور وسائل سے فائدہ اٹھانا، ملکی اقتصاد میں مقابلے کی فضا کو بڑھانا؛ اقتصادی سرگرمیوں اور کاموں کو انجام دینے اور ان کی ذمہ داری سنبھالنے میں حکومتی انتظام اور مالی بوجھ کو کم کرنا؛ روزگار کے مواقع میں اضافہ کرنا؛ عوام کے طبقات کو بچت، سرمایہ کاری اور گھرانوں کی آمدنی میں اضافے کی ترغیب دلانا[1]۔

ان اقدامات میں سے جو مختلف سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی میدانوں میں سالانہ پالیسی سازی میں شمار ہوتے ہیں، ایک اقدام ملکی ضرورت کی ترجیحات کی بنیاد پر ہر سال کو ایک نام دینا ہے۔ سال کے نام کا اعلان ہر سال کی ابتدا میں رہبر انقلاب اسلامی کے نوروز کے پیغام میں کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ خود چھوٹی اور بڑی سطح پر منصوبہ بندی کے لیے عوام اور حکام کے ذہنوں کو تیار کرنے کے مقصد سے ملک کے مسائل اور ترجیحات کو بیان کرنا ہے۔ اہم ترین اقتصادی مسائل کہ جو ان برسوں کے دوران رہبر انقلاب اسلامی کے نوروز کے پیغامات میں ان کے مد نظر رہے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

فضول خرچی اور بے جا استعمال سے گریز (۱۳۷۱ھ ش)؛

فضول خرچی سے مقابلہ کرنا (۱۳۷۵ھ ش)؛

اسراف اور فضول خرچی سے گریز (۱۳۷۶ھ ش)؛

عوامی اور حکومتی سطح پر بچت کی ضرورت (۱۳۷۷ھ ش)؛

عوام پر اقتصادی دباؤ اور مہنگائی ختم کرنے کی ضرورت (۱۳۷۸ھ ش)؛

عوام کی معاشی مشکلات کو حل کرنے کی ضرورت (۱۳۷۹ھ ش)؛

روزگار کے لیے منصوبہ بندی (۱۳۸۰ھ ش)؛

روزگار کے مواقع پیدا کرنا اور بدعنوانی کا مقابلہ کرنا (۱۳۸۱ھ ش)؛

اقتصادی اور مالی نظم وضبط (۱۳۸۴ھ ش)؛

فلاح و بہبود کے حامل ایک معاشرے کی تعمیر کے لیے منصوبہ بندی (۱۳۸۶ھ ش)؛

---

۱. آئین کے آرٹیکل ۴۴ کی مجموعی پالیسیوں کا ابلاغ، ۱۳۸۴/۲/۲

استعمال کے نمونے کی اصلاح (۱۳۸۸ھ ش)؛
زیادہ کوشش زیادہ کام (۱۳۸۹ھ ش)؛
اقتصادی جہاد (۱۳۹۰ھ ش)؛
قومی پیداوار، ایرانی کام اور سرمائے کی حمایت (۱۳۹۱ھ ش)؛
سیاسی کارنامہ اور اقتصادی کارنامہ (۱۳۹۲ھ ش)۔[۱]

اسی طرح ایک اہم ترین اقتصادی مسئلہ جس کا ۱۳۹۱ھ ش میں نظام اور حکومت کو سامنا کرنا پڑا، ایٹمی پروگرام کے سلسلے میں اسلامی جمہوریہ ایران پر دباؤ ڈالنے کے لیے مغربی ملکوں خصوصا امریکہ کی جانب سے اقتصادی پابندیوں میں اضافہ تھا۔ اس درمیان، آیت اللہ خامنہ ای نے ترقی و پیشرفت کی جانب ملک کی معمول کی حرکت کے ساتھ ساتھ ان پابندیوں سے پیدا ہونے والے دباؤ کو کم کرنے کے لیے جس راہ حل کا اعلان کیا وہ "پائیدار استقامتی اقتصاد" کی پالیسی تھی۔ وہ اپنے ارد گرد حصار کھینچنے اور دفاعی کام انجام دینے کو استقامتی اقتصاد نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ اس کو ایسا اقتصاد سمجھتے ہیں جو سخت دشمنی، بائیکاٹ اور دباؤ کے حالات میں ملک کی ترقی و پیشرفت کا ضامن ہے[۲]۔

اس بنا پر انہوں نے استقامتی اقتصاد کو ملک کی ترقی و پیشرفت کے عمل کو جاری رکھنے کا واحد راستہ قرار دیا۔ اس پالیسی کی بعض نمایاں خصوصیات کچھ اس طرح ہیں؛ حکومتی اور غیر حکومتی شعبوں کی تمام تر صلاحیتوں اور گنجائش سے استفادہ کرنا، عوام کی معاشی مشکلات اور مسائل حل کرنے کے لیے سنجیدہ کوشش کرنا، اقتصادی بدعنوانیوں کا مقابلہ کرنا، قومی پیداوار کی حمایت اور فضول خرچی کا مقابلہ کرنا[۳]۔

ایک اہم موضوع جس کو آیت اللہ خامنہ ای نے بیان کیا ہے اور اس کی تشریح کی ہے، طرز زندگی ہے۔ انہوں نے طرز زندگی کو اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق اور اسلامی تمدن کے احیاء کے تناظر میں بیان کیا۔ ان

---

۱. پایگاہ، بش۔
۲. بیانات، ۱۳۹۱/۵/۱۶
۳. ایضاً، ۱۳۹۲/۶/۲

کی نظر میں ایک ایرانی مسلمان انسان کی زندگی کو اعلیٰ انسانی خصوصیات اور خصلتیں پیدا کرنی چاہئے تاکہ دلوں کا خدا کے ساتھ رابطہ برقرار ہو اور وہ باقی رہے[۱]۔

ثقافت

آیت اللہ خامنہ ای نے ملک کی ایک اہم ثقافتی شخصیت کی حیثیت سے ثقافت کو ہمیشہ ملک کے بنیادی ترین مسائل میں سے قرار دیا ہے[۲] اور عوام اور حکام کو ثقافتی خود مختاری کا تحفظ کرنے کے لیے جس کی حفاظت خود مختاری کے تمام پہلوؤں سے زیادہ سخت اور مشکل ہے، ہوشیاری اور تدبر سے کام لینے کی ہدایت کی[۳]۔ رہبر انقلاب اسلامی کا خیال ہے کہ کسی قوم وملت کے قومی اعتقادات اور ثقافت، اس کے تشخص، رشد و ترقی اور حیات کے اصلی عوامل ہیں اور ان پر بھروسہ کرکے ترقی وپیشرفت کے راستے پر قدم بڑھایا جا سکتا ہے۔ اسی بناپر پوری تاریخ کے دوران استعمار نے قوموں پر غلبہ اور قابو پانے کے لیے ان کی ثقافتی بنیادوں کو ختم کرنے کی کوشش کی[۴]۔

ثقافتی انقلاب، ثقافتی تبدیلی اور دینی ثقافت کی جانب بازگشت جیسے مفاہیم رہبر انقلاب اسلامی کے بیانات میں بار بار بیان کیے گئے ہیں اور انہوں نے ہمیشہ ثقافتی یلغار، نرم جنگ یا سافٹ وار، ثقافتی نیٹو، ثقافتی شب خون جو اسلامی انقلاب کی ثقافت پر دشمن کا ثقافتی وار ہے، کے بارے میں خبردار کیا ہے۔ مسلط کردہ جنگ کے دوران فوجی محاذوں پر اسلامی جمہوریہ نظام کے دشمنوں کی ناکامی کے پیش نظر، جنگ ختم ہونے کے بعد کے برسوں میں نرم جنگ یا سافٹ وار اور ثقافتی یلغار، اسلامی انقلاب کا مقابلہ کرنے کے لیے اصلی حکمت عملی میں تبدیل ہو گئی اور آیت اللہ خامنہ ای نے اس کی وسعت اور اہمیت کو بتانے کے لیے اس کو ثقافتی شب خون اور ثقافتی نیٹو کے نام سے یاد کیا۔ آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں ثقافت اور ثقافتی مسائل اقتصادی، صنعتی اور زراعتی مسائل سے زیادہ اہم ہیں؛ کیونکہ یہ سب ثقافتی مسائل کے بارے میں اہتمام اور کوشش

---

۱. ایضاً، ۱۳۹۲/۲/۱۸
۲. ایضاً، ۱۳۷۹/۱۲/۹
۳. ایضاً، ۱۳۷۰/۹/۲۰
۴. بیانات، ۱۳۷۱/۵/۲۱

کے بغیر ناکام رہ جاتے ہیں[۱] اور ثقافت کا معاشرے کے تمام امور کی رشد و ترقی میں اہم کردار اور اثر ہے[۲]۔ آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں کسی قوم و ملت کی آزادی و خود مختاری، ثقافتی خود مختاری کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی[۳]، کیونکہ طاقتوں کا حقیقی تسلط، ثقافتی تسلط ہے[۴]۔

ثقافت کے میدان میں رہبر انقلاب اسلامی کے نظریات اور اقدامات کچھ اس طرح ہیں:

الف: اسلامی معاشرے کو نشانہ بنانے والے ثقافتی خطرات اور نقصانات کے بارے میں رہنما ارشادات اور مواقف کی وضاحت۔ انہوں نے حالات کے مطابق ان خطرات کو "ثقافتی یلغار"، "ثقافتی شب خون"، "ثقافتی لوٹ مار"، "ثقافتی نیٹو"، اور "نرم خطرہ" جیسے مختلف عناوین سے یاد کیا ہے اور ہر ایک کی بھرپور طریقے سے وضاحت کی ہے۔

ب: موجودہ صورت حال کے بارے میں جو ثقافتی خطرات اور نقصانات سے غفلت یا عدم توجہ کی وجہ سے پیش آئی ہے، رہنما ارشادات اور مواقف کی وضاحت۔ انہوں نے اس بارے میں "مغرب نوازی"، "مغرب پسندی"، "نمود و نمائش"، "کنزیومرازم"، "ثقافت کی تبدیلی" اور "ثقافتی جمود" جیسے الفاظ وقت اور زمانے کے مطابق استعمال کیے اور ان کی وضاحت کی ہے۔

ج: نامناسب ثقافتی صورت حال سے باہر نکلنے اور ایک حقیقی اسلامی معاشرے سے مطابقت رکھنے والے اور ایک مناسب نمونہ عمل تک پہنچنے کے لیے معاشرے کی ثقافتی منصوبہ بندی اور انتظام کے بارے میں ان کے رہنما ارشادات اور مواقف کی وضاحت۔ اس سلسلے میں بھی انہوں نے "ثقافتی حکمت عملی"، "ترقی و پیشرفت کا ایرانی۔اسلامی نمونہ" اور "طرز زندگی" جیسی اصطلاحات استعمال کیں اور ان پر عمل درآمد کے لیے کوشش کی گئی ہے[۵]۔

---

۱. فرہنگ؛ مسائل...، ص ۲۳
۲. حدیث، ج ۲، ص ۴۱
۳. ایضاً، ج ۳، ص ۶۱
۴. ایضاً، ج ۴، ص ۵۱، ۵۰
۵. پایگاہ، بش

آیت اللہ خامنہ ای نے کتاب اور کتاب خوانی یعنی مطالعہ پر بھی بہت زیادہ توجہ دی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کتابوں کی نمائشوں کے بھی دورے کیے جن کے دوران انہوں نے کتابوں کا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور ان کے بارے میں سوال جواب بھی کیے حتی بعض کتابوں پر یادداشت بھی تحریر کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ثقافتی و مذہبی مقامات کے بھی دورے کیے۔ شعراء، مصنفین، ثقافتی شخصیات اور اداروں، اہل قلم حضرات، میڈیا کی شخصیات، فلم سازوں، آرٹسٹوں، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا، دینی علوم کے طلبا، دینی مدارس اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ سے بھی مسلسل ملاقاتیں کیں۔ یہ چیزیں ثقافت پر ان کی سنجیدہ توجہ کی عکاسی کرتی ہیں۔

فن و ہنر

آیت اللہ خامنہ ای فن و ہنر کو انسانی جان کا قابل فخر اور اہم ترین حصہ[۱] اور مفاہیم کو منتقل کرنے کے لیے ایک بہترین وسیلہ سمجھتے ہیں[۲]۔ وہ فن و ہنر کو عطیۂ الٰہی، اسلام اور انقلاب کی خدمت کے لیے ایک بہترین اور مؤثر زبان اور عوام کے افکار کو بلند کرنے کے لیے ایک اہم اور مؤثر ذریعہ قرار دیتے ہیں اور فنکاروں کو نصیحت اور ہدایت کرتے ہیں کہ وہ فن و ہنر کو اس کی اعلیٰ و ارفع خصوصیات کے ساتھ عوام میں لے کر جائیں اور ان کے قلب و ذہن میں راسخ کریں اور اغیار کی ثقافت کے نقصان دہ مظاہر کے ساتھ اس کو مخلوط ہونے سے بچائیں[۳]۔ ان کا یہ خیال ہے کہ فنکار اور ہنر مند حقیقت کو دوسروں سے بہتر اور جلدی سمجھ لیتا ہے اور ہمارے ملک میں حقیقی فن و ہنر کا اہم اور اعلیٰ مقام ہے اور وہ صحیح فکر و سوچ، انقلابی سوچ اور توحیدی فکر و سوچ کو معاشرے کی فضا میں رائج اور اسے مضبوط اور گہرا کر سکتا ہے[۴]۔ انقلاب اس وقت خود کو فن و ہنر کے قالب میں ڈھال سکتا ہے جب اس کے اپنے ہنر مند اور فنکار ہوں۔ ان کی نظر میں اسلام فن و ہنر

---

۱. بیانات، ۱۳۸۰/۵/۱
۲. ایضاً، ۱۳۷۰/۸/۱
۳. حدیث، ج ۱، ص ۲۹۰
۴. ایضاً، ۳۱۳/۲-۳۱۵

سے شروع ہوتا ہے اور قرآن ایک مافوق بشر فن پارہ ہے[۱]۔ رہبر انقلاب اسلامی صحیح فن و ہنر کی وضاحت کرتے ہوئے ہنر برائے ہنر کو رد کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ فن و ہنر کا ہدف و مقصد ہونا چاہیے۔ اس بنیاد پر وہ ایران کے اسلامی جمہوری نظام میں اسلام اور اسلامی انقلاب کے اعلیٰ اقدار اور مقدسات کی عکاسی اور وضاحت کو فن و ہنر کا ہدف و مقصد قرار دیتے ہیں[۲]۔ فن و ہنر کی ایک خصوصیت بیان کرتے ہوئے اسے انسان کے نفیس اور ظریف خیالات کی عکاسی اور طاقت قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: اگر فن و ہنر نہ ہوتا تو انسان کا بہت سا مافی الضمیر بغیر بیان کیے ہوئے رہ جاتا[۳]۔

آیت اللہ خامنہ ای فن و ہنر کی زبان کو علم اور وعظ و نصیحت کی زبان سے زیادہ آسان اور عام فہم سمجھتے ہیں اور قرآن کے ہنری ہونے کو اس کی کامیابی کا ایک راز سمجھتے ہیں[۴]۔ وہ اس ہنر کو دینی ہنر قرار دیتے ہیں ان تعلیمات کو جن کو انسانوں کے درمیان پھیلانے کے لیے تمام الٰہی ادیان خاص طور پر دین اسلام نے کوشش کی ہے، پھیلا سکے اور ذہنوں میں زندہ اور باقی رکھ سکے۔ اسی طرح دینی فن و ہنر کو دین اسلام کی امنگوں اور آرزوؤں کو مجسم کرنے والا اور دنیا والوں کے سامنے پیش کرنے والا سمجھتے ہیں جو انسان کی سعادت، انسان کے معنوی اور روحانی حقوق، انسان کی سربلندی، انسان کے تقویٰ اور پرہیزگاری اور انسانی معاشرے میں عدل و انصاف جیسے امور کے حصول میں مددگار ہو[۵]۔ اس بنیاد پر، رہبر انقلاب اسلامی ہنر کو تبلیغ کا ایک بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں[۶]۔ اسی طرح رہبر انقلاب اسلامی شعر کو فن و ہنر کا ایک ممتاز شعبہ قرار دیتے ہیں[۷]۔ رہبر انقلاب اسلامی نے فن و ہنر کے بارے میں جن نکات پر زور دیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

فن و ہنر کا اعلیٰ و ارفع مقام، اقدار کے فروغ اور ترویج میں فن و ہنر کا کردار، انقلابی ہنرمندوں اور آرٹسٹوں کی رہنمائی کرنا اور انہیں راستہ دکھانا، دفاع مقدس کے فن و ہنر کی اہمیت، انقلاب کے فن و ہنر کے

---

۱. بیانات، ۱۳۷۰/۷/۱۵
۲. ایضاً، ۱۳۷۰/۸/۲۹
۳. ایضاً، ۱۳۷۶/۱۱/۱۴
۴. ایضاً، ۱۳۷۷/۲/۷
۵. بیانات، ۱۳۸۰/۵/۱
۶. ایضاً، ۱۳۷۷/۴/۱۷
۷. ایضاً، ۱۳۷۵/۱۲/۲۲

کمزور پہلوؤں کی شناخت، معاشرے کے ارتقاء میں فن و ہنر کا مقام، بامقصد ہنر، دینی ہنر اور معنویت و روحانیت کے لیے ہنر کو استعمال کرنے کی ضرورت پر زور[1]۔

فارسی زبان

آیت اللہ خامنہ ای کا فارسی زبان کی اہمیت اور مقام کے بارے میں خیال ہے کہ جو شخص بھی انسانی معارف و تعلیمات میں دلچسپی رکھتا ہو اسے فارسی زبان کے خاص مقام و مرتبے کا قائل ہونا چاہیے، کیونکہ اس شیریں، سادہ، خوبصورت اور وسیع زبان نے دنیا کے وسیع جغرافیائی علاقوں کو اپنے معنوی تسلط اور گھیرے میں لینے میں کامیابی حاصل کی ہے اور اپنے معنوی اور روحانی اثر ونفوذ سے قوموں کے دلوں میں اپنی بلاغت کی طاقت اور افادیت کی جگہ بنائی ہے اور ان کو ثقافت، دین، معرفت اور تہذیب و تمدن کا تحفہ دیا ہے۔ ان کی نظر میں فارسی زبان کی ایک اور خصوصیت اور مقام و مرتبہ یہ ہے کہ اس نے اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ فارسی زبان خوبصورت موسیقی کا آہنگ رکھتی ہے اور بہت زیادہ نرمی، روانی اور لچک کی حامل ہے۔ یہ دلنشیں زبان تشدد سے دور اور اس سے عاری ہے[2]۔

سائنس و ٹکنالوجی

رہبر انقلاب اسلامی نے علم کی پیداوار، ٹکنالوجی کے حصول اور اس سے استفادہ اور علم کو تجارتی بنیادوں پر استعمال کرنے پر بار بار زور دیا ہے۔ انہوں نے عملی و نظری یعنی تھیوری اور پریکٹیکل کے میدان میں علم کی اہمیت اور مقام و مرتبے، علمی ترقی و پیشرفت، سافٹ ویئر کی تحریک اور سوشل سائنسز میں تبدیلی وغیرہ پر بہت زیادہ توجہ دی ہے اور ان مفاہیم کو بیان کرکے ان کی وضاحت کی ہے اور علمی معاشرے کو اس کی طرف لے جانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ملک کے اسٹریٹیجک پروگراموں کی منصوبہ بندی کرتے وقت اس موضوع کی اہمیت پر زیادہ زور دیا ہے۔

۱۔ بالادستی کی دستاویزات میں علمی وسائنسی اور تحقیقی ترقی کا مقام:

---

۱. از تہاجم فرہنگی تا جنگ نرم، ص ۱۱-۱۵

۲. ۱۳۷۷/۱۲/۱۲

ملک کی علمی و سائنسی ترقی کے لیے نظام کی بالادستی کی ایک دستاویز کی حیثیت سے ملک کا جامع علمی و سائنسی نقشہ تیار کرنے پر آپ نے ہمیشہ زور دیا اور اس کے لیے کوشش کی ہے[۱]۔ ملک کی اہم پالیسیوں میں جن کا اصلی دائرہ کار رہبر انقلاب اسلامی کی جانب سے معین اور ابلاغ کیا جاتا ہے، سائنس و ٹکنالوجی کے مقام و مرتبے کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے اور ملک کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں ترقیاتی پروگرام کی مجموعی پالیسیوں میں اس پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ انہوں نے تیسرے ترقیاتی پروگرام کی مجموعی پالیسیوں میں استعداد و صلاحیت کو بڑھانے، تخلیقی صلاحیت اور سائنسی ٹکنالوجی کی ترغیب دلانے، تحقیق کے کام کو مضبوط بنانے اور سائنس و ٹکنالوجی کی طاقت کو بڑھانے پر توجہ دینے کی ضرورت پر زور دیا[۲]۔ اسی طرح چوتھے ترقیاتی پروگرام کی مجموعی پالیسیوں میں درج ذیل امور پر تاکید کی گئی:

دنیا میں علم کی پیداوار میں ملک کے حصے کو بڑھانے کے لیے ملکی وسائل و امکانات کا استعمال اور انہیں منظّم کرنا؛ سافٹ ویئر کی تحریک کو مضبوط بنانا؛ ٹکنالوجی خاص طور پر نئی ٹکنالوجی حاصل کرنا، جن میں ماحولیات، ایرواسپیس، مواصلات اور دیگر جدید ٹکنالوجیاں شامل ہیں؛ سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی پر زور دیتے ہوئے قومی سلامتی کو مضبوط بنانا[۳]۔

اس کے علاوہ پانچویں ترقیاتی پروگرام کی مجموعی پالیسیوں میں موضوعات پر کچھ اس طرح زور دیا ہے: اعلیٰ تعلیمی اور تحقیقی نظام میں تبدیلی؛ تحقیقی کاموں کے بجٹ میں اضافہ؛ علاقے میں سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں دوسری پوزیشن کا حصول اور پانچویں پروگرام میں اس کو باقی رکھنا؛ صنعت کے تحقیقاتی مراکز اور یونیورسٹیوں کے درمیان مؤثر تعلق؛ علم، سائنس اور ٹکنالوجی کی پیداوار میں شراکت کے لیے غیر سرکاری اور نجی شعبے کو مضبوط بنانا؛ مطلوب اور درکار جدید ٹکنالوجی کا حصول؛ تعلیم و تربیت کے نظام میں تبدیلی؛ سیاسی علوم کے مقام اور پوزیشن کو مضبوط بنانے کے ذریعے اس میں تبدیلی اور ترقی؛ تعلیمی نصاب، پروگراموں اور طریقوں میں اصلاح اور نظرثانی کے مقصد سے باصلاحیت اور اہل افراد کی بھرتی؛ تحقیقاتی مراکز اور سرگرمیوں کی کمیت اور کیفیت کو بہتر بنانا اور نظریہ پردازی، تنقید اور آزادانہ فکر و سوچ کی ترویج؛

---

۱. بیانات، ۱۳۸۵/۵/۲۳، ۱۳۷۶/۶/۱۲
۲. ابلاغ سیاستھای کلی برنامہ سوم، ۱۳۷۸/۳/۱
۳. ابلاغ سیاستھای کلی برنامہ چھارم، ۱۳۸۲/۹/۱۱

سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں تخلیقی کام کرنے والوں اور دانشوروں کی بامقصد مادی اور معنوی مدد و حمایت میں اضافہ[۱]۔

دفتری نظام کی مجموعی پالیسیوں کے ابلاغی پیغام میں عہدیداروں اور مدیروں کی تقرری اور ترقی میں علمی قابلیت، افرادی قوت اور انسانی وسائل کی معنوی اور روحانی ترقی اور ان کے علم و دانش، تخصص اور مہارت کی سطح بلند کرنے کا راستہ ہموار کرنے؛ عوامی خدمات کو بہتر طریقے سے پیش کرنے کے لیے الیکٹرانک دفتری نظام کی ترقی اور اس کے لیے ضروری اقدامات انجام دینے؛ علمی انتظامی اصولوں کو استعمال اور اسلامی اقدار کی بنیاد پر اطلاعات اکٹھا کرنے کے ذریعے دفتری نظام کو نالج بیسڈ کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے[۲]۔

۲۔ علمی و سائنسی ترقی:

آیت اللہ خامنہ ای نے علم و سائنس کے مسئلے کو ملک کی اہم ترین ترجیحات میں سے قرار دیا ہے[۳] اور وسائنس کے میدان میں سعی و کوشش کو راہِ خدا میں ایک قسم کے جہاد سے تعبیر کیا ہے[۴]۔ انہوں نے سب سے زیادہ زور بنیادی علوم، تحقیق اور علمی و فکری ترقی کے لیے مناسب راستہ ہموار کرنے کی اہمیت پر دیا ہے[۵]۔ وہ ملکی ترقی کو علم پر توجہ سے مشروط قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ملکی ترقی کے تمام راستے علمی و سائنسی ترقی و پیشرفت سے جا کر ملتے ہیں۔ علمی و سائنسی ترقی ٹکنالوجی کی پیشرفت کا باعث بنتی ہے اور ٹکنالوجی کی ترقی و پیشرفت ملک کو ترقی اور رونق دیتی ہے[۶]۔ ان کی نظر میں علم ایک قوم کے اندر عزت نفس اور خود اعتمادی پیدا کرتا ہے اور یہ باعث بنتا ہے کہ یہ ملت عظیم کام انجام دے اور دشوار وادیوں اور میدانوں میں قدم رکھے[۷]۔ علمی و سائنسی قدرت و طاقت کے ذریعے ہی ایک قوم اپنی آواز دنیا والوں کے

---

۱. ابلاغ سیاست های کلی برنامہ پنجم توسعہ، ۱۳۸۷/۱۰/۲۱
۲. ابلاغ سیاست های کلی نظام اداری، ۱۳۸۹/۱/۳۱
۳. بیانات، ۱۳۸۱/۸/۲۲
۴. ایضاً، ۱۳۸۱/۱۲/۶
۵. ایضاً، ۱۳۸۱/۷/۳
۶. ایضاً، ۱۳۸۳/۹/۱۱
۷. ایضاً، ۱۳۸۳/۱۰/۱۷

کانوں تک پہنچا سکتی ہے اور سیاسی دنیا میں اعلیٰ و برتر سیاست کی حامل ہو سکتی ہے[۱]۔ ان کا کہنا ہے کہ ملک کی ترقی و پیشرفت، عزت اور قومی و اسلامی تشخص، علم و تحقیق کے شعبے میں سنجیدہ کام سے وابستہ ہے[۲]۔ اسی طرح وہ تحقیق، تخلیقی کام، سافٹ ویئر کی تحریک اور یونیورسٹی اور صنعت کے تعلق کو ملک کی سلامتی کا طویل مدت رکن قرار دیتے ہیں[۳]۔ اسلامی جمہوریہ ایران کی علمی مرجعیت ان اہم ترین اہداف و مقاصد میں سے ایک ہے جنھیں رہبر انقلاب اسلامی نے ملک کی علمی و سائنسی ترقی و پیشرفت کے لیے معین کیا ہے[۴]۔ علمی مرجعیت کے دو اصلی محور ہیں:

۱۔ ایرانی، دنیا میں سائنس و ٹکنالوجی کے میدان کی سرفہرست شخصیات قرار پائیں[۵]۔

۲۔ اگر کوئی تازہ ترین اور جدید ترین سائنسی نتائج کو حاصل کرنا چاہے تو وہ فارسی زبان سیکھنے پر مجبور ہو[۶]۔

ان کے خیال میں ملک کی اعلیٰ صلاحیت و گنجائش کی شناخت، زیادہ سعی و کوشش اور راستے کو گم نہ کرنا علمی مرجعیت حاصل کرنے کے اہم ترین عوامل ہیں[۷]۔ آیت اللہ خامنہ ای علم و دانش کے حصول کو اس قدر اہم اور ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر علم ہمارے دشمن کے پاس بھی ہو تو دشمن سے اثر قبول کیے بغیر اسے حاصل کرنا چاہیے[۸]۔ اس بنا پر ان کا خیال ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق علم یکھنا اور سکھانا سب سے زیادہ اہم ہے لیکن یہ امر غیر صحت مند علمی و ثقافتی تبادلے میں تبدیل نہیں ہونا چاہیے جیسا

---

۱. ایضاً، ۱۳۸۴/۱۰/۲۹

۲. ایضاً، ۱۳۸۶/۷/۹

۳. ایضاً، ۱۳۸۸/۶/۴

۴. ایضاً، ۱۳۸۴/۲/۱۴

۵. بیانات، ۱۳۸۳/۱۰/۱۷

۶. ایضاً، ۱۳۸۴/۲/۱۴، ۱۳۸۶/۶/۱۲، ۱۳۸۵/۸/۱۸

۷. ایضاً

۸. ایضاً، ۱۳۷۰/۳/۲۸

کہ گزشتہ شہنشاہی حکومت میں معمول بن گیا تھا[۱]۔ ان کی نظر میں ملک میں موجود استعداد و قابلیت کو بروئے کار لانے کے لیے دوسرے کے علم و دانش سے استفادہ کرنا چاہئے[۲]۔

ان کی نظر میں علمی و سائنسی ترقی و پیشرفت کے لیے کی جانے والی کوششیں اس حد تک ہونی چاہئے کہ آئندہ پچاس سال کے دوران ایران پوری دنیا کو علم برآمد کرنے والا ملک اور ایک علمی مرجع بن جائے[۳] اور فارسی زبان بھی دنیا کی علمی زبان کے طور پر جانی جائے[۴]۔ ان کا خیال ہے کہ تمام شعبوں میں سائنس کے مضامین ہوں یا سماجیاتی علوم کے، علم کی پیداوار عمل میں آنی چاہیے اور علم کا صنعت کے ساتھ رابطہ بھی قائم ہونا چاہیے[۵]۔

۳۔ دانشوروں کی تربیت کے لیے راستہ ہموار کرنا:

دانشوروں کی تربیت کے لیے راستہ ہموار کرنا اور دانشوروں کی صلاحیت و استعداد کی شناخت کرنا ایسے مسائل ہیں کہ جن پر رہبر انقلاب اسلامی نے بہت زور دیا ہے[۶]۔ وہ دانشوروں کو قومی سرمایہ[۷] اور معنوی و روحانی سرمایہ[۸] سمجھتے ہیں اور اسی بنا پر خاص تاکید کی ہے کہ ملکی حکام دانشوروں پر خصوصی توجہ دیں۔ اسی بنا پر دانشوروں کی قومی تنظیم کی تشکیل رہبر انقلاب اسلامی کی خصوصی کوششوں سے ہی عمل میں آئی۔

۴۔ تحقیق کی بھرپور حمایت:

---

۱. ایضاً، ۱۳۷۱/۲/۹
۲. ایضاً، ۱۳۷۰/۹/۱۲
۳. ایضاً، ۱۳۸۱/۹/۷
۴. ایضاً، ۱۳۸۴/۱/۳۰
۵. ایضاً، ۱۳۸۲/۵/۱۵
۶. بیانات، ۱۳۸۳/۷/۵
۷. پرسش و پاسخ در جمع دانشجویان واستادان دانشگاہ صنعتی امیر کبیر، ۱۳۷۹/۱۲/۹
۸. بیانات، ۱۳۸۴/۲/۱۴

آیت اللہ خامنہ ای کا خیال ہے کہ تحقیق کے دروازے کو کھلا رکھنا چاہیے اور مختلف اداروں، صنعتی کارخانوں، نجی شعبے اور سرکاری اداروں کے مدیروں اور حکام کو تحقیق کے مسئلے پر بہت زیادہ کام اور کوشش کرنی چاہیے تاکہ صنعتیں اپنے پیشرفتہ اور جدید حریفوں کے ساتھ مقابلے میں پیچھے نہ رہیں اور باقی رہ سکیں[۱]۔ وہ تحقیقات کو ایک سمت دینے پر زور دیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ تحقیقات کو ایک واضح سمت کی طرف لے جایا جانا چاہیے اور تحقیقات کے کام میں پراگندگی اس کے کم فائدہ مند ہونے کا باعث بنے گی[۲]۔ بنا پر اس سلسلے میں انہوں نے جو اہم ترین کام اور راستہ بیان کیا ہے، وہ ملک میں علمی و تحقیقاتی شہر قائم کرنے کے سلسلے میں مدد و حمایت کی ضرورت[۳]، سائنس و ٹیکنالوجی پارکوں کا قیام[۴] اور ملکی محققین کے علمی سائنسی مقالات اور مضامین کی اشاعت کے لیے اسلامی I.S.I جریدوں کا اجراء ہے[۵]۔

۵۔ علمی خود کفالت اور سماجیاتی علوم میں تبدیلی کی ضرورت:

آیت اللہ خامنہ ای کا ترجمہ کے علم، ثقافت اور فکر و سوچ سے اجتناب پر تاکید کرتے ہوئے یہ کہنا ہے کہ عقل و خرد، تجزیہ و تحلیل اور داخلی فہم و ادراک کا استعمال کیے بغیر مغربی دنیا کی پروپیگنڈہ لہر سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے اور ترجمہ کے علم، نظریہ اور فکر و سوچ کی طرف رخ نہیں کرنا چاہیے[۶]۔ اس بنا پر وہ جدت کے بغیر ترجمہ اور تقلید کو پیشرفت نہیں پسماندگی سمجھتے ہیں اور ملک کی قدرت و طاقت کی حیثیت سے اندر سے پیدا ہونے والے علم پر زور دیتے ہیں[۷]۔ وہ ترجمہ کے بجائے علمی اقتباس کا راستہ اپنانے کی تجویز پیش کرتے ہیں[۸]۔

---

۱. ایضاً، ۱۳۸۹/۱/۹
۲. ایضاً، ۱۳۸۰/۹/۱۹
۳. ایضاً، ۱۳۸۰/۹/۱۹
۴. ایضاً، ۱۳۸۵/۵/۲۳
۵. ایضاً، ۱۳۸۴/۷/۳
۶. بیانات، ۱۳۸۲/۹/۲۶
۷. ایضاً، ۱۳۸۵/۸/۱۸
۸. ایضاً، ۱۳۸۱/۷/۳

آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں ملک کی علمی تبدیلی میں ایک ضرورت سماجی علوم میں تبدیلی ہے۔ اس علم کو اسلامی رخ دیا جائے اور یونیورسٹیوں کا ماحول اسلامی مفاہیم سے جڑا ہوا ہو۔ ان کا خیال ہے کہ اسلامی اہداف کے قریب ہونے کا عمل یونیورسٹیوں، یونیورسٹی کی کتابوں، اساتذہ اور یونیورسٹی کی فضا میں نظر آنا چاہیے[۱]۔ ان کی نظر میں سماجی علوم کے شعبے کو نظریہ پردازی کی ضرورت ہے[۲] اور قانون، اقتصاد و معاشیات، سیاست اور سماجی علوم کے دیگر بنیادی شعبوں کو تشکیل دینے والے بنیادی مفاہیم ملک کے اندر تحقیق اور جدت کے ذریعے پیدا کیے جا سکتے ہیں اور اس سلسلے میں حوزہ علمیہ اور اسلام پر ایمان و یقین رکھنے والے اساتذہ تحقیق و جستجو کے ساتھ اقدام کر سکتے ہیں[۳]۔ اسلامی سماجی علوم کے مغربی سماجی علوم سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اگر ان دونوں کا باہم ملنا، مغربی سماجی علوم کے مقابل مجذوب اور مغلوب ہونے کے معنی میں نہ ہو تو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے[۴]۔

۶۔ ملک میں سافٹ ویئر تحریک کے آغاز کی ضرورت:

ایک اہم نکتہ جس پر آیت اللہ خامنہ ای نے خاص طور پر ۱۳۸۰ھ ش کے اوائل میں بہت زیادہ زور دیا، علم، علم کی پیداوار اور علم کی سرحدوں کو توڑنے کے سلسلے میں ایک عظیم حرکت اور تحریک شروع کرنے کے معنی میں سافٹ ویئر کی تحریک کا موضوع تھا[۵]۔ ان کا خیال ہے کہ سافٹ ویئر کی تحریک میں صرف سیکھنے پر قناعت نہ کی جائے بلکہ ہدف و مقصد تحقیق، تعلیم، علم کی پیداوار اور اس مقام پر پہنچنا ہو کہ جہاں سے علمی جدت شروع ہوتی ہے[۶]۔ اسی طرح تقلید اور ترجمہ کی حالت سے باہر نکلنا[۷] اور علم، امن و سلامتی، دانشوروں کی تربیت، قومی قدرت و اقتدار اور آگے کی سمت لے جانے والے کاموں اور جدت طرازی جیسے

---

۱. ایضاً، ۱۳۷۱/۹/۱۰
۲. ایضاً، ۱۳۸۷/۲/۱۴
۳. ایضاً، ۱۳۸۲/۸/۸
۴. ایضاً، ۱۳۸۴/۱۰/۲۹
۵. بیانات، ۱۳۸۳/۱۰/۱۷
۶. ایضاً، ۱۳۸۲/۸/۸
۷. ایضاً، ۱۳۸۲/۸/۱۵

مفاہیم کے بارے میں عوام کی حساسیت اور توجہ کے بڑھنے کی ضرورت کو انہوں نے سافٹ ویئر تحریک کی دیگر خصوصیات میں سے قرار دیا ہے[۱]۔

۷۔ یونیورسٹیوں اور ان سے وابستہ افراد پر بھرپور توجہ:

آیت اللہ خامنہ ای جتنی اہمیت علم کو دیتے ہیں اتنی ہی اہمیت یونیورسٹی کے طلبا اور اس سے منسلک افراد کو دیتے ہیں اور اسی بنا پر وہ ہر سال یونیورسٹیوں کے طلبا اور اساتذہ سے ملاقات کرتے ہیں اور ان کی باتیں اور نظریات سنتے ہیں۔ وہ یونیورسٹیوں کے بارے میں اس بات پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں کہ یونیورسٹیوں کا ماحول اسلامی ہونا چاہیے اور وہاں فکر و سوچ کی آزادی ہونی چاہیے۔ آیت اللہ خامنہ ای کے بیان میں علم دین کے ساتھ، سعی و کوشش اخلاق کے ساتھ، افکار و نظریات کا تبادلہ کھلے دل کے ساتھ، مضامین کا تنوع یکساں ہدف کے ساتھ، سیاسی کام نفس کی سلامتی کے ساتھ، گہرا غور و فکر سرعت عمل کے ساتھ اور خلاصہ یہ کہ یونیورسٹیوں میں دنیا ہمیشہ آخرت کے ساتھ ہونی چاہیے[۲]۔ ان کی نظر میں یونیورسٹی ایک ایسی اسلامی یونیورسٹی ہے جس میں علم کو ایک حقیقی قدر سمجھا جائے اور افراد اس میں پیسہ کمانے کے لیے تعلیم حاصل نہ کریں[۳]۔

آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں آزاد اندیشی یعنی آزادانہ سوچنا، آزادانہ فیصلہ کرنا، ترجمہ تقلید اور دنیا کے پروپیگنڈے کے زیر اثر مغرب کی تشہیراتی آوازوں کے پیچھے نہ چلنا ہے[۴]۔ آزاد اندیشی، جدت طرازی اور تحول و تبدیلی کے راستے کو کھلا رکھنا چاہیے اور یہ کام خود دانشوروں اور سرگرم طلبا کے ہاتھوں انجام پانا چاہیے تاکہ قومی تشخص کی بنیادیں اور ڈھانچہ کمزور نہ ہو۔ ہمیں نئی بات اور جدت طرازی کی طرف جانا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہ نئی بات تخریب کے لیے نہ ہو بلکہ ترمیم اور تکمیل کے لیے ہو[۵]۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ اظہار خیال کے لیے طلبا کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرنے

---

۱. ایضاً، ۱۳۸۳/۹/۱۱
۲. پیام بہ دانشجویان، ۱۳۷۵/۷/۳
۳. پرسش و پاسخ با دانشجویان در دانشگاہ تہران، ۱۳۷۷/۲/۲۲
۴. بیانات، ۱۳۸۲/۸/۱۵
۵. ایضاً، ۱۳۸۵/۸/۱۸

کے سلسلے میں ایک صحت مند ماحول پیدا کرنے کے لیے یونیورسٹیوں میں آزاد اندیشی کی چیئرز قائم کی جائیں[۱]۔

۸۔ علم دین اور اخلاق کے ہمراہ ہونے کی ضرورت:

آیت اللہ خامنہ ای علم کے رجحان کی دین کے رجحان کے ساتھ ناسازگاری کے نقطۂ نظر کو مسترد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی علمی برتری کی وجہ جو کئی صدیوں تک جاری رہی، اسلام کی علم و دانش پر توجہ تھی[۲]۔ اس نقطۂ نظر کے ساتھ انہوں نے ہمیشہ علمی ترقی و پیشرفت کے اخلاقی اقدار کے ہمراہ ہونے کی ضرورت پر زور دیا ہے اور ان کا یہ خیال ہے کہ "علم کو اخلاق اور ایمان کے ہمراہ ہونا چاہیے تاکہ ہمیں اس مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے جس کا مغرب کو سامنا کرنا پڑا؛ کیونکہ علم مغرب کے لیے ظلم، اخلاقی گمراہی و بے راہ روی اور گمراہ کن ثقافتوں کا وسیلہ و ذریعہ بن گیا"[۳]۔ ان کی نظر میں اگر انسان مختلف علوم حاصل کر لے لیکن صحیح انسانی تعلقات کو نہ جانے، عوام کی زندگی پر ہٹ دھرمی کی حکمرانی ہو، معرفت و انسانیت کا نور نہ ہو تو جہالت کا شکار ہے[۴]۔ ان کی نظر میں اسلامی ایران عاقلانہ، منطقی اور علمی طور پر اور جدید طرز پر زندگی گزارنا چاہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی اخلاقی اقدار اور دینی ایمان کا بھی پابند رہنا چاہتا ہے[۵]۔ ایک اہم مسئلہ جس پر وہ اپنی تقریروں میں خصوصی طور پر زور دیتے ہیں، علمی ہونے اور مغربی ہونے کے درمیان فرق کی ضرورت ہے۔ وہ ایسا علم حاصل کرنے پر زور دیتے ہیں جو انسانیت، عدل و انصاف، امن و صلح اور سلامتی کے لیے ہو نہ کہ وہ علم جو جنگ، تشدد، برائیوں، منشیات، قوموں پر جارحیت اور جنگ و خونریزی کے لیے ہو[۶]۔

---

۱. ایضاً، ۱۳۸۸/۶/۸
۲. ایضاً، ۱۳۷۰/۱۱/۱۵
۳. ایضاً، ۱۳۸۵/۶/۲۵
۴. بیانات، ۱۳۷۰/۱۱/۱۳
۵. ایضاً، ۱۳۸۹/۱/۹
۶. ایضاً، ۱۳۸۶/۲/۲۵

۹۔ جوہری ٹکنالوجی سے بہرہ مند ہونا:

آیت اللہ خامنہ ای نے ملک کی سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی و پیشرفت کے لیے ایٹمی ٹکنالوجی حاصل کرنے اور اس سے بہرہ مند ہونے پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور انہوں نے اس شعبے میں علمی و سائنسی ترقی و پیشرفت کو بہت زیادہ خصوصیات اور امتیازات کا حامل قرار دیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ ملک کے بااستعداد اور باصلاحیت نوجوانوں، مفکرین اور سائنس دانوں نے بغیر کسی مدد کے چند سال کے دوران آہستہ آہستہ اس ٹکنالوجی کو حاصل کر لیا ہے[۱]۔ ان کی نظر میں ملک میں یہ ٹکنالوجی ختم نہیں ہو گی اور اسے ختم نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ اسے کسی سے ادھار یا مانگ کر نہیں لیا ہے، اسے ملک کے باصلاحیت سائنس دانوں نے حاصل کیا ہے۔ اس بیش قیمت علم و دانش کو نہ حکومت، نہ حکام اور نہ ایٹمی توانائی کا ادارہ اور نہ ہی کسی بھی شخص کو ضائع کرنے کا حق ہے اور نہ ہی وہ اس پر سودے بازی کر سکتا ہے[۲]۔ رہبر انقلاب اسلامی نے اپنی تقریروں میں ہمیشہ نہ صرف یہ کہ ایٹمی ٹکنالوجی کو حاصل کرنے کے لیے علمی و سائنسی سرگرمیوں کو نہ روکنے پر زور دیا ہے بلکہ اس سلسلے میں مطالعات کو مزید وسعت دینے کی ہدایت بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے دنیا میں چوتھی اور پانچویں نسل کی سینٹری فیوج مشینوں کی تیاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس ٹکنالوجی اور حتیٰ اس سے بھی برتر ٹکنالوجی کو حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ۔ وہ ایٹمی ٹکنالوجی کے حصول میں تاخیر کو غلط سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اگر آج ملت ایران نے اس علم اور ٹکنالوجی کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کی تو کل دیر ہو جائے گی اور یہ سب اس لئے ہے تاکہ ہماری آئندہ آنے والی نسلوں کو تیل ختم ہونے کے بعد مغرب والوں کی جانب ہاتھ نہ پھیلانا پڑے[۳]۔

فوج، دفاع اور پولیس کے امور

---

۱. ایضاً، ۱۳۸۲/۱/۱
۲. ایضاً، ۱۳۸۲/۸/۱۱
۳. بیانات، ۱۳۸۵/۳/۲۵
۴. ایضاً، ۱۳۸۸/۹/۱۵

اسلامی جمہوریہ ایران کی مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے آیت اللہ خامنہ ای کی فوجی اور دفاعی امور پر اسٹریٹیجک نظر ہے اور آپ دفاعی اور فوجی مراکز اور تنصیبات کے معائنے میں اصلی مواقف اور پالیسیاں پیش کرکے اور مختلف اقدامات کرکے مسلح افواج کے اخلاق، روحانیت کے ساتھ ساتھ فوجی اور دفاعی ترقی و پیشرفت اور نتائج کے بارے میں ترغیب دلاتے ہیں اور اس کے علاوہ فرض شناسی اور ایمان کے ساتھ تخصص پر زور دیتے ہیں[۱]۔ وہ مسلح افواج کی جانب سے اخلاقی و انقلابی اقدار کی پابندی اور ملک کی سرنوشت اور تقدیر کے ساتھ وفاداری کو اسلامی جمہوریہ ایران میں عسکری رجحان کے بارے میں دشمن کے مخاصمانہ پروپیگنڈے کی وجہ قرار دیتے ہیں[۲]۔ مسلح افواج کی خصوصیات اور اپنی قیادت و رہبری کے دور میں آیت اللہ خامنہ ای کی ان سے توقعات کچھ اس طرح ہیں:

الف: فوجی علم و دانش اور ایمان کی طاقت کا امتزاج: آیت اللہ خامنہ ای مسلط کردہ جنگ میں دشمن کی شکست اور ناکامی کی وجہ مجاہدین اسلام کے ایمان اور روحانیت کے عظیم سرمائے کو قرار دیتے ہیں اور وہ اس کے مقابلے میں جنگی ساز وسامان کے فیصلہ کن کردار کے قائل نہیں ہیں[۳]۔

ب: مجاہدین اسلام کی قدردانی: آیت اللہ خامنہ ای مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے ملت ایران کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ جنگ کے دوران ایثار و فداکاری کا مظاہرہ کرنے والوں کی قدردانی کرے اور ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرے جنہوں نے حق و باطل کے معرکے میں اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مجاہدین کی شجاعت و بہادری، کارناموں، جذبۂ ایمانی اور فتح کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کی نظر میں مجاہدین کے صحیفۂ لوح و دل، واقعات اور یادوں سے بھرے ذہن اور فولادی ارادوں کو کہ جن پر بڑی طاقتوں کے جدید ہتھیاروں کا کوئی اثر نہیں تھا، آسانی کے ساتھ بیان نہیں کیا جاسکتا[۴]۔

---

۱. اصول و رہیافت ہای ہنر اسلامی در کلام رہبری، ص ۳۸
۲. ارتش کلمہ طیبہ، ص ۱۹۶، ۱۹۰
۳. ارتش کلمہ طیبہ، ص ۴۰۵
۴. پایگاہ، بش

ج: **اسلامی جمہوری نظام کے دو طاقتور بازوؤں کے طور پر فوج اور سپاہ کو مضبوط بنانا:** رہبر انقلاب اسلامی نے جو مسلح افواج کے سپریم کمانڈر بھی ہیں اور ان کی فوجی مسائل پر گہری نظر ہے، اسلامی جمہوریہ ایران کی فوج کی کارکردگی کا اسلامی انقلاب سے پہلے کی کارکردگی سے موازنہ کرتے ہوئے ہمیشہ ان دو اداروں کو مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے اور نظام کے دو مضبوط بازوؤں کے طور پر ان کے باہمی تعاون اور کردار پر زور دیا ہے[۱]۔ البتہ رہبر انقلاب اسلامی ان کی ایک دوسرے سے الگ ذمہ داریوں پر بھی یقین رکھتے ہیں[۲]۔ آئین کی رو سے سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی کی مرکزی ذمہ داری اسلامی انقلاب اور اس کے نتائج کا تحفظ اور اسلامی جمہوریہ ایران کی فوج کی ذمہ داری ملک کی آزادی و خود مختاری اور ارضی سالمیت کا تحفظ کرنا ہے۔

د: **بحریہ:** آج کی دنیا میں سمندر اور بحری نقل و حمل اور اشیاء کو منتقل کرنے میں سہولت کے لحاظ سے ہوائی اور زمینی نقل و حمل کی نسبت سستی ہے۔ فوجی لحاظ سے بھی ہر ملک میں بحریہ، فوجی مشن انجام دے کر دفاعی یا جارحانہ کاروائیوں میں دوسری افواج کے ساتھ شرکت کرتی ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای نے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے ہمیشہ مسلح افواج خصوصا بحریہ کو مضبوط بنانے پر زور دیا ہے۔ ان کی نظر میں بحریہ ایک اسٹریٹجک فورس ہے جس کی سرگرمیاں داخلی سمندر کے علاوہ آزاد اور بین الاقوامی سمندر تک پھیلی ہوتی ہیں۔ انہوں نے خلیج فارس کے علاقے کو حساس قرار دیتے ہوئے اس علاقے کو ایسے غاصبوں اور بڑی طاقتوں کے طاقت کے مظاہرے کا مقام قرار دیا کہ جن کے نزدیک قوموں کی خود مختاری اور عزت و حیثیت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے[۳]۔ وہ ایران کی جانب سے پوری تاریخ کے دوران بحری امور پر توجہ نہ دینے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: غیر ملکی طاقتوں کی جانب سے ایران کے سمندری علاقوں پر قبضے کی وجہ سے ایران کی بندرگاہوں پر ایک عرصے تک غیر ملکی طاقتوں کا

---

۱. ارتش کلمہ طیبہ، ص ۱۹۹-۲۰۸
۲. حدیث، ج ۳، ص ۳۰۰-۳۰۱
۳. بیانات، ۱۲/۱۰/۷۰ ۱۳

قبضہ رہا[۱]۔ انہوں نے شمال کے سمندر اور جنوبی سمندر خاص طور پر خلیج فارس اور بحیرہ عمان میں بحریہ کو جدید ساز وسامان اور آلات و وسائل سے لیس کرنے کو اس کی ترجیح قرار دیا[۲]۔

آیت اللہ خامنہ ای نے جنگ میں بحریہ کے کردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا کہ علاقے سے باہر کے حملوں اور جنگوں میں اسلامی جمہوریہ ایران کی بحریہ کا کیا مقام ہے؟[۳]۔ ۱۹اسفند ۱۳۸۶ھ ش کو بحریہ کے کمانڈر سے ملاقات میں بحریہ کے کام کی حساسیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بحیرہ عمان میں اس کی ذمہ داریوں کو اس کے لیے ایک موقع قرار دیا اور بحر ہند میں دشمن کی وسیع پیمانے پر موجودگی کو اس علاقے میں کام کے اہم ہونے کی وجہ اور ایک دشوار کام بتایا۔ ان کے بقول خلیج فارس میں جنگ گھر کے اندر جنگ ہے جبکہ بحیرہ عمان میں گھر سے باہر جنگ ہے[۴]۔ ۶ آذر ۱۳۸۷ھ ش کو اسلامی ایران کی فوج کی بحریہ کے کمانڈروں اور حکام سے ملاقات میں انہوں نے وسائل کے محدود ہونے اور ان میں سے بعض کے قدیم اور پرانے ہونے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بچت اور ترجیحات کو فوجی طاقت میں اضافے کا سبب قرار دیا۔ آیت اللہ خامنہ ای نے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے بحیرہ عمان کے عظیم، طویل اور انتہائی حساس ساحل کو ایک پوشیدہ خزانے کی مانند قرار دیا[۵]۔ انہوں نے علاقے کی تبدیلیوں میں کامیابیوں کو اسلامی نظام کے خلاف ہنگامہ آرائی اور دشمنی کی ایک وجہ قرار دیا اور ملک کے وسیع ساحلوں خاص طور پر بحیرہ عمان اور مکران کے علاقے کو عظیم قومی سرمائے سے تعبیر کیا[۶]۔

ھ: **مسلح افواج سے توقعات:** نفس کی پاکیزگی، مجاہدت اور جدوجہد کے ساتھ ساتھ روحانیت اور معنویت میں اضافہ، علمی اور فوجی بنیادوں کو مضبوط بنانا، ایک نیک سیرت اور باایمان مسلمان کا نمونہ، جدید ٹکنالوجی سے لیس ہونا ایسی توقعات ہیں جو مسلح افواج سے سپریم کمانڈر کی توقعات کا حصہ ہیں۔ وہ مسلح

---

۱. راہبرد حماسہ...، ص ۷-۱۲
۲. ایضاً، ص ۱۴
۳. ایضاً، ص ۲۰-۲۱
۴. ایضاً، ص ۲۳-۲۵
۵. ایضاً، ص ۲۷-۳۴-۳۶
۶. بیانات، ۱۳۹۱/۹/۷

افواج کے جوانوں اور افسروں سے چاہتے ہیں کہ وہ اپنی علمی و فوجی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ خود کو روحانی اور دینی لحاظ سے بھی مضبوط بنائیں اور ایک پاک، باایمان، نیک سیرت، خوش اخلاق اور معرفت کے حامل ایک مسلمان کا نمونہ بنیں[۱]۔ انہوں نے دانشور اور مفکر نوجوانوں کی ہمت و کوشش اور ماہرین کی مدد سے جدید ترین ٹکنالوجی سے لیس اور مسلح ہونے کے ساتھ ساتھ تعمیری روح کا حامل ہونے کو بھی مسلح افواج کا لازمہ قرار دیا[۲]۔ ۶ آذر ۱۳۸۷ھ ش کو اسلامی جمہوریہ ایران کی فوج کی بحریہ کے کمانڈروں سے ملاقات میں بحریہ کے مشن کو پیچیدہ قرار دیتے ہوئے کمانڈروں کو ہدایت کی کہ وہ وسائل و امکانات اور سازوسامان کا جائزہ لے کر انہیں آپریشنل بنائیں اور اپ گریڈ کریں[۳]۔

و: **مسلح افواج کی قوت و طاقت کا راز:** مسلح افواج کی قوت وطاقت اور تیاری اسلامی نظام کی ارضی سالمیت کے دفاع اور اقدار کے تحفظ میں اہم کردار کی حامل ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای نے اس سلسلے میں مسلح افواج کی آمادگی کو انتہائی اہم قرار دیا ہے اور جنگ کے زمانے کی مانند امن اور تعمیر نو کے دور میں مسلح افواج کے کردار پر زور دیا ہے اور جنگی تیاری کو ان افواج کی پہلی ترجیح اور اس کے اندر (Upgradation) کو اس کے بعد کی ترجیح قرار دیا ہے[۴] اور انہوں نے فوج کے جوانوں اور افسروں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی آمادگی اور اتحاد و یکجہتی کو باقی رکھیں اور اپنی ذمہ داری کے احساس کو ہاتھ سے نہ جانے دیں[۵]۔

آیت اللہ خامنہ ای نے اپنے فریضے سے پیچھے رہ جانے اور اسے ادا نہ کرنے کو امن کے زمانے میں مسلح افواج کے لئے ایک مصیبت قرار دیا اور انہیں ہدایت کی کہ اگر برسوں تک جنگ نہ ہو تو بھی پوری طرح تیار رہنا چاہیے تاکہ ملت ایران یہ محسوس کرے کہ وطن کی حفاظت کرنے والے ہمیشہ اور ہمہ وقت اپنی

---

۱. ارتش کلمہ طیبہ، ص ۸۷
۲. ایضاً، ص ۶۳-۶۴
۳. راہبرد حماسہ، ص ۲۹-۳۲-۳۳
۴. پایگاہ، بش
۵. ارتش کلمہ طیبہ، ص ۳۰۴-۳۰۵

جان قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ان کی نظر میں مسلح افواج کے دفاعی اقدامات ان لوگوں کے سامنے استقامت اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں جو ایک قوم کے عظیم مقاصد اور آرزوؤں کے خلاف صف آرا ہیں[۱]۔ ۲۶ مہر ۱۳۷۷ھ ش کو انہوں نے جنگ کے بعد، دلوں میں معنویت اور روحانیت کی شمع فروزاں کے خاموش ہونے کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا کہ "بعض پاکیزہ اور باایمان نوجوانوں نے جنگ ختم ہونے کی بات سن کر سوگ منایا اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ شہادت اور معنویت و روحانیت کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ بے شک جہاد بہشت کا ایک دروازہ ہے لیکن جہاد کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے ایک میدان جنگ میں جہاد کرنا ہے۔[۲] دفاعی اور فوجی امور میں آیت اللہ خامنہ ای کے اہم اقدامات کو کچھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

الف: اسلامی انقلاب کی کمیٹیوں، شہربانی کے نام سے اسلامی جمہوریہ ایران کی پولیس اور اسلامی جمہوریہ ایران کی ملیشیا فورس کا ادغام اور اسلامی جمہوریہ ایران کی پولیس کی تشکیل: اس کام کا ہدف و مقصد فرائض و ذمہ داریوں میں عدم مداخلت، پولیس کی فکر و عمل اور گفتار و رفتار میں وحدت نظر، ملک کے اندر اور سرحدوں پر امن و امان کا قیام اور اخراجات میں کمی قرار دیا گیا تھا۔ ادغام کا منصوبہ مجلس شورای اسلامی میں منظوری، شورای نگہبان کی تائید اور سپریم کمانڈر کی توثیق سے عمل درآمد کے مرحلے میں پہنچ گیا۔

ب: سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی کی تشکیل نو: آیت اللہ خامنہ ای فوج اور پولیس کی حمایت کے ساتھ ساتھ سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی کے خصوصی مقام کے قائل ہیں اور اسے انقلاب کا ثمرہ قرار دیتے ہیں[۳]۔ ان کی نظر میں جنگ کے دشوار برسوں کی مجاہدت اور جدوجہد کا بھاری بوجھ اس انقلابی ادارے کے کاندھوں پر تھا جس کے افراد کم نظیر معنوی اور الٰہی نعمت سے بہرہ مند ہیں۔ اس فورس کی ایک اور نعمت جہاد کی نعمت ہے اور مسلح جہاد کی فضیلت کا دیگر فضیلتوں سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا[۴]۔

ج: فوجی مشقیں: فوجی مشقوں کے انعقاد کے اہداف و مقاصد درج ذیل ہیں:

---

۱. بیانات، ۱۳۸۲/۱/۱
۲. پایگاہ، ب ش
۳. حدیث، ج ۳، ص ۳
۴. بیانات، ۱۳۷۲/۶/۲۶

مسلح افواج کی قدرت و طاقت اور دھمکیوں اور خطروں کے مقابلے میں اس کی دفاعی طاقت کا مظاہرہ کرنا اور فوج کی آمادگی اور تیاری کو باقی رکھنا۔ آیت اللہ خامنہ ای نے ۲۵ خرداد ۱۳۷۴ھ ش کو سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی کی عاشورا نامی فوجی مشق میں دنیا والوں کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ایران حملہ کرنے والا، بدعنوان اور ظلم و ناانصافی کرنے والا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے کہا کہ یہ قوم جھکنے والی بھی نہیں ہے اور فوجی، ایٹمی اور دوسری دھمکیوں کا اس قوم پر کوئی اثر نہیں ہے[۱] (بیانات، ۱۳۷۴/۳/۲۵)۔ ۳ خرداد ۱۳۷۵ھ ش کو ولایت نامی عظیم فوجی مشقوں میں شرکت کرنے والوں سے ملاقات میں انہوں نے مسلح افواج کی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے لیے اسے ایک انقلابی، تعمیری، امیدافزا اور اہم اقدام قرار دیا اور امید ظاہر کی کہ اس کے نتائج بھی مسلح افواج کے لیے مفید اور اہم ثابت ہوں گے۔ ان کی نظر میں اسلامی جمہوریہ ایران کی مسلح افواج قوموں اور ملکوں کے لئے خطرہ نہیں ہیں بلکہ صرف حملہ آوروں کو منہ توڑ جواب دیں گی[۲]۔ ۵ مہر ۱۳۷۶ھ ش کو ذوالفقار فوجی مشقوں میں فوجی طاقت کو اس ملک لیے اہم ترین اور ضروری ترین قرار دیا جو دوسری طاقتوں کی جارحیت کا نشانہ بنتا ہے۔ انہوں نے فوجی طاقت کے عوامی، خود کفیل اور کارآمد ہونے کو سیاسی نظاموں کا لازمہ قرار دیا[۳]۔

د: اعلیٰ کمان کے ادارے کا قیام اور ادارے کے بعض عناوین میں تبدیلی:

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے اوائل میں امام خمینی کے پاس سپریم کمانڈر کا عہدہ تھا لیکن بعد میں زیادہ ذمہ داریوں اور ناسازی طبع کی بناپر سپریم کمان کے ادارے کے قیام کا حکم جاری کیا۔ جنگ کے اواخر میں مسلح افواج کے درمیان زیادہ ہم آہنگی اور حکومت کی حمایت کے لیے سپریم کمان کا ادارہ قائم کیا گیا؛ مسلح افواج کی رہنمائی اور نگرانی کرنا اور پالیسیاں بنانا اس ادارے کے فرائض میں شامل ہے[۴]۔

آیت اللہ خامنہ ای نے ۲۱ اسفند ۱۳۶۸ھ ش کو کمانڈر اعلیٰ کی حیثیت سے اعلیٰ کمان کے ادارے کے حکام سے ملاقات میں سپاہ اور فوج کے درمیان ہم آہنگی اور مسلح افواج کی رہنمائی کو اس ادارے کے قیام کے

---

۱. ایضاً، ۱۳۸۲/۱/۱
۲. بیانات، ۱۳۷۵/۳/۳
۳. ارتش کلمہ طیبہ، ص ۲۸۸/۲۸۷
۴. فرہنگ نامہ...، ص ۱۷۱/۱۷۰

اہم مقاصد میں سے قرار دیا۔ انہوں نے اس ادارے کو سلسلۂ مدارج کے اعتبار سے ان دو فوجی اداروں سے برتر اور اعلیٰ قرار دیا اور فرائض اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے بھی مکمل طور پر مختلف قرار دیا[۱]۔ مسلح افواج کے اعلیٰ ترین فوجی مرجع کی حیثیت سے اس ادارے کو مسلط کردہ جنگ کے اواخر میں قائم کیا گیا۔ آیت اللہ خامنہ ای نے ۲۱ دی ۱۳۶۹ھ ش کو فوج اور پولیس کے اعلیٰ رتبہ کمانڈروں سے ملاقات میں سپریم کمان کو مسلح افواج کا اصلی محور و مرکز اور معنوی امر قرار دیا[۲]۔ ۲۵ دی ۱۳۷۰ھ ش کو انہوں نے جنرل سید حسن فیروزآبادی اور جنرل محسن رضائی کے نام فرمان جاری کرکے سپریم کمان کے ادارے کا نام بدل کر جنرل اسٹاف مسلح افواج اور جنرل اسٹاف سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی کا نام تبدیل کرکے جوائنٹ اسٹاف سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی رکھ دیا[۳]۔

ھ: فوجی تربیت: مسلح افواج کا کارآمد ہونا فوجی تربیت اور تربیتی کورسوں کے کارآمد ہونے کے تابع ہے۔ فوجی تربیت کے مراکز اور تربیتی امور پر توجہ دینا اور ان کے نتائج سے آگاہی فوج کے اعلیٰ حکام اور کمانڈروں کی اہم ترین ذمہ داریوں اور فرائض میں شامل ہے۔ سپریم کمانڈر جنگ کو تجربے کا میدان اور زیادہ مضبوط ہونے کا مقام سمجھتے ہیں کہ روز بروز اور لحہ بہ لحہ جس سے درس حاصل کرنا چاہیے۔ رہبر انقلاب اسلامی فوجی کاروائیوں اور آپریشن کی بنیاد پر تعلیمی اور تربیتی متون اور کورس کی تدوین پر زور دیتے ہیں[۴]۔

آبان ۱۳۶۹ کو انہوں نے فضائیہ یونیورسٹی میں مہمانوں کی کتاب میں اپنے تاثرات درج کیے اور اس یونیورسٹی کے اساتذہ کو حقیقی ترقی و پیشرفت اور کامیابی کے راز کے طور پر ان تین نکتوں کی یاد دہانی کرائی: حرکت کو جاری رکھنا، کیفیت اور کوالٹی کو اہمیت دینا اور اپنے اور کیڈٹس کے تقویٰ کے لیے کوشش کرنا[۵]۔ ۱۸ بہمن ۱۳۶۹ھ ش کو اسلامی جمہوریہ ایران کی فوج کے ہوائی یونٹ کے اہلکاروں سے ملاقات کے دوران انہوں نے منظّم طریقے اور منصوبہ بندی سے اعلیٰ تربیت جاری رکھنے کی ہدایت کی اور دفاع کو ایک

---

۱. حدیث، ج ۳، ص ۳۰۰-۳۰۳
۲. ایضاً، ج ۶، ص ۱۵۸-۱۵۹
۳. انتصابها، ۱۳۷۰/۱۰/۲۵
۴. بیانات، ۱۳۶۸/۷/۱۳
۵. حدیث، ج ۵، ص ۳۱۲

عقلی، اسلامی اور انسانی فریضہ قرار دیا اور گھات لگائے دشمنوں کے مکروفریب سے غافل نہ رہنے پر زور دیا[۱]۔ ۸ آبان ۱۳۷۰ھ ش کو کیڈٹ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے اس یونیورسٹی کو ایک امیدافزا کھیت قرار دیا کہ جس میں مناسب ماحول میں اچھی فصل اور پودوں کو بڑھنا چاہیے اور پک کر تیار ہونا چاہیے[۲]۔ آبان ۱۳۷۶ھ ش کو اس یونیورسٹی کے کمانڈروں اور کیڈٹوں سے ملاقات میں اس قسم کے مراکز کے ساتھ اپنے تعلق اور رابطے کی وجہ تین بنیادی نکتوں، علمی پہلوؤں، دفاع کے راستے میں شجاعت و بہادری اور روحانیت، تقدس اور نورانیت کے ملاپ کو قرار دیا[۳]۔ ۱۳ اردی بہشت ۱۳۸۰ھ ش کو مسلح افواج کے صوبہ گیلان کے کمانڈروں اور اہلکاروں سے ملاقات میں مختلف طریقوں اور روشوں کو علمی رنگ دینے اور تجربوں کا معیار بڑھانے سمیت مختلف طریقوں سے کام کے معیار اور افادیت بہتر بنانے کو مسلح افواج کی ایک اہم ذمہ داری قرار دیا اور بحریہ کے چوتھے زون کے تربیتی مراکز اور سپاہ کے تعلیمی وتربیتی مراکز کو ہدایت کی کہ وہ موجودہ صورت حال پر ہرگز قناعت نہ کریں اور جذبات و محرکات، روحانیت و معنویت، ایمان اور علمی توانائیوں کو مضبوط بنانے کے لیے مسلسل کوششیں کریں[۴]۔

و: فوج کے ہیڈ کوارٹر کا قیام: اسلامی جمہوریہ ایران کی فوج کا ہیڈ کوارٹر تینوں مسلح افواج کی کمان کرتا ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای نے ماہ شہریور ۱۳۷۷ھ ش میں اسے قائم کیا اور اس سے قبل اعلیٰ کمان کی ذمہ داری اور تینوں مسلح افواج کے کمانڈروں کے عہدوں میں ردوبدل کرکے تینوں مسلح افواج کی ہم آہنگی اور کمان کا فریضہ بھی انجام دیا۔ آیت اللہ خامنہ ای کی جانب سے فوجی ہیڈ کوارٹر قائم کرنے کے اقدام کی وجہ فوج کی خود مختار اور متمرکز کمان قائم کرنا اور فوج کے مقام اور کردار کو بہتر بنانا تھا۔ اس سے قبل فوج کے ہیڈ کوارٹر کے بعد اسلامی جمہوریہ ایران کا چیئرمین جوائنٹ چیفس آف آرمی اسٹاف فوج کا اعلیٰ ترین عہدہ تھا۔ فوج کے پہلے کمانڈر جنرل علی شہبازی تھے جن کے بعد خرداد ۱۳۷۹ھ ش کو جنرل محمد سلیمی اس عہدے پر فائز ہوئے اور ماہ شہریور ۱۳۸۴ھ ش کو جنرل عطاءاللہ صالحہ فوج کے کمانڈر بنے۔

---

۱. ارتش کلمہ طیبہ، ۳۱-۳۲
۲. حدیث، ج ۸، ص ۱۸۹
۳. ارتش کلمہ طیبہ، ص ۲۹۳-۲۹۴
۴. ایضاً، ص ۳۷۴

قانونی اور عدالتی امور

۱۳۶۸ھ ش میں پاس ہونے والے آئین کے آرٹیکل ۱۱۰ کے مطابق عدلیہ کے سربراہ کو مقرر یا معزول کرنے کا اختیار رہبر انقلاب اسلامی کو حاصل ہے اور ملزموں کی سزا کو معاف یا اس میں کمی کرنا بھی رہبر انقلاب اسلامی کے دائرۂ اختیار میں آتا ہے۔ رہبر انقلاب اسلامی نے اپنی قیادت و رہبری کے دور کے آغاز میں ملک کے عدالتی نظام کو بہتر بنانے کے لیے بنیادی اصول اور محور مقرر کیے اور ضروری ہدایات دے کر ان کو بیان کیا۔ الٰہی حدود پر عمل درآمد، عدل و انصاف کا قیام، ظلم و ناانصافی کا مقابلہ، عدلیہ اور ججوں کی اصلاح اور خود مختاری، قانون پسندی، حق محوری، مسائل کا جائزہ لینے میں ترجیحات کا تعین، مالی اور دفتری بدعنوانیوں اور اسی طرح رشوت خوری اور کام میں جان بوجھ کر تاخیر کرنے کا مقابلہ، عدالتی کاموں میں سیاسی رجحانات کو روکنا، عوام کے اندر امن و سکون کا احساس پیدا کرنا اور عمل، اطلاع رسانی اور پروپیگنڈے اور تشہیراتی کام میں سنجیدگی کو عدلیہ کے بنیادی اصول اور محور قرار دیا اور مختلف مناسبتوں اور مواقع پر عدالتی حکام کے لیے ان کے پہلوؤں کو بیان کیا اور ان کی تشریح کی[۱]۔ آیت اللہ خامنہ ای کا یہ خیال ہے کہ عدلیہ معاشرے کی صحت اور سلامتی کا معیار ہے اور اگر یہ صحیح و سالم ہو تو وقت کے ساتھ ساتھ ملک کے تمام ادارے اور اسلامی معاشرہ ٹھیک ہو جائے گا[۲]۔

اسلامی حکومت کے بنیادی ترین فرائض میں عدل و انصاف کا قیام شامل ہے۔ اسلامی شریعت کے مطابق نظم و نسق اور عدل و انصاف پر عمل درآمد کرنے والوں کا وجود معاشرے کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا خود نظم و نسق اور عدل و انصاف ہے۔ اس بنا پر اسلامی جمہوریہ ایران میں ولی فقیہ نے جو زمانۂ غیبت میں معصوم کا جانشین ہے، عدلیہ کے سربراہ کو اختیارات سونپے ہیں اور اس کو ججوں کے انتخاب کا اختیار دیا ہے۔ ان کی جانب سے کی گئی تقریروں، ابلاغی پیغامات کی تدابیر، اقدامات اور ہدایت و رہنمائی، بیانات اور پیغامات کو مختصر طور پر پیش کیا جا رہا ہے:

۱۔ ظالم کے خلاف کاروائی:

---

۱. بیانات، ۱۳۶۸/۴/۷؛ وہی حوالہ، ۱۳۶۹/۴/۴؛ وہی حوالہ، ۱۳۷۰/۴/۵؛ وہی حوالہ، ۱۳۷۰/۴/۷؛ وہی حوالہ، ۱۳۷۴/۴/۷؛ وہی حوالہ، ۱۳۷۶/۴/۷؛ وہی حوالہ، ۱۳۸۱/۴/۵؛ وہی حوالہ، ۱۳۸۲/۴/۷؛ وہی حوالہ، ۱۳۸۳/۴/۷

۲. بیانات، ۱۳۶۸/۴/۷

یہ موضوع عدلیہ کے ابتدائی اور ذاتی فرائض و ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای جرم، خلاف ورزی اور دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے خلاف کاروائی کو انصاف کرنے میں عدلیہ کے قبول شدہ کام کی مرہون منت سمجھتے ہیں۔ انہوں نے عدلیہ کے صحیح اور درست کام نہ کرنے کو اس کے اور دیگر اداروں اور معاشرے کے بدعنوانی میں مبتلا ہونے کا سبب قرار دیا۔ ان کے خیال میں اسلامی نظام اور ملت ایران کو عدلیہ کے ادارے سے توقع ہے کہ مظلوم کو یہ امید ہو کہ اسے عدلیہ کی طرف رجوع کرکے انصاف ضرور ملے گا اور ظالم بھی یہ بات بخوبی جانتا ہو کہ عدلیہ کا فولادی ہاتھ کسی بھی لمحے اس کے گریبان تک پہنچ جائے گا[۱]۔ ۷ تیر ۱۳۷۴ کو رہبر انقلاب اسلامی نے عدلیہ کے سربراہ، حکام اور ججوں سے ملاقات میں اس ادارے کی اصلاح اور ظلم کا مقابلہ کرنے کو اس کی شان قرار دیا۔

ماہ تیر ۱۳۷۸ کو عدلیہ کے حکام کے ساتھ ملاقات میں انہوں نے عدلیہ کو ظلم کا بھرپور اور ہمہ گیر مقابلہ کرنے کے لیے اہل اور قابل قرار دیا اور حکام کو اسے اسلامی کرنے کی ہدایت کی۔ ۷ تیر ۱۳۷۹ کو عدلیہ کے حکام اور سات تیر کے شہداء کے اہل خانہ سے ملاقات میں ملک کا انتظام مطلوب طریقے سے چلانے کے لیے نگرانی، جرم کی پہلے سے روک تھام اور امن اور انصاف کے قیام کو عدلیہ کی اہم ترین ذمہ داریاں قرار دیا اور انقلاب کے پیکر پر لگائی جانے والی دشمن کی سنگین ضربوں کو عوام کے صبر و استقامت، طاقت و مضبوطی اور ایمان میں اضافے کا سبب قرار دیا۔ ۷ تیر ۱۳۸۴ کو عدلیہ کے حکام کے ساتھ ملاقات میں تلخ اور ناگوار واقعات اور دشمن کی سیاسی، فوجی، اقتصادی اور ثقافتی سازشوں کا نظام کی جانب سے بھرپور مقابلہ کرنے اور ان سے بھرپور انداز سے باہر نکل جانے کو اسلامی انقلاب کے شجرہ طیبہ کی جڑوں کے صحیح و سالم اور گہرا ہونے کی علامت قرار دیا۔

۲۔ باصلاحیت افراد کو قضاوت کا کام سونپنا:

رہبر انقلاب اسلامی قضاوت کی ذمہ داریوں کو اہل افراد کے سپرد کرنے پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر کسی کو ہر کام نہیں سونپا جا سکتا۔ جن افراد کو اجتماعی اور سماجی ذمہ داریاں اور فرائض سونپے جاتے ہیں

۱۔ بیانات، ۱۳۷۳/۴/۶

ان میں ان کاموں کی صلاحیت اور قابلیت ہونی چاہیے[۱]۔ ۵ تیر ۱۳۷۰ کو عدلیہ کے سربراہ اور حکام سے ملاقات میں جج برادری (ججوں) کو علم، اخلاق اور تقویٰ کی خصوصیات سے آراستہ ایک اہم اور بااثر مجموعہ قرار دیا اور عدل وانصاف کی فراہمی میں اسلامی اصول و معیارات کا خیال رکھتے ہوئے کمال کی جانب حرکت کی ہدایت کی[۲]۔ ۷ تیر ۱۳۷۶ کو عدلیہ کے حکام سے ملاقات میں عدلیہ کو انصاف کی فراہمی اور قانون پر عمل درآمد کا ضامن قرار دیا اور ایک نئے اور ناجائز دولت کے حامل طبقے کو تشکیل پانے سے روکنے میں اس کے کردار کو اہم قرار دیا اور عدلیہ کے ادارے کے معمار شہید بہشتی کو ایک کم نظیر اور علم، تقویٰ، تدبیر اور اعلیٰ انسانی اقدار و اخلاق کی حامل شخصیت قرار دیا[۳]۔ ۷ تیر ۱۳۷۷ کو عدلیہ کے حکام اور کارکنوں سے میں اس ادارے کو نظام کا کارآمد ادارہ اور سلامتی، عدل وانصاف اور قانون پر عمل درآمد کا ضامن قرار دیا اور اس کو کمزور کرنے کو جائز قرار نہیں دیا[۴]۔

۵ تیر ماہ ۱۳۸۱ کو ججوں کے ایک گروپ سے ملاقات میں آگاہی، ہوشمندی، منطق، استدلال اور شجاعت کو جرم کے مقابلے میں ایک جج کی خصوصیات قرار دیا اور فرمایا کہ قاضی کا حکم اتنا مستدل اور مضبوط ہونا چاہیے کہ اس کا ہر سطح پر دفاع کیا جاسکے۔ ۷ تیر ۱۳۸۳ کو عدلیہ کے حکام سے ملاقات میں ایک بار پھر عدل کے قیام اور انصاف کی فراہمی پر زور دیا اور ہدایت کی کہ عدلیہ دولت وثروت، بیوروکریسی کی طاقت، پروپیگنڈے اور تہمت والزام سے متاثر ہوئے بغیر عدل وانصاف کے مکمل قیام کے لیے کوشش کرے۔

۷ تیر ماہ ۱۳۸۶ کو عدلیہ کے سربراہ، حکام اور کارکنوں سے ملاقات میں ہمہ گیر امن وامان کے قیام، قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف بھرپور اور عبرت انگیز کاروائی، انصاف پر عمل درآمد، انصاف کی فراہمی، قانون کی حکمرانی اور منہ زور افراد اور موقع پرستوں کے مقابل استقامت و پائیداری کو اس ادارے کے اہم ترین فرائض اور ذمہ داریوں میں سے قرار دیا اور اقتصادی بدعنوانی میں ملوث افراد کے خلاف سنجیدہ کاروائی کو اقتصادی سلامتی کا لازمہ قرار دیا اور معاشرے میں اقتصادی بدامنی پیدا ہونے کے بہانے بدعنوان

---

۱. خاطرات وحکایتھا، ج ۱، ص۵۶-۵۷
۲. حدیث، ج ۷، ص۱۷۴-۱۷۵
۳. بیانات، ۱۳۷۶/۴/۷
۴. پایگاہ، ب ش

عناصر کے خلاف کاروائی نہ کرنے کی سوچ کی مخالفت کرتے ہوئے اقتصادی بدعنوانی میں ملوث افراد کے خلاف کاروائی کو اقتصادی میدان میں صاف و شفاف طور پر کام کرنے والے افراد کی سلامتی اور سیکورٹی کے ساتھ اقتصادی سرگرمیوں کا پیش خیمہ قرار دیا۔

۷ تیر ماہ ۱۳۸۹ کو عدلیہ کے سربراہ اور حکام سے ملاقات میں اس ادارے کو اسلامی نظام کا ایک انتہائی حساس حصہ قرار دیا اور عدل و انصاف کے راستے سے نہ ہٹنے، سیاسی پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہونے اور قضاوت اور فیصلے سنانے میں حب و بغض کا شکار نہ ہونے کو اس ادارے کے اہم فرائض میں سے قرار دیا۔

۳۔ اسلامی معیارات کے ساتھ عدل وانصاف پر عمل:

کسی بھی حکومت کی بقا اور اس کے دوام کا بنیادی ترین لازمہ عدل و انصاف پر عمل ہے۔ یہ موضوع اسلامی جمہوریہ ایران میں کہ جس کے قیام کی بنیاد دینی تعلیمات ہیں، بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں آیت اللہ خامنہ ای نے عدلیہ کے حکام کو ہدایت کی ہے کہ وہ ارکان کی سلامتی و تحفظ، فیصلوں کی مضبوطی اور عدل و انصاف پر عمل درآمد میں تیزی اور سہولت کو یقینی بنائیں کہ ان کی نظر میں یہ امور بہت ہی اہم اور عدل و انصاف کے قیام میں فیصلہ کن کردار کے حامل سمجھے جاتے ہیں[۱]۔

۷ تیر ماہ ۱۳۶۸ کو عدلیہ کے حکام اور سات تیر کے شہداء کے اہل خانہ کی بیعت کی تقریب میں آیت اللہ خامنہ ای نے عدلیہ کو معاشرے کا معیار اور عوام کا ملجا و ماویٰ قرار دیا اور معاشرے اور ملک کے دیگر اداروں کی اصلاح کو اس کی مطلوب کارکردگی سے مشروط قرار دیا[۲]۔ ۴ تیر ۱۳۶۹ کو عدلیہ کے سربراہ اور حکام سے ملاقات میں اپنی تقریر کے دوران حاضرین سے کہا کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کی عدلیہ کو اپنے لیے نمونہ عمل قرار دیں۔ انہوں نے تیز رفتار انصاف اور مقدموں کا جائزہ لینے میں یقین اور مضبوطی کو عدلیہ کے دو اہم عناصر قرار دیا[۳]۔

---

۱. پایگاہ، ب ش
۲. حدیث، ج ۱، ص ۱۵۰-۱۵۲-۱۵۳
۳. ایضاً، ج ۴، ص ۳۱۲-۳۱۳، ۳۱۶

۷ تیرماہ ۱۳۸۲ کو عدلیہ کے حکام اور ججوں سے ملاقات میں ان کو ہدایت کی کہ وہ خود اعتمادی کے ساتھ اور اصول و قواعد اور معیارات کا خیال رکھتے ہوئے پوری طاقت اور یقین کے ساتھ اپنا کام انجام دیں۔ ا فروردین ۱۳۸۲ کو عدلیہ کے سربراہ اور حکام سے ملاقات میں اس ادارے کی قدرت وطاقت اور ہوشمندی میں اضافے پر تاکید کرتے ہوئے ایک طاقتور اور عیب و نقص سے پاک عدلیہ کے وجود کو معاشرے کی سلامتی کا ضامن قرار دیا اور کمزور اور غیر صحت مند عدلیہ کو معاشرے کی تباہی کا ذمہ دار قرار دیا۔

۵ تیرماہ ۱۳۸۷ کو عدلیہ کے حکام سے ملاقات میں مطلوب منزل کی جانب حرکت، انصاف کی فراہمی کے عرصے کو کم کرنے کی کوشش، فیصلوں کی مضبوطی اور ان میں عیب و نقص کو کم سے کم سطح پر پہنچانے کو عدلیہ کی اہم ترجیحات میں سے قرار دیا اور قید ختم کرنے کی پالیسی کو اچھے کاموں میں سے قرار دیا، اس کے ساتھ ہی ساتھ جیل کی موجودگی کو ایک ایسی حقیقت قرار دیا کہ جو صحیح مینجمنٹ اور مدیریت سے نیکی کی تربیت گاہ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

۴۔ تقرریاں:

عدلیہ میں تقرریاں دو حصوں میں انجام پاتی ہیں:

الف: عدلیہ کے سربراہوں کا تقرر:

آیت اللہ خامنہ ای نے ۲۴ مرداد ماہ ۱۳۶۸ کو آیت اللہ یزدی کو ایک حکم کے ذریعے عدلیہ کا سربراہ مقرر کیا۔ انہوں نے اپنے اس حکم میں ان کو ہدایت کی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عدلیہ کو مکمل اسلامی سانچے میں ڈھالیں اور عدل وانصاف کا حامل بنائیں اور اس کے امور کو چلانے کے لیے عدلیہ کے اندر اور باہر سے مؤمن، عالم اور فرض شناس افراد سے استفادہ کریں[۱]۔

آیت اللہ خامنہ ای نے ۲۳ ماہ مرداد ۱۳۷۳ کو ایک بار پھر آیت اللہ یزدی کو مزید پانچ سال کے لیے عدلیہ کا سربراہ مقرر کر دیا۔ ان کی تقرری کے حکم میں ممتاز، کارآمد اور انقلابی عناصر سے کام لینے اور موقع

۱۔ انتصابها، ۱۳۶۸/۵/۲۴

پرست، لاابالی اور بے بصیرت افراد کو نکالنے، نگرانی کی روش استعمال کرنے اور عدلیہ کی علمی و عملی کیفیت کو بہتر بنانے پر زور دیا گیا ہے[۱]۔

رہبر انقلاب اسلامی نے ۲۳ ماہ مرداد ۱۳۷۸ کو آیت اللہ سید محمود شاہرودی کو عدلیہ کا سربراہ مقرر کیا۔ اس سلسلے میں جاری کیے گئے حکم میں آیا ہے کہ اس ادارے کی سلامتی، طاقت اور مضبوطی اسلامی نظام میں ملک کے تمام اداروں کی سلامتی کا موجب اور تمام لوگوں کی زندگی میں امن و انصاف کے فروغ کا باعث بنتی ہے[۲]۔

۲۳ مرداد ماہ ۱۳۸۳ کو ایک بار پھر آیت اللہ شاہرودی کو مزید پانچ کے لیے عدلیہ کا سربراہ مقرر کیا۔ گزشتہ حکم کی طرح اس حکم میں بھی عدلیہ کی تنظیم نو، اس کے بارے میں منصوبے کو تیار اور اس پر عمل کرنے اور مفید اور مومن عناصر کی تربیت کرنے پر زور دیا گیا ہے[۳]۔

۲۴ مرداد ماہ ۱۳۸۸ کو انہوں نے آیت اللہ صادق آملی لاریجانی کو عدلیہ کا سربراہ مقرر کیا۔ ان کے حکم میں امید ظاہر کی گئی کہ بہت سے بنیادی ڈھانچے تشکیل پانے کے پیش نظر عدلیہ کی ترقی کا دور شروع ہوگا[۴]۔

ب: عدلیہ کے دیگر حکام کا تقرر:

۱۳ دی ۱۳۶۸ کو رہبر انقلاب اسلامی نے علماء کی خصوصی عدالت کے اٹارنی کے عہدے سے علی فلاحیان کے استعفے کے بعد ایک حکم کے ذریعے حجت الاسلام والمسلمین محمد محمدی ری شہری کو اس عہدے پر مقرر کیا۔ ان کی تقرری کے حکم میں عوام کی ہدایت و رہنمائی اور ملکی امور کے استحکام میں دینی علماء کے کردار کے پیش نظر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ایسی کجروی اور خلاف ورزیوں کے سلسلے میں جو بعض علماء نما عناصر سے سرزد ہوں، حساسیت کا مظاہرہ کیا جانا چاہیے اور خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف ٹھوس اور اسلامی احکام کے مطابق کاروائی کی جانی چاہیے[۵]۔

---

۱. ایضاً، ۱۳۷۳/۵/۲۳
۲. ایضاً، ۱۳۷۳/۵/۲۳
۳. انتصابها، ۱۳۸۳/۵/۲۳
۴. ایضاً، ۱۳۸۸/۵/۲۴
۵. حدیث، ج ۳، ص ۱۱۳

۹ بہمن ماہ ۱۳۶۹ کو حجت الاسلام جعفر منتظری اور حجت الاسلام کاظم صدیقی اور حجت الاسلام حسین دادگر کو ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ملکی عدلیہ کا جائزہ لیں اور اس کا معائنہ کریں اور اس سلسلے میں اپنی رپورٹ رہبر انقلاب اسلامی کو پیش کریں[۱]۔

۲۵ آذرماہ ۱۳۷۷ کو حجت الاسلام والمسلمین محسنی اژہ ای کو علماء کی خصوصی عدالت کا سربراہ مقرر کیا۔ ان کی تقرری کے حکم میں اس امید کا اظہار کیا گیا ہے کہ یہ عدالت علماء اور حوزہ ہائے علمیہ کی بنیاد اور تقدس کا دفاع کرے گی اور باخبر اور ہمدرد علماء کے اعلیٰ مقام اور شان کو بدخواہوں سے بچائے گی[۲]۔

علماء کی خصوصی عدالت کی سربراہی سے حجت الاسلام محسنی اژہ ای کے استعفے کے بعد حجت الاسلام محمد سلیمی کو اس عہدے پر مقرر کیا۔ ان کی تقرری کے حکم میں قانون پر عمل درآمد میں مکمل غور اور اسلامی معیارات کا خیال رکھنے اور عدالتی احکام جاری کرنے میں افراط و تفریط سے گریز کرنے پر زور دیا گیا[۳]۔

ایسا لگتا ہے کہ آیت اللہ خامنہ ای ہمیشہ عدلیہ کو فکری اور عملی لحاظ سے ترقی دینے پر زور دیتے ہیں اور اس کام کے لیے قلیل مدت میں ایک جامع پروگرام کی تدوین اور تیاری کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ فقہی لحاظ سے بھی عدالتی احکام کے مضبوط ہونے پر بہت زور دیتے ہیں اس لیے کہ اگر عدالتی احکام کا فقہا جائزہ لیں تو حکم جاری کرنے والے قاضی اور جج کو کوئی تشویش اور پریشانی نہ ہو۔ عدلیہ کی قدرت وطاقت اور اس کی کارکردگی پر معاشرے کے عام اعتماد میں اضافہ بھی رہبر انقلاب اسلامی کی توقعات میں شامل ہے۔

مآخذ

- آثار قدیمہ مرکز اسناد انقلاب اسلامی؛
- آثار قدیمہ مرکز پژوهش و اسناد ریاست جمهوری
- پرونده های دورۂ ریاست جمهوری آیت الله خامنه‌ای؛
- آثار قدیمہ مؤسسۂ پژوهشی فرهنگی انقلاب اسلامی؛

---

۱. ایضاً، ج ۶، ص۱۹۵)
۲. انتصابها، ۱۳۷۷/۹/۲۵
۳. نرم افزار...، ب ش

❖ آشنایی با مجلس شورای اسلامی، به کوشش روابط عمومی مجلس شورای اسلامی، تهران، ۱۳٦۰ ش؛
❖ آقا بزرگ، طبقات اعلام الشیعه، قرن ١٤ ، تهران، ۱۳۸۸ ش؛
❖ ابلاغهای صادرشده از سوی آیت الله خامنه‌ای رهبر معظم انقلاب اسلامی؛
❖ ارتش در نگاه رهبر ،رهنمودهای فرمانده معظم کل قوا حضرت آیت الله خامنه‌ای دربارهٔ ارتش، معاونت تبلیغات و روابط عمومی سازمان عقیدتی سیاسی ارتش جمهوری اسلامی ایران، تهران، ۱۳۷۰ ش؛
❖ ارتش کلمهٔ طیبه، مجموعهٔ رهنمودهای مقام معظم رهبری و فرماندهی کل قوا در دیدار با کارکنان ارتش، سازمان عقیدتی سیاسی ارتش جمهوری اسلامی ایران، تهران، ١٣٨٤ ش؛
❖ از تهاجم فرهنگی تا جنگ نرم، به کوشش حسن بشیر و دیگران، معاونت فرهنگی اجتماعی سازمان بسیج مستضعفین، تهران، ۱۳۸۸ ش؛
❖ از جنوب لبنان تا جنوب ایران، خاطرات سردار سید رحیم صفوی، به کوشش مجید نجف پور، تهران، ۱۳۸۳ ش؛
❖ استاد شهید به روایت اسناد ساواک، به کوشش علی کردی، مرکز اسناد انقلاب اسلامی، تهران، ۱۳۸۳ ش؛
❖ اسناد انقلاب اسلامی، مرکز اسناد انقلاب اسلامی، تهران، ١٣٨٦ ش؛
❖ اسناد نهضت آزادی ایران، نهضت آزادی ایران، تهران، ١٣٦٢ ش؛
❖ اصول و رهیافت های هنر اسلامی در کلام رهبری، به کوشش مجتبی احمدی و دیگران، دانشگاه امام صادق، تهران، ۱۳۸۸ ش؛
❖ اطلاعات روزنامه؛ امام خمینی در آیینهٔ اسناد به روایت ساواک، مؤسسهٔ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، تهران، ١٣٨٦ ش؛
❖ امید انقلاب (هفته نامه)، تهران، ش م ١٤٧ ؛
❖ انقلاب اسلامی به روایت اسناد ساواک، مرکز بررسی اسناد تاریخی، ۱۳۸۵ ش؛

- او به تنهایی یک امت بود، واحد وزارت اطلاعات، تهران، ۱۳۷٦
- فرهنگی بنیاد شهید انقلاب اسلامی، تهران، ۱۳٦۱ ش؛
- بازرگان، مهدی، یادداشتهای روزانه، تهران، ۱۳۷٦ ش؛
- باقری، علی، خاطرات ۱۵ خرداد قم، تهران، ۱۳۸۸ ش؛
- بنی لوحی،علی و دیگران،نبردهای شرق کارون به روایت فرماندهان، تهران،۱۳۸۱ ش؛
- بهبودی، هدایت الله، شرح اسم، زندگی نامهٔ آیت الله خامنه ای، تهران، ۱۳۹۱ ش؛
- بیانات، (بیانات سید علی حسینی خامنه‌ای) ، ۱۳۸۱
- آیت الله خامنه‌ای رهبر معظم انقلاب اسلامی (بیست سال تلاش در مسیر تحقق اهداف انقلاب فرهنگی)، به کوشش ادارهٔ کل روابط عمومی و اطلاع رسانی دبیرخانهٔ شورای عالی انقلاب فرهنگی، تهران، ۱۳۸٤ ش؛
- پا به پای آفتاب، گفته ها و ناگفته ها از زندگی امام خمینی، به کوشش امیررضا ستوده، تهران، ۱۳۸۰ ش؛
- پایگاه اینترنتی دفتر حفظ و نشر آثار آیت الله العظمی خامنه‌ای، پرسش و پاسخ، پیامها فرمانها، حکمهای انتصاب، مصاحبه ها و نامه ها از سوی آیت الله خامنه‌ای رهبر معظم انقلاب اسلامی؛
- تاریخ علمای خراسان، به کوشش میرزاعبدالرحمان، مشهد، ۱۳٤۱ ش؛
- تداوم آفتاب، ویژه نامهٔ آغاز بیستمین سال رهبری حضرت آیت الله خامنه‌ای، روزنامهٔ جام جم، مرداد ۱۳۸۷ ؛
- تقویم تاریخ خامنه‌ای ٦۷ خراسان، به کوشش غلامرضا جلالی، مرکز اسناد انقلاب اسلامی، تهران، ۱۳۷۷ ش؛
- جرعه نوش کوثر، زندگینامهٔ رهبر معظم انقلاب اسلامی، به کوشش مؤسسهٔ فرهنگی قدر ولایت، تهران، ۱۳۸٤ ش؛
- جلالی، غلامرضا، مشهد در بامداد نهضت اسلامی، تهران، ۱۳۷۸ ش؛

❖ ارشاد به روایت اسناد، مرکز اسناد انقلاب اسلامی، تهران، ۱۳۸۸ ش ۱۳٦۸ ش، شم/ ۳ / کیهان، ۲۱ ، انتخاب رهبر در اجلاس فوق العادهٔ مجلس خبرگان ۱۳٦۳۳ ؛
❖ حاج سیدجوادی، فرید، روایت انتخابات، تهران، ۱۳۸٤ ش؛
❖ حدیث ولایت، مجموعهٔ رهنمودهای مقام معظم رهبری، به کوشش دفتر مقام معظم رهبری، سازمان مدارک فرهنگی انقلاب اسلامی، تهران، ۱۳۷۵ ش؛
❖ حسینی خامنه‌ای، سید علی، طرح کلی اندیشهٔ اسلامی، مشهد، بی جا، ۱۳۵٤ ش؛
❖ خاطرات آیت الله مهدوی کنی، به کوشش غلامرضا خواجه سروی، مرکز اسناد انقلاب اسلامی، مصاحبه با هاشم طالب ، جام جم،(خاطرات سه رئیس جمهور) ؛ تهران، ۱۳۸۵ ش
❖ خاطرات سید مرتضی نبوی، به کوشش جواد کامور بخشایش، تهران، ۱۳۸۵ ش؛
❖ خاطرات ماندگار (مجموعه خاطرات پخ ششده از رادیو معارف)، به کوشش احمد اسفندیار، تهران، ۱۳۸٤ ش؛
❖ خاطرات و حکایتها، به کوشش مؤسسهٔ فرهنگی قدر ولایت، تهران، ۱۳۸۳ ش؛
❖ خامنه‌ای، سید علی، طرح کلی اندیشهٔ اسلامی، مشهد، ۱۳۵۱ ش؛
❖ درودیان، محمد، سیری ، مدارک فرهنگی انقلاب اسلامی، تهران، ۱۳٦٤ ؛
❖ در جنگ ایران و عراق، مرکز مطالعات و تحقیقات جنگ، تهران، ۱۳۸۰ ش،
❖ دهقانی فیروزآبادی، جلال، سیاست خارجی جمهوری اسلامی ایران، تهران، ۱۳۸۹ ش؛
❖ دولتهای ایران از میرزا نصرالله خان مشیرالدوله تا میرحسین موسوی، به کوشش علیرضا اسماعیلی و دیگران، سازمان چاپ و انتشارات وزارت فرهنگ و ارشاد اسلامی، تهران، ۱۳۷۹ ش؛
❖ راهبردهای سیاست خارجی، برگرفته از بیانات مقام معظم رهبری، دفتر حفظ و نشر آثار حضرت آیت الله العظمی خامنه‌ای، تهران، ۱۳۹۰ ش؛

- راهبرد حماسه و دریا (گزیده ای از فرمایشات و تدابیر مقام معظم رهبری و فرمانده کل قوا در مورد اهمیت دریا و نیروی دریایی ارتش)، جمهوری اسلامی ایران (رسالت) روزنامه رضوی، مسعود همشهری، تهران، ۱۳۷٦ ش؛
- روز شمار، تاریخ سیاسی ایران از انقلاب تا جنگ، مرکز بررسی اسناد تاریخی وزارت اطلاعات، تهران، ۱۳۸۰
- زندگی نامهٔ مقام معظم رهبری، به کوشش مؤسسهٔ فرهنگی قدر ولایت، تهران، ۱۳۷۷ ش؛
- زنگنه قاسم آبادی، ابراهیم، مشاهیر مدفون در حرم رضوی، عالمان دینی، مشهد، بنیاد پژوهشهای آستان قدس رضوی، مشهد، ۱۳۸۲ ش؛
- سائلی کرده ده، مجید، شورای انقلاب اسلامی ایران، مرکز اسناد انقلاب اسلامی، تهران، ۱۳۸٤ ش؛
- سیمای اسلام ناب محمدی، پیام حضرت آیت الله خامنه‌ای رهبر انقلاب اسلامی به مناسبت سالگرد رحلت جانکاه رهبر کبیر انقلاب و بنیانگذار جمهوری اسلامی حضرت امام خمینی، سازمان چاپ و انتشارات وزارت فرهنگ و ارشاد اسلامی، تهران، ۱۳٦۹ ش؛
- شادلو، عباس، تکثرگرایی در جریان اسلامی، تهران، ۱۳۸۱ ش؛
- شریف رازی، محمد، گنجینهٔ دانشمندان، تهران، ۱۳٥٤ ش؛
- شمس آبادی، حسن، نقش علمای مشهد در انقلاب اسلامی، تهران، ۱۳۸۹ ش؛
- صحیفهٔ امام، مجموعهٔ آثار امام خمینی، مؤسسه تنظیم و نشر آثار امام خمینی، تهران، ۱۳۷۸ ش؛
- صورت مشروح مذاکرات شورای بازنگری قانون اساسی جمهوری اسلامی ایران، به کوشش اداره کل قوانین و ادارهٔ تندنویسی مجلس شورای اسلامی، تهران، ۱۳۸۰ ش؛

❖ صوفی نیارکی، تقی، بیداری اسلامی هویت تمدنی و چالشهای پیش رو در اندیشه های حضرت امام خمینی و رهبر معظم انقلاب حضرت آیت الله خامنه‌ای، مؤسسهٔ پژوهشی فرهنگی انقلاب اسلامی، تهران، ۱۳۹۰ ش؛
❖ علی بابایی، داود، از بازرگان تا خاتمی بیست و پنج سال در ایران چه گذشت ، تهران، ۱۳۸۵ ش؛
❖ فارسی، جلال الدین، زوایای جام جم، ۲۷ ، فراز و نشیب حزب جمهوری اسلامی ؛ تاریک، تهران، ۱۳۷۳ ش ٦٨ خامنه‌ای آذر ۱۳۸٦ ، شم ۵۳۸ ؛
❖ فرهنگ :مسائل و راهبردها از دیدگاه مقام معظم رهبری، ادارهٔ کل پژوهشهای صدا و سیما، تهران، ۱۳۸۲ ش؛
❖ فرهنگ نامه نهادهای انقلاب اسلامی، مرکز اسناد انقلاب اسلامی، تهران، ۱۳۸۷ ش؛
❖ فرهنگ و تهاجم فرهنگی، به کوشش سازمان مدارک فرهنگی انقلاب اسلامی، تهران، ۱۳۷۵ ش؛
❖ قانون اساسی جمهوری اسلامی ایران، ادارهٔ کل قوانین و مقررات کشور، تهران، ۱۳٦۹ ش؛
❖ قاسمپور، داود، دههٔ سرنوشت ساز، مرکز اسناد انقلاب اسلامی تهران؛ قانون اساسی جمهوری اسلامی ایران، ادارهٔ کل قوانین و مقررات کشور، تهران، ۱۳٦۹ ش؛
❖ قصهٔ آفتاب، به کوشش مؤسسهٔ فرهنگی قدر ولایت، تهران، ۱۳۸۱ ش؛
❖ کارنامهٔ ٤ سالهٔ حزب جمهوری اسلامی از تأسیس تا تشکیل اولین کنگره، حزب جمهوری اسلامی، تهران، ۱۳٦۲ ش؛
❖ کسروی، احمد، قیام شیخ محمد خیابانی، تهران، ۱۳۷٦ ش؛
❖ کیهان (روزنامه)؛ گفت وگو با هاشمی رفسنجانی، پیشینه و کارنامهٔ مجمع تشخیص مصلحت نظام، به کوشش عباس بشیری، تهران، ۱۳۸۱ ش؛
❖ گفت وگوی چهارجانبه، تهران، ۱۳۸۲ ش؛
❖ گلشن ابرار، به کوشش جمعی از پژوهشگران حوزهٔ علمیهٔ قم، نشر معروف، ۱۳۷۹ ش؛

- مرادی، عبدالله، گفتمانی از هویت و مؤلفه های بیداری اسلامی بر مبنای بیانات مقام معظم رهبری، مقالات برگزیدهٔ همایش نظریهٔ بیداری اسلامی در اندیشهٔ سیاسی امام خمینی و حضرت آیت الله العظمی خامنه‌ای، به کوشش دبیرخانهٔ همایش نظریهٔ بیداری اسلامی، تهران، نهضت نرم افزاری، ۱۳۹۱ ش؛
- مرجعیت آیت الله خامنه‌ای از دیدگاه فقهاء و بزرگان، به کوشش جمعی از روحانیون و فضلای حوزهٔ علمیهٔ قم، دفتر تبلیغات اسلامی حوزهٔ علمیهٔ قم، ١٤١٥ ق؛
- مشروح مذاکرات جلسهٔ علنی مجلس شورای اسلامی، دورهٔ اول؛ مصاحبه ها، مجموعه مصاحبه های حجت الاسلام و المسلمین سیدعلی خامنه‌ای رئیس جمهور اسلامی ایران در سال ١٣٦٠ ، به کوشش مرکز مدارک فرهنگی انقلاب اسلامی، تهران، ١٣٦٦ ش؛
- مصاحبه ها، مجموعهٔ مصاحبه های حضرت آیت الله سیدعلی خامنه‌ای در دوران ریاست جمهوری، ١٣٦٨ ش؛
- معتمد رضایی، مهدی ، فرهنگی انقلاب اسلامی، تهران، ١٣٦٦ مقالات ، وعدهٔ قرآنی نصرت الهی در بیداری اسلامی از منظر مقام معظم رهبری، برگزیدهٔ همایش نظریهٔ بیداری اسلامی در اندیشهٔ سیاسی حضرت آیت الله العظمی امام خمینی و حضرت آیت الله العظمی خامنه‌ای، به کوشش دبیرخانهٔ همایش نظریهٔ بیداری اسلامی، تهران، نهضت نرم افزاری، ۱۳۹۱ ش؛
- ملکی، عباس، تصمیم گیری در سیاست خارجی، رهیافت تجربی و ابوذر گوهری مقدم فصلنامهٔ سیاست خارجی، زمستان ۱۳۸۱ ش، شم ۲۰ ؛
- منشور دولت اسلامی، بازخوانی مواضع و انتظارات مقام معظم رهبری از قوهٔ مجریه در ١٦ سال گذشته، به کوشش میثم موسی پور و محمدتقی کرامتی، تهران، ١٣٨٤ ش؛
- نرم افزار حدیث ولایت، مجموعه رهنمودهای مقام معظم رهبری حضرت آیت الله العظمی خامنه‌ای مدظله العالی ، مرکز تحقیقات کامپیوتری علوم اسلامی نور؛

❖ نوازنی، بهرام، گاه شمار سیاست خارجی ایران از دی ماه ۱۳۵٦ تا مردادماه ۱۳٦۷ ، مرکز اسناد انقلاب اسلامی، تهران، ۱۳۸۱ ش؛
❖ نیکبخت، رحیم، زندگی و مبارزات آیت الله شهید دکتر محمد مفتح، تهران، ۱۳۸٤ ش؛
❖ ولایتی، علی اکبر، تاریخ سیاسی جنگ تحمیلی عراق علیه جمهوری اسلامی ایران، دفتر نشر فرهنگ اسلامی، تهران، ۱۳۷٦ ش؛
❖ هاشمی رفسنجانی، اکبر، آرامش و چالش؛ کارنامه و خاطرات سال ۱۳٦۲ ، به کوشش مهدی هاشمی، دفتر نشر معارف انقلاب، تهران، ۱۳۸۱ ش؛
❖ هاشمی رفسنجانی، اکبر ، امید و دلواپسی، کارنامه و خاطرات سال ۱۳٦٤ ، به کوشش سارا لاهوتی، دفتر نشر معارف انقلاب، تهران، ۱۳۸۷ ش؛
❖ هاشمی رفسنجانی، اکبر ، انقلاب در بحران، کارنامه و خاطرات سال ۱۳۵۹ ، به کوشش عباس بشیری، دفتر نشر معارف انقلاب، تهران، ۱۳۸٤ ش؛
❖ هاشمی رفسنجانی، اکبر ، انقلاب و پیروزی؛ کارنامه و خاطرات سالهای ۱۳۵۷ و ۱۳۵۸، به کوشش عباس بشیری، دفتر نشر معارف انقلاب، تهران، ۱۳۸۳ ش؛
❖ هاشمی رفسنجانی، اکبر ، بازسازی و سازندگی، کارنامه و خاطرات سال ۱۳٦۸ ، به کوشش علی لاهوتی، دفتر نشر معارف انقلاب، تهران، ۱۳۹۱ ش؛
❖ هاشمی رفسنجانی، اکبر ، دوران مبارزه، به کوشش محسن هاشمی، دفتر نشر معارف انقلاب، تهران، ۱۳۷٦ ش؛
❖ هاشمی رفسنجانی، اکبر ، عبور از بحران، کارنامه و خاطرات سال ۱۳٦۰ ، به کوشش یاسر هاشمی، دفتر نشر معارف انقلاب، تهران، ۱۳۷۸ ش؛
❖ بازرگان، یادداشتهای روزانه، تهران، ۱۳۷٦ ش؛ یاران امام به روایت اسناد ساواک، تهران، مرکز بررسی اسناد تاریخی وزارت اطلاعات، تهران، ۱۳۷٦ ۱۳۸۲ ش؛

❖ یوسفی، بتول، پژوهشی پیرامون مبانی نظری بیداری اسلامی در قرن اخیر با تأکید بر اندیشه های حضرت آیت الله العظمی سیدعلی خامنه‌ای رهبر معظم انقلاب اسلامی، نهضت نرم افزاری وابسته به انتشارات انقلاب اسلامی، تهران، ۱۳۹ ش؛

حجاج بیت اللہ الحرام کے نام اہم پیغام[1]

رہبر معظم انقلاب اسلامی آیت اللہ العظمی سید علی خامنہ ای نے حجاج کرام کے نام اپنے عظیم پیغام میں تمام مسلمانوں اور حجاج کرام کو حج کے گرانقدر اور غنیمت موقع پر اہم اور اصلی ذمہ داریوں کو پہچاننے کی سفارش کرتے ہوئے فرمایا: آج امت اسلامی کی سب سے اہم اور بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ آپس میں محبت والفت اوراخوت وبرادری کے رشتوں کو مضبوط ومستحکم بنائیں، مختلف روپ دھارنے والے استعماری عفریت کے مقابلے میں استقامت کا مظاہرہ کریں اور قول وعمل کے ذریعہ مشرکین سے برائت کا اظہار کریں۔

بسم الله الرحمن الرحيم

حج کا موسم عالم آفاق میں توحید کی ضوفشانی، تابندگی، نورانیت اور معنویت کی فصل بہار ہے؛ حج کا آئین ایسا صاف وشفاف چشمہ ہے جو حاجی کو غفلت اور گناہ کی آلودگیوں سے پاک کرتا ہے، اسے پاک وپاکیزہ بناتا ہے اور خداداد فطرت کی نورانیت کو اس کی روح وجاں میں دوبارہ جلوہ گر کرتا ہے۔ میقات حج میں فخر ومباہات کے لباس کو اتارنا اور سب کا ایک ہی رنگ میں لباس احرام زیب تن کرنا، امت اسلامی کی یکجہتی ویکرنگی کا مظہر اور پوری دنیا میں مسلمانوں کے اتحاد واتفاق کا شاندار نمونہ ہے۔ حج کا نعرہ ایک طرف: "فَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ"[2] اور دوسری طرف "وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاء الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ"[3] کا آئینہ اور اسی طرح کعبہ کلمہ توحید کی نمائندگی کے علاوہ توحید کلمہ اور اسلامی برادری وبرابری کا بھی مظہر ہے۔

دنیا کے گوشہ گوشہ سے جو مسلمان خانہ کعبہ کے طواف اور حرم پیغمبر اکرم (ص) کی زیارت کے ذوق وشوق سے جمع ہوئے ہیں انہیں امت اسلامی کو درپیش دردناک مسائل اور عظیم چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئے اور باہمی اتحاد ویکجہتی کو مزید مضبوط ومستحکم بنانا چاہیے۔ آج اسلام

---

۱. سوم ذی الحجہ الحرام ۱۴۳۰
۲. سورہ بقرہ، ۳۴
۳. سورہ بقرہ، ۲۵

دشمن عناصر کا ہاتھ امت اسلامی میں تفرقہ و اختلاف پیدا کرنے کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ آشکار اور متحرک ہے جبکہ آج امت اسلامی کو اتحاد و یکجہتی اور ہمدردی و ہمدلی کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ آج اسلامی سرزمین پر خونخوار دشمن المناک حادثات کو جنم دے رہے ہیں؛ فلسطین صہیونیوں کے خونخوار پنجوں میں مزید درد و غم میں مبتلا ہے؛ بیت المقدس کو زبردست خطرات کا سامنا ہے؛ غزہ کے مظلوم عوام بے رحمانہ قتل عام کے بعد بھی اسی طرح دردناک اور سخت و دشوار شرائط میں زندگی بسر کررہے ہیں؛ افغانستان میں غاصب و تسلط پسند طاقتیں ہر روز نئے مظالم کے پہاڑ توڑ رہی ہیں؛ عراق میں بد امنی نے لوگوں سے آرام وسکون کو سلب کرلیا ہے؛ یمن میں برادر کشی نے امت اسلامیہ کے دل پر ایک نیا داغ لگا دیا ہے۔

دنیا بھر کے مسلمانوں کو غور و فکر کرنا چاہیے کہ حالیہ برسوں میں عراق، افغانستان اور پاکستان میں رونما ہونے والی دہشت گردی، بے گناہ لوگوں کا قتل عام، بم دھماکوں، جنگوں اور فتنوں کا جو بازار گرم ہے ان کی تکمیل کی سازشیں اور منصوبے کہاں تیار ہورہے ہیں؟ علاقہ میں امریکہ کی ظالم فوج کے تسلط اور داخلے سے قبل علاقہ کی مسلمان قومیں کیوں اس درد و رنج و مصیبت میں مبتلا نہ تھیں؟ تسلط پسند طاقتیں ایک طرف فلسطین، لبنان اور دیگر علاقوں میں عوامی مزاحمتی تحریکوں کو دہشت گرد قرار دیتی ہیں اور دوسری طرف علاقائی قوموں کے درمیان قومی اور مذہبی منافرت پھیلانے والے دہشت گردوں کی حمایت اور رہنمائی کرتی ہیں۔ مشرق وسطی اور شمالی افریقہ کی قومیں برطانیہ، فرانس اور دیگر مغربی ممالک کے استعماری پنجوں میں کئی برسوں تک ذلت و حقارت میں جکڑی رہیں۔ انہوں نے ان کے قدرتی وسائل کو تباہ و برباد کیا، ان کے جذبہ آزادی کو بے رحمی کے ساتھ کچلا اور عرصہ دراز تک علاقائی قومیں غیر ملکی حملہ آوروں کی حرص و طمع کا شکار رہیں، جب اسلامی بیداری اور عوامی مزاحمتی تحریکوں کا آغاز ہوا اور جذبہ شہادت، جہاد فی سبیل اللہ اور الی اللہ جیسے بے مثال عوامل نے بین الاقوامی ستمگروں پر قافیہ حیات تنگ کیا تو استعماری طاقتوں نے مکارانہ پالیسیوں کو تبدیل کرکے اپنی گذشتہ پالیسیوں کی جگہ نئی استعماری پالیسیوں کو اختیار کیا اور اسلام کو شکست دینے کے لئے مختلف روپ دھارنے والا استعماری بھوت آج اپنی تمام توانائیوں کو لے کر میدان میں اتر آیا ہے، فوجی طاقت، آہنی مٹھی، آشکارا و غاصبانہ قبضہ، شیطانی تبلیغات کا سلسلہ، تمام ذرائع ابلاغ کے ذریعہ جھوٹے پروپیگنڈوں اور افواہوں کا منظم سلسلہ، طے شدہ منصوبہ کے تحت

دہشت گردانہ قتل اور ٹارگٹ کلنگ سے لے کر منشیات، بداخلاقی کی تبلیغ و ترویج، جوانوں کے عزم و حوصلہ پر کاری ضرب اور مزاحمتی مراکز پر مکمل سیاسی حملہ، مسلمان بھائیوں کے درمیان قومی اور مذہبی منافرت اور تعصب کو ہوا دینا دشمن کی سازشوں کا اہم حصہ ہے۔

اگر امت اسلامی اور مسلمانوں کے درمیان محبت، حسن ظن، ہمدردی اور ہمدلی پیدا ہو جائے اور تعصب و منافرت کی فضا ختم ہو جائے تو دشمنوں کی سازشوں کا بہت بڑا حصہ خود بخود ختم اور غیر مؤثر ہو جائے گا اور امت اسلامی پر کنٹرول اور تسلط کا ان کا منحوس منصوبہ نقش بر آب اور شکست سے دوچار ہو جائے گا۔

اس عظیم مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حج ایک عظیم موقع ہے۔ مسلمان باہمی تعاون اور قرآن و سنت کے مشترکہ اصولوں پر عمل و اعتماد کرتے ہوئے طاقت اور قدرت حاصل کریں اور مختلف روپ دھارنے والے اس شیطانی عفریت کے مدمقابل کھڑے ہو جائیں اور اس کو اپنے ایمانی جذبے اور پختہ عزم کے ذریعہ مغلوب بنائیں۔ حضرت امام خمینی(رہ) کے دروس کی پیروی میں اسلامی جمہوریہ ایران کامیاب مزاحمت کا اعلی اور شاندار نمونہ ہے۔ دشمنوں کو اسلامی جمہوریہ ایران میں زبردست شکست ہوئی۔ تیس برسوں تک سازش، دشمنی، ۸ سالہ مسلط کردہ جنگ، اقتصادی پابندیاں، ایرانی اثاثہ کا منجمد کرنا، نفسیاتی و تبلیغاتی جنگ، جدید علوم و ٹکنالوجی میں ایران کی پیشرفت و ترقی کو روکنے کی کوشش، پرامن ایٹمی پروگرام کے سلسلے میں گمراہ کن پروپیگنڈے، حتی حالیہ انتخابات میں آشکارا اور واضح مداخلت اور تمام دیگر میدانوں میں دشمن کی تمام کوششیں شکست و ناکامی سے دوچار ہوئی ہیں۔ قرآن مجید کی یہ آیت: إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفاً[1] ایرانیوں کے سامنے دوبارہ مجسم ہو گئی اور دنیا کے ہر گوشہ میں عزم و ایمان پر مبنی مزاحمت نے لوگوں کو مغرور و مستکبر دشمن کے سامنے پھر صف آرا کیا، مؤمنوں کو فتح و کامیابی اور ستمگروں کو ذلت و رسوائی نصیب ہوئی، لبنان میں ۳۳ روزہ نمایاں کامیابی، غزہ میں حالیہ تین برسوں میں کامیاب اور سرافراز جہاد اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے۔

اس الٰہی وعدہ گاہ میں حاضر ہونے والے تمام نیک و سعادتمند حاجیوں بالخصوص اسلامی ممالک کے خطباء، علماء اور حرمین شریفین کے خطباء جمعہ سے میری استدعا ہے کہ وہ مسئلہ کا درست ادراک کریں اور آج

---

۱. سورہ نساء، ۷۶

اپنی ذمہ داری کو اچھی طرح اور فوری طور پر پہچان لیں، اپنی پوری قدرت وتوانائی کے ساتھ دشمنوں کی سازشوں سے اپنے سامعین ومخاطبین کو آگاہ کریں اور عوام کو محبت و الفت اور اتحاد کا درس دیں اور مسلمانوں کے درمیان بدگمانی اور سوء ظن پیدا کرنے والی ہر بات سے پرہیز کریں، جو بھی نعرہ وفریاد و فغاں ہے اس کو امت مسلمہ کے دشمنوں، امریکہ اور صہیونزم کے خلاف زوردار آواز میں بلند کریں اور اپنے قول و عمل کے ذریعہ مشرکین سے برائت کا اظہار کریں۔

اللہ تعالی کی بارگاہ سے اپنے لئے اور آپ سب کے لئے رحمت ونصرت اور مدد طلب کرتا ہوں۔

والسلام علیکم

سید علی حسینی خامنہ ای

حج خالص توحید کا مرکز و محور[1]

تمام بھائیوں اور بہنوں کے لئے سزاوار ہے کہ وہ اس عظیم و گرانقدر سرمایہ پر اپنی توجہ مبذول کریں اور اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ اس معنوی مقام پر مادی زندگی کے بارے میں اپنے دلوں کو مشغول نہ کریں کیونکہ یہ تو ہمارا دائمی مشغلہ ہے۔ اس مقام پر خدا کی یاد، اس کی بارگاہ میں توبہ و استغفار، تضرع و زاری، پاک و پاکیزہ کردار، سچائی اور نیک فکر پر اپنا عزم بالجزم کریں اور خداوند متعال سے اس سلسلے میں مدد و نصرت طلب کریں اور اپنے دل کو توحید اور معنویت کی خالص فضا میں پرواز کا موقع فراہم کریں، خدا کی راہ و صراط مستقیم پر پائیدار رہنے کے لئے توشہ فراہم کریں۔ یہاں حقیقی اور خالص توحید کا مرکز و محور ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم (ع) نے اپنے نفس پر غلبہ پیدا کرتے ہوئے توحید کا سبق دیا اور پروردگار کا حکم بجالانے اور اپنے پارہ جگر کو اس کی راہ میں قربان کرنے کے لئے منی میں حاضر ہوئے اور اپنے اس عمل کو عالمی تاریخ کے تمام موحدوں کے لئے یادگار بنادیا، یہ وہی مقام ہے جہاں سرور کونین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طاقت و دولت کے نشے میں مخمور متکبروں کے سامنے توحید کا پرچم بلند کیا اور خداوند متعال پر ایمان کے ساتھ طاغوتی طاقتوں سے بیزاری کو مسلمانوں کی نجات و رستگاری و فلاح و بہبود کی شرط قرار دیا: فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى...[2]

حج ان عظیم دروس کو یاد کرنے اور سمجھنے کا مقام ہے۔ مشرکوں، بتوں اور بت گروں سے بیزاری و نفرت، مؤمنین کے حج کی روح رواں ہے۔ مؤمنین کی طرف سے اپنے دل کو خدا کے سپرد کرنے کی تلاش و کوشش اور شیطان سے برائت و بیزاری، اس پر رمی کرنا اور اس کے مد مقابل محاذ قائم کرنا حج کے ہر مقام پر نمایاں ہے اور مسلمانوں کے درمیان باہمی اتحاد و انسجام و یکجہتی اور حقیقی اخوت و برادری اور ایمانی طاقت کے جلوے اور قومی و قبائلی اور قدرتی و اعتباری تفاوتوں کے ختم ہونے کے آثار حج کے ہر مقام پر نظر آتے ہیں۔

یہ وہ سبق ہیں جو دنیا کے ہر خطے کے رہنے والے مسلمانوں کو یاد کرنا چاہیے اور ان دروس کی بنیاد پر اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کے پروگراموں کو استوار کرنا چاہیے۔

---

۱. حجاج بیت اللہ الحرام کے نام پیغام، ۲۰۰۷/۱۲/۱۸۔
۲. سورہ بقرہ، ۲۵۶

حج میں شیطان کے خلاف مشترکہ رد عمل[1]

مؤمنین کے درمیان مہر و محبت کی موجودگی امت اسلامیہ کی موجودہ حالت کو بہتر بنانے کی دوسری علامت ہے۔ امت اسلامی کے بعض حصوں میں اختلافات اور تفرقہ ایک خطرناک بیماری ہے اور اس بیماری کا پوری طاقت کے ساتھ علاج ضروری ہے۔ اسلام دشمن عناصر طویل مدت سے اس سلسلے میں اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں اور اب وہ امت اسلامی کی بیداری سے سخت خوف و ہراس میں مبتلا ہیں لہٰذا اس نے امت اسلامی کے درمیان اختلافات کو ہوا دینے کی کوششیں بھی مزید تیز تر کردی ہیں۔ قومی ہمدردی رکھنے والے افراد کا یہی کہنا ہے کہ تفاوتوں کو تضاد میں اور مختلف النوع ہونے کو آپسی دشمنی، جھگڑے اور لڑائی میں نہیں بدلنا چاہیے۔

ایرانی عوام نے اس سال کو اسلامی اتحاد و یکجہتی کا سال قرار دیا ہے یہ نام درحقیقت دشمنوں کے شوم پروپیگنڈوں نیز ان کی طرف سے امت اسلامی کے درمیان اختلافات ڈالنے کی سازشوں کے پیش نظر رکھا گیا ہے۔ دشمن کی یہ سازشیں فلسطین، لبنان، عراق، پاکستان اور افغانستان میں کارگر ثابت ہوئی ہیں جہاں ایک مسلمان ملک کے لوگ اپنے ہی بھائیوں کے خلاف صف آرا ہوگئے اور انہوں نے ایک دوسرے کا خون بہانے پر کمر ہمت باندھ لی، ان تمام تلخ اور دردناک حوادث میں دشمن کی سازشیں آشکار تھیں اور تیز نگاہوں نے ان سازشوں کے پیچھے دشمن کا ہاتھ دیکھ لیا۔

حکم خدا «رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ» کا مطلب یہ ہے کہ آپسی دشمنی اور لڑائیوں کا سلسلہ ختم ہو۔ آپ ان مبارک ایام میں، دنیا کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ سب ایک ہی گھر کے ارد گرد طواف کررہے ہیں، ایک ہی کعبہ کی طرف نماز ادا کررہے ہیں، شیطان کی علامتوں پر مل کر پتھر پھینک رہے ہیں، قربانی کرنے کی منزل میں ایک جیسا عمل انجام دے رہے ہیں، عرفات و مزدلفہ میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر خدا کی بارگاہ میں تضرع وزاری کررہے ہیں، اسلامی مذاہب اصلی ترین فرائض واحکام اور عقائد میں ایک دوسرے کے اس قدر نزدیک ہیں، اس عظیم اتحاد کے بعد معمولی تعصّبات اور قبل از وقت فیصلوں کی بناپر کیوں مسلمانوں کے درمیان فتنہ و فساد اور جھگڑے کی آگ پھیلائی جائے ؟! جبکہ دشمن بھی

۱۔ حجاج بیت اللہ الحرام کے نام پیغام، ۲۰۰۷/۱۲/۱۸

اس آگ پر مزید تیل چھڑکنے کا کام کرتا ہے۔ آج وہ لوگ جو بے عقلی، نادانی اور جہالت کی بنا پر مسلمانوں کے ایک بہت بڑے طبقے پر کفر و شرک کا الزام عائد کرتے ہیں اور ان کا خون بہانا جائز سمجھتے ہیں وہ لوگ سامراجی طاقتوں اور کفر و شرک کی خدمت کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگ جنہوں نے پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کی عزت و تکریم کو کفر و شرک قرار دیا اور وہ خود کافروں اور ستمگاروں کے حامی اور مددگار بن گئے۔ جبکہ پیغمبر اسلام (ص) اور اہلبیت اطہارؑ اور اولیاء خدا کی عزت و تکریم حقیقی دینداری ہے۔

حجاج بیت اللہ الحرام کے نام پیغام[1]

رہبر معظم انقلاب اسلامی حضرت آیت اللہ العظمی خامنہ ای نے حجاج بیت اللہ الحرام کے نام اپنے ایک اہم پیغام میں فریضہ حج کو اجتماعی اور فردی تربیت کے اصلی عناصر کا حامل قرار دیا اور امت مسلمہ کے امید بخش و تابناک و درخشاں افق اور مسلمانوں کے مد مقابل اسرائیلی صیہونزم اور امریکہ کی شکست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: امت مسلمہ خداوند متعال کے سچے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے اپنے ایمان و خلوص، امید و جہاد اور صبر و بصیرت کے ساتھ سب سے دشوار گھاٹیوں اور مراحل سے عبور کر جائے گی۔

اس پیغام کا متن مراسم حج کے دوران صحرائے عرفات میں مشرکین سے برائت کے اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا۔ پیغام کا متن حسب ذیل ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سرزمین وحی نے مؤمنین کے جم غفیر کو اپنی سالانہ ضیافت پر جمع کیا ہے۔ پوری دنیا سے مشتاق روحیں آج قرآن اور اسلام کی پیدائش کے مقام پر حج کے اعمال انجام دے رہی ہیں اور ان میں غور و فکر، بشریت کو اسلام و قرآن کے جاودانہ سبق کی یاد دلاتا ہے اور یہ اعمال خود بھی کام کرنے اور عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں نمایاں اقدام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس درس کا اصلی مقصد انسان کی ابدی سرافرازی اور نجات اور اس کا راستہ انسان کی صحیح تربیت اور صالح معاشرے کی تشکیل ہے۔ وہ انسان جس کے دل اور عمل میں یکتا خدا کی عبادت کے جلوے موجزن ہوں اور وہ اپنے آپ کو شرک، اخلاقی برائیوں اور منحرف خواہشات سے دور رکھے؛ اور ایسا معاشرہ تشکیل دے جس کی تعمیر میں انصاف، حریت، ایمان، نشاط اور انسان کی پیشرفت و زندگی کی تمام علامات موجود ہوں۔

فریضہ حج میں اجتماعی اور فردی تربیت کے اصلی عناصر کو جمع کیا گیا ہے۔ احرام باندھنے اور فردی تشخص سے باہر نکلنے، بہت سی نفسانی خواہشات اور لذات کو ترک کرنے اور خانہ خدا اور کعبہ توحید کے گرد طواف

۱۔ ۴ ذی الحجہ ۱۴۲۹/۱۳ آذر ۱۳۸۷

کرنے، ابراہیم بت شکن اور فداکار کے مقام پر دو رکعت نماز کی ادائیگی، صفا و مروہ کے دو پہاڑوں کے درمیان سعی وتلاش، میدان عرفات میں ہر رنگ و نسل کے توحید پرستوں اور موحدوں کے عظیم اجتماع میں آرام وسکون کی فضا، مشعر الحرام میں رات کا کچھ حصہ عبادت و بندگی اور راز ونیاز میں بسر کرنا اور پھر منی میں حاضر ہونا اور شیطانی علامتوں پر پتھر پھینکنا، قربانی کرنا، غریبوں اور نیازمندوں کو اطعام اور کھانا کھلانا، یہ سب منزلیں تعلیم و تربیت اور مشق و یادآوری کا مظہر ہیں۔ اس کامل مجموعہ میں ایک طرف خلوص و پاکیزگی اور مادی سرگرمیوں سے دوری اور دوسری طرف سعی و کوشش اور استقامت و پائیداری؛ خدا کے ساتھ انس وخلوت، مخلوق خدا کے ساتھ اتحاد، یک رنگی و ہمدلی؛ ایک طرف دل وروح کو آراستہ و پیراستہ کرنا اور دوسری طرف امت اسلامی کے عظیم پیکر میں انسجام پیدا کرنے کی فکر؛ ادھر حق کی بارگاہ میں خشوع، ادھر باطل کے مد مقابل پائیداری واستقامت؛ مختصر یہ کہ یہاں ایک طرف آخرت کی فضا میں پرواز اور دوسری طرف دنیا کو آراستہ بنانے کے لئے عزم راسخ کی تعلیم اور مشق و تمرین متحدہ طور پر ہوتی ہے "ومِنْهُم مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ"[1] یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ اور مناسک حج ،انسانی معاشرے کے لئے قیام و قوام کا باعث اور انسانوں کے لئے عظیم فوائد وبرکات کا سرچشمہ ہیں:"جَعَلَ اللّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَاماً لِّلنَّاسِ"[2] و "لِيَشْهَدُوا مَنافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُوماتٍ"[3]

ہر ملک اور ہر نسل کے مسلمانوں کو آج زیادہ سے زیادہ فریضہ حج کی قدر و قیمت کو جاننا اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے کیونکہ آج امت اسلامی کا افق سب سے زیادہ تابناک و درخشاں ہے اور اسلام نے جو اہداف مسلمان معاشرے اور فرد کے لئے پیش کئے ہیں آج ان تک پہنچنے کی امید پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ گذشتہ دو صدیوں کے دوران مسلمان مغرب کے مادی تمدن اور الحادی مکتبوں کے مقابلے میں شکست واضمحلال سے دوچار رہے ہیں لیکن اب پندرھویں صدی ہجری میں مغرب کے سیاسی اور اقتصادی مکاتب کو شکست و

---

۱. سورہ بقرہ، ۲۰۱
۲. سورہ مائدہ، ۹۷
۳. سورہ حج، ۲۸

ہزیمت اور ناتوانی کا سامنا ہے جبکہ اسلام نے مسلمانوں کی بیداری اور آگاہی کی بدولت ایک نئے، خوشگوار اور تازہ دور کا آغاز کیا ہے جس میں عدل وانصاف، منطق اور توحیدی افکار جلوہ گر ہیں۔

وہ لوگ جو ماضی قریب میں مایوسی و ناامیدی کا زمزمہ کرتے تھے اور مغربی تمدن کے حملے کے سامنے اسلام اور مسلمانوں بلکہ معنویت اور دینداری کی بنیادوں کو ویران سمجھتے تھے آج وہ مغربی تمدن کے حملہ آوروں کے زوال وضعف اور ان کے مقابلے میں اسلام اور قرآن کی سرافرازی کو مشاہدہ کر رہے ہیں اور اپنی زبان اور دل سے اس کی تصدیق وتائید کر رہے ہیں۔

میں مکمل اطمینان سے کہتا ہوں کہ یہ ابھی کام کا آغاز ہے اور حق کی باطل پر فتح کے خداوند متعال کے وعدے کے کامل محقق ہونے اور اسلام کے نئے تمدن اور امت قرآن کی تعمیر و ترقی کا مرحلہ قریب ہے:

"وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصَّالِحاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِي لا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئاً وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذلِكَ فَأُولئِكَ هُمُ الْفاسِقُونَ"[1]

خداوند متعال کے اٹل وعدے کے علائم کا پہلا اور فیصلہ کن مرحلہ ایران میں انقلاب اسلامی کی کامیابی اور اسلام کے بلند و بالا نظام کا قیام تھا جس نے ایران کو اسلامی تمدن و حاکمیت کے مضبوط و مستحکم مرکز میں تبدیل کر دیا۔ یہ معجز نما واقعہ اس وقت رونما ہوا جب اسلام کے خلاف ہر طرف سے سیاسی، فوجی، فکری اور اقتصادی لحاظ سے زہریلے پروپیگنڈوں کا بازار گرم تھا اور انقلاب اسلامی کی کامیابی نے عالم اسلام میں نئی امید اور نیا جذبہ پیدا کر دیا اور زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ اس میں بھی خداوند متعال کی مدد سے مزید استحکام پیدا ہوگیا اور امیدوں کو مزید قوت مل گئی ہے اس واقعہ کو تین عشرے گذر گئے ہیں، مشرق وسطی اور ایشیا اور افریقہ کے مسلمان ممالک اس وقت مخالفت کا کامیاب اسٹیج بن گئے ہیں۔ فلسطین اور اسلامی انتفاضہ، فلسطین میں مسلمان حکومت کی تشکیل، لبنان میں اسرائیل کی غاصب و خونخوار حکومت پر حزب اللہ کی تاریخی فتح؛ اور عراق میں صدام ملعون کی ملحد و ڈکٹیٹر حکومت کی ویرانیوں پر عوامی اور مسلمان حکومت کی تشکیل،

---

۱. سورہ نور، ۵۵

افغانستان اور وہاں کمیونسٹوں اور ان کی آلہ کار حکومت کی ذلت آمیز شکست؛ مشرق وسطی پر تسلط جمانے کے لئے امریکہ کے تمام منصوبوں کی ناکامی و شکست؛ اسرائیل کی صہیونی و غاصب حکومت کے اندر وسیع پیمانے پر اختلافات و بحران؛ علاقہ کے سبھی یا اکثر ممالک میں اسلام کے حق میں عوامی لہر بالخصوص جوانوں اور روشن خیال افراد میں؛ اقتصادی پابندیوں کے باوجود جمہوری اسلامی ایران میں سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں واضح ترقی و پیشرفت؛ اکثر مغربی ممالک میں اقلیتی مسلمانوں میں اسلامی تشخص کا احساس؛ اور اس صدی یعنی پندرھویں صدی میں یہ تمام علامتیں دشمن کے مقابلہ میں اسلام کی پیشرفت اور کامیابی کی واضح علامتیں ہیں۔

بھائیو اور بہنو! یہ تمام کامیابیاں خلوص اور جد و جہد کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہیں، جب خدا کی آواز خدا کے بندوں کے حلق سے نکل کر کان تک پہنچی؛ جب حق کے مجاہدوں کی ہمت و طاقت میدان میں آ گئی؛ اور جب مسلمانوں نے خدا سے کئے ہوئے عہد و پیمان پر عمل کیا، خداوند قادر نے بھی اپنے وعدہ کو پورا کیا اور تاریخ کا راستہ تبدیل ہو گیا:

"أَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُم"[۱]،

"إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ أَقْدامَكُمْ"[۲]،

"وَ لَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيز"[۳]

"إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنا وَ الَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَياةِ الدُّنْيا وَ يَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهادُ"[۴] ابھی یہ ابتدائی مرحلہ ہے، مسلمان قوموں کو ابھی سخت ترین گھاٹیوں سے عبور کرنا ہے اور ایمان، خلوص، امید و جہاد، بصیرت اور صبر کے بغیر ان دشوار گھاٹیوں سے عبور کرنا ممکن نہیں ہوگا، اور خداوند متعال کے وعدے پر مایوسی، ناامیدی، بے صبری، عجلت، بدظنی اور سستی کے اظہار سے یہ راستہ طے نہیں ہو پائے گا۔

---

۱. سورہ بقرہ، ۴۰

۲. سورہ محمد، ۷

۳. سورہ حج، ۴۰

۴. سورہ غافر، ۵۱

زخمی دشمن اپنے تمام وسائل و امکانات کو لیکر میدان میں آگیا ہے اور مزید لے آئے گا، اس صورت میں مسلمانوں کو ہوشیار اور آگاہ رہنا چاہیے اور عقل و خرد، و شجاعت اور موقع و محل کی شناخت کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے اس صورت میں دشمن کی تمام سازشیں اور کوششیں ناکام ہو جائیں گی، امریکہ اور صہیونیزم نے گذشتہ تین عشروں میں اپنی تمام کوششوں کو صرف کیا اپنے تمام وسائل سے کام لیا لیکن پھر بھی انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، اور آئندہ بھی شکست ہی ان کا مقدر ہو گی۔ انشاءاللہ

دشمن کے عمل میں شدت و سختی اس کی کمزوری و ناتوانی کی علامت ہے فلسطین اور بالخصوص غزہ کو مشاہدہ کیجئے۔ اسرائیل کی غیر انسانی حرکت اور اس کی ظالمانہ کاروائیوں کو دیکھئے، ظلم کی تاریخ میں جن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ غزہ کے عوام، غزہ کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے مدمقابل یہ اسرائیل کی شکست و ناتوانی کی علامت ہے۔ غزہ کے لوگ خالی ہاتھوں سے اسرائیل کی غاصب حکومت کے مدمقابل ڈٹے ہوئے ہیں جبکہ اسرائیل کی حمایت امریکہ جیسی ظالم و جابر حکومت کر رہی ہے۔ غزہ کے عوام پر یہ دباؤ حماس کی عوامی حکومت سے انہیں منحرف کرنے کے لئے ہے لیکن غزہ کے عوام نے دشمن کی تمام سازشوں کو اپنے پاؤں تلے روند دیا ہے۔ خداوند متعال کا درود و سلام ہو غزہ کے ان عظیم عوام پر جو دشمن کے مدمقابل چٹان کی طرح کھڑے ہیں غزہ کے لوگ اور حماس حکومت، عملی طور پر قرآن کریم کی ان آیات کی تفسیر پیش کر رہے ہیں:

"وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْ ءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوعِ وَ نَقْصٍ مِنَ الأَمْوالِ وَ الأَنْفُسِ وَ الثَّمَراتِ وَ بَشِّرِ الصَّابِرِينَ"[1]

"الَّذِينَ إِذا أَصابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ راجِعُونَ"[2]

"أُولئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَواتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ أُولئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ"[3]

"لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوالِكُمْ وَ أَنْفُسِكُمْ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذىً كَثِيراً وَ إِنْ تَصْبِرُوا وَ تَتَّقُوا فَإِنَّ ذلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ"۔[1]

---

۱. سورہ بقرہ، ۱۵۵

۲. سورہ بقرہ، ۱۵۶

۳. سورہ بقرہ، ۱۵۷

حق و باطل کے اس معرکہ میں فتح حق کو نصیب ہو گی، فلسطین کی صابر اور مظلوم قوم کو آخر کار دشمن پر فتح و کامیابی حاصل ہو گی "وَ كانَ اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزاً"[۲]۔ فلسطینی عوام کی مقاومت جاری ہے۔ آج امریکی اور بعض یورپی حکومتوں کے انسانی حقوق، جمہوریت اور آزادی کے دعوے جھوٹے اور بے بنیاد ثابت ہو چکے ہیں جس کی بنا پر دنیا میں امریکہ کی آبرو ختم ہو گئی ہے جس کی تلافی و جبران اس کے لئے ممکن نہیں ہو گا اسرائیل کی ظالم حکومت بھی پہلے سے کہیں زیادہ مضمحل اور روسیاہ ہو چکی ہے اور بعض عرب حکومتیں بھی اس عجیب امتحان میں اپنی آبرو کھو چکی ہیں۔ وَ سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ.

والسلام علی عباد اللہ الصالحین

سیّد علی حسینی خامنہ ای

---

۱. سورہ آل عمران، ۱۸۶

۲. سورہ احزاب، ۲۵

اسلامی انقلاب ہدایت کا سرچشمہ[1]

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای نے نماز جمعہ کے خطبوں میں اسلامیہ جمہوریہ ایران کے مقابلے میں عالمی استکبار کی شکست فاش اور اس کے علل اور اسباب کو بیان کرتے ہوئے صدام اور اس کے حامیوں کی طرف سے ایران کے خلاف آٹھ سالہ جنگ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ صدام اور اس کے حامیوں کے اس ناپاک منصوبے کا اصلی مقصد انقلاب اسلامی کو نابود کرنا تھا اس لیے کہ مغربی تجزیہ کار اور رہنما یہ جان چکے تھے کہ اسلامی انقلاب عالم اسلام کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ثابت ہوگا لہٰذا انہوں نے کوشش کی کہ اس انقلاب کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں ایجاد کی جائیں۔

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای نے امریکی اور مغربی حکام کی جانب سے ایران کا اقتصادی محاصرہ کرنے کے خیال خام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ایرانی عوام جنگ کے زمانے میں سخت اقتصادی محاصرے اور پابندیوں کے دور سے گذر کر ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے کہ آج عسکری اعتبار سے خطے میں کسی کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتی اور علمی ترقی اور پیشرفت کے راستے پر گامزن ہے اور ایٹمی ٹکنالوجی کے میدان میں بھی ایرانی عوام نے قابل فخر پیش رفت حاصل کی ہے اور یہ ثابت کردیا ہے کہ استقامت، پائیداری اور روحانی طاقت کے مقابلے میں کسی بھی قسم کے محاصرے کا نتیجہ الٹا ہوتا ہے۔

۱۔ نماز جمعہ کے خطبوں کے دوران، ۲۰۰۷/۰۹/۱۵

اسلام کے سیاسی نظام کو عملی جامہ پہنانا[1]

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای نے اسلامی انقلاب کے اصولوں اور قومی مفادات اور شناخت کے ناقابل تفکیک ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: خارجہ پالیسی کے موجودہ اہم مسائل کا اس زاویہ نگاہ سے بھی جائزہ لیا جانا چاہیے۔

رہبر معظم نے انسان کی ہمہ جہت سعادت کے لیے دین مبین اسلام کے پروگرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اسلامی انقلاب، ایران میں اسلام کے سیاسی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی نظام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آیا ہے اور عالمی روابط کے سلسلے میں بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق ظالمانہ و تسلط پسند نظام کو مسترد کرکے اقوام عالم کی بھلائی، تحفظ اور سعادت کے لیے کوشاں ہے یہی وجہ ہے کہ فطری طور پر عالمی تسلط پسند نظام کے سامنے اسلامی نظام ایک چیلنج ہے اور اس حقیقت کو کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

رہبر معظم نے فرمایا: عالمی ڈپلومیسی، تسلط پسندوں کی نظر میں ایسا شطرنج بورڈ ہے، جس میں بعض ممالک کو تسلط پسند نظام کے سپاہی کا رول ادا کرنا چاہیے اور جب تسلط پسند طاقتوں کے مفادات پورے ہو جائیں تو تسلط پذیر ممالک کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

رہبر معظم نے فرمایا: ہمیں تسلط پسند نظام کا رویہ قطعاً قبول نہیں ہے، البتہ ہمیں خود تسلط پسندی کا کوئی شوق نہیں ہے لیکن کسی بھی مسئلہ میں تسلط قبول نہ کریں گے اور اپنی خارجہ پالیسی کو عالمی تسلط پسند نظام کا مقابلہ اور تسلط پسند اور تسلط پذیر والے قاعدہ سے ہمیشہ الگ رکھیں۔

رہبر معظم انقلاب اسلامی نے تسلط پسندوں کی طرف سے ایران کو سرکش قرار دینے کے پروپیگنڈے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: بڑا شیطان امریکہ عالمی ڈیکٹیٹر شپ قائم کرنے کا خواہاں ہے اور حقیقت میں امریکہ خود اقوام عالم کے فطری حقوق پائمال کرکے انسانی سماج میں سرکش بن گیا ہے لیکن شریف ایرانی

۱۔ وزارت خارجہ کے حکام سے خطاب، ۲۰۰۷/۰۸/۲۱

قوم کو سرکش کہتا ہے۔ ہاں اگر عالمی ستمگروں اور مغروروں سے مقابلہ اور مظلوموں کی حمایت سرکشی ہے تو ہمیں اس پر فخر ہے۔

رہبر معظم انقلاب اسلامی نے صدامی بعثی حکومت کے مد مقابل جنگ میں ایرانی عوام کی فتح کو ایسا تجربہ قرار دیا جس کی روشنی میں عالمی تسلط پسند طاقتوں کو چیلنج کرنے میں اسلامی نظام کی کامیابی کی پیشینگوئی کی جاسکتی ہے۔

آپ نے مزید فرمایا: آٹھ سالہ دفاع مقدس کے حقائق گویا ہیں کہ مشرق و مغرب کی تسلط پسند طاقتیں اور ان کے پٹھو صدام اسلامی نظام کے مد مقابل صف آرا ہوگئے تھے لیکن ایران کی عظیم قوم نے اس ظاہری طاقتور اتحاد کو شکست سے دوچار کردیا اور صدام اور اس کے حامیوں کو ایرانی سرزمین سے باہر نکال دیا۔

حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای نے اسلامی جمہوریہ ایران کی بقا، اس کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت اور علاقائی اور عالمی سطح پر ایران کے مؤثر کردار میں اضافہ کو اقوام عالم اور تسلط پسند طاقتوں کے درمیان مقابلہ کا ایک اور گرانقدر تجربہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: ایران دشمنوں کی طرف سے مختلف اور مسلسل دھمکیوں اور دباؤ کے باوجود علمی، سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور اجتماعی میدان میں دن بدن ترقی وپیشرفت کی جانب گامزن ہے اور یہی حقیقت تسلط پسند طاقتوں کو چیلنج کرنے میں قوم کی حتمی کامیابی کی خوشخبری دیتی ہے۔

رہبر معظم نے اس ضمن میں ایران کے جوان سائنس دانوں کی ایٹمی ٹکنالوجی میں پیشرفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: تمام بااثر ممالک کوشش کرتے رہے کہ ایران ایٹمی ٹکنالوجی کی واحد چار دیواری کے قریب نہ پہنچنے پائے لیکن ایرانی قوم اقتصادی پابندیوں کے باوجود آج اس پیشرفتہ ٹکنالوجی کی مالک بن گئی ہے اور کوئی بھی طاقت کسی بھی صورت میں اسے ہم سے چھین نہیں سکتی۔

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای نے اقوام عالم خصوصا مسلم اقوام کے درمیان اسلامی انقلاب کی بہتر پوزیشن اور مسلم اقوام کی بیداری کو ایک ایسا تجربہ اور حقیقت قرار دیا جو بلاتردید عالمی تسلط پسند طاقتوں کے مقابلہ میں اسلام کی کامیابی کی نشاندہی کرتا ہے۔

آپ نے صہیونی فوج سے ۳۳ روزہ جنگ میں حزب اللہ کی فتح کو عظیم اسلامی طاقت کی ایک علامت اور ایک عجیب عبرت قرار دیا اور مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی حکومت کے روز بروز بگڑتے حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: علاقہ میں تمام امریکی منصوبے ناکام ہوگئے ہیں۔ امریکہ کو عراق، لبنان اور

افغانستان میں سخت ناکامی کا سامنا ہے اور مشرق وسطی میں بڑے شیطان کی اسٹریٹجیک پالیسیوں کی ناکامی مزید واضح تجربات ہیں جو مجموعی طور پر اس بات کی دلیل ہیں کہ اگر ایرانی قوم اور اسلامی نظام کے حکام اپنے ایمان، شادابی اور امیدوں کی حفاظت کریں تو عمل صالح، درست پالیسی اور مسلسل جد وجہد و محنت کے ذریعہ عالمی تسلط پسند نظام کو چیلنج کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اسلامی انقلاب ایرانی قوم کی عزت و عظمت کا مظہر[1]

اسلامی انقلاب کے قائد عظیم الشان آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے ایرانی قوم کے رنج والم اور قاچاری و پہلوی سلطنتوں کے دور میں ایرانی قوم پر غیروں کے تسلط کو یاد کرتے ہوئے فرمایا: انقلاب اسلامی کی کامیابی نے قوم کو ذلت و رسوائی کی زنجیروں سے نجات دلائی اور اس کو حقیقی اقتدار اور عزت و عظمت سے سرافراز کیا۔ رہبر معظم نے اس بات پر تاکید فرمائی کہ امام خمینی علیہ الرحمہ اس قومی عزت اور اقتدار کے حقیقی مظہر اور روح رواں تھے۔ جس دور میں دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں امریکہ اور روس سے ہراساں رہتی تھیں اس دور میں امام خمینی علیہ الرحمہ نے فرمایا: "امریکہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا"۔

رہبر معظم نے فرمایا: امام خمینی رضوان اللہ تعالی علیہ کی استقامت و پائیداری خداوند متعال پر پختہ ایمان اور بھرپور اعتماد کا نتیجہ تھی اور اگر ایرانی قوم بھی حقیقی عزت اور اقتدار کی خواہاں ہے تو اسے بھی ہمیشہ خداوند متعال پر ایمان و یقین رکھتے ہوئے اپنے مستقبل کے سلسلے میں خوش اور پر امید رہنا چاہیے۔

رہبر معظم نے ایرانی قوم کی موجودہ عزت اور اقتدار کو بے مثال قرار دیتے ہوئے فرمایا: ایرانی قوم کے پاس ایٹم بم نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس کے حصول کا ارادہ رکھتی ہے اور پوری دنیا ایرانی عوام کی عزت و سربلندی پر گواہ ہے کیونکہ ایرانی قوم کی عزت و اقتدار، اس کے آہنین عزم وارادہ ونیک کردار، ایمان اور واضح اہداف پر استوار ہے۔

رہبر معظم نے سپاہ پاسداران کو اسلامی انقلاب اور قومی عزت و اقتدار کا محافظ بتایا اور یاد دلایا کہ سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی بھی اپنی قوت ایمانی کی بدولت سرافراز اور سربلند ہے اور یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ اسلامی انقلاب بھی سپاہ کا محافظ و پاسبان ہے۔

۱۔ سپاہ پاسداران سے خطاب، ۲۰۰۷/۰۹/۰۹

مسلمانوں کے درمیان فاصلے دشمن کو اختلاف ڈالنے کا موقع فراہم کرتے ہیں

مسلمانوں کی ایک دوسرے سے دوری دشمنوں کو ان کی صفوں میں اختلاف و تفرقہ ڈالنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ امت اسلامیہ مختلف قوموں، نسلوں اور مذاہب کے ماننے والوں سے تشکیل پائی ہے اور زمین کے حساس اور اہم علاقوں اور الگ الگ جغرافیائی خطوں میں اس کا آباد ہونا اس کے تنوع اور اس کے عظیم پیکر کے لئے ایک مضبوط نقطہ ثابت ہوسکتا ہے اور اس وسیع و عریض دنیا میں امت اسلامیہ کی مشترکہ ثقافت، میراث اور تاریخ کو مزید فعال وکارآمد بنایا جاسکتا ہے اور طرح طرح کی انسانی و فطری قابلیتوں و صلاحیتوں کو مسلمانوں کے لئے بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ مغربی سامراج نے اسلامی ملکوں میں داخل ہوتے ہی اسی نکتہ کو مد نظر رکھا اور اس نے تفرقہ انگیز عوامل کو مسلسل اشتعال دلانے کی کوشش شروع کردی۔

سامراجی سیاستدانوں کو بخوبی یہ معلوم تھا کہ اگر عالم اسلام متحد ہوگیا تو اس پر سیاسی اور اقتصادی تسلّط جمانے کا راستہ مسدود ہوجائے گا لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کے درمیان اختلافات کو ہوا دینے کی ہمہ گیر اور طویل المیعاد کوشش شروع کردی اور اس خبیثانہ سیاست کی آڑ میں انہوں نے لوگوں کی غفلت اور سیاسی و ثقافتی حکمرانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا اور اسلامی ملکوں پر اپنا تسلّط جمانا شروع کردیا۔

گذشتہ صدی میں اسلامی ممالک میں حریت پسندانہ تحریکوں کی سرکوبی اور ان ملکوں پر تسلّط جمانے میں سامراجی طاقتوں کی پیش قدمی اور ان میں استبدادی حکومتوں کا قیام یا ان کی تقویت اور ان کے قدرتی ذخائر کی لوٹ کھسوٹ وانسانی وسائل کی نابودی و تباہی اور اس کے نتیجے میں مسلمان قوموں کو علم و ٹکنالوجی کے قافلے سے پیچھے کردینا یہ سب کے سب سامراجی منصوبے مسلمانوں کے اختلاف و عدم اتحاد کی وجہ سے ممکن ہوئے ہیں جو کبھی کبھی دشمنی، جنگ وجدال اور برادر کشی پر بھی منتج ہوئے ہیں۔ اسلامی بیداری کے آغاز سے مغربی سامراج کو سنگین خطرے کا سامنا ہوا۔ جس کا نقطۂ عروج ایران میں اسلامی جمہوری نظام کا قیام ہے۔

مشرق و مغرب کے سیاسی مکاتب کی شکست اور سامراجی طاقتوں کی اُن اقدار کے غلط ثابت ہونے اور ان کی دھجیاں بکھر جانے سے جنہیں وہ انسانیت کی فلاح وکامیابی کا واحد ذریعہ سمجھتی تھیں مسلمان قوموں کے درمیان اسلامی خود آگہی کی بنیاد مضبوط ہوئی اور اس چراغ الٰہی کو خاموش کرنے اور اس نور کو چھپانے میں

استکباری طاقتوں کی پے در پے ناکامیوں نے مسلمان قوموں کے دلوں میں امید کے درخت کو مضبوط و بارآور بنادیا ہے۔

آج کے فلسطین کو دیکھئے جہاں آج صیہونی قبضے سے آزادی کے جامع اصول پر کاربند حکومت برسر اقتدار آئی ہے اور پھر ماضی میں فلسطینی قوم کی غربت، تنہائی اور ناتوانی سے اس کا موازنہ کیجئے، لبنان پر نگاہ ڈالئے جہاں کے دلیر و فداکار مسلمانوں نے اسرائیل کی مسلّح فوج کو شکست دی جسے امریکہ و مغرب اور منافقوں کی پوری مدد حاصل تھی اور پھر اس کا اُس لبنان سے موازنہ کیجئے کہ صیہونی جب چاہتے تھے اور جہاں تک چاہتے تھے کسی مزاحمت کے بغیر آگے تک چلے جاتے تھے۔

عراق پر نگاہ ڈالئے کہ جس کی غیرت مند قوم نے مغرور امریکہ کی ناک رگڑ دی اور اس کی فوج اور ان سیاستدانوں کو جو کبر و نخوت کے عالم میں عراق پر اپنی مالکیت کا دم بھرتے تھے سیاسی، فوجی اور اقتصادی دلدل میں پھنسا دیا اور پھر اس کا اس عراق سے موازنہ کیجئے جس کے خونخوار حاکم نے امریکہ کی پشت پناہی سے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ افغانستان پر نگاہ ڈالئے جہاں امریکہ اور مغرب کے تمام وعدے فریب اور جھوٹ ثابت ہوئے اور جہاں مغربی اتحادیوں کی غیر معمولی اور بے تحاشا لشکر کشی نے اس ملک کی تباہی و ویرانی اور لوگوں کو غربت زدہ بنانے، ان کا قتل عام کرنے اور منشیات کے مافیا گروہوں کو روز بروز مضبوط بنانے کے سواء اور کچھ نہیں کیا ہے اور سرانجام اسلامی ملکوں میں جوان معاشرے اور پروان چڑھتی ہوئی نسل پر نگاہ ڈالئے جس میں اسلامی اقدار کا رجحان بڑھ رہا ہے اور امریکہ و مغرب سے نفرت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

ان تمام واقعات پر نگاہ ڈالنے سے مغربی استکباری طاقتوں اور ان میں سر فہرست امریکہ کی بد بختی اور شکست خوردہ پالیسیوں کی حقیقی تصویر کو مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور یہ تمام واقعات اس بات کی بشارت دے رہے ہیں کہ امت اسلامیہ متحد ہو رہی ہے۔

تفرقہ انگیزی تاریخی گناہ ہے

آج ہر وہ اقدام جو عالم اسلام میں تفرقہ انگیزی کا باعث ہو تاریخی گناہ ہے۔ وہ لوگ جو دشمنانہ طریقے سے مسلمانوں کے ایک عظیم گروہ کو بے بنیاد بہانوں سے کافر قرار دے رہے ہیں، وہ لوگ جو باطل گمان و خیالات کی بنیاد پر مسلمانوں کے کچھ فرقوں کے مقدسات اور مذہبی مقامات کی اہانت کر رہے ہیں، وہ لوگ جو لبنان کے ان جانباز جوانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپ رہے ہیں جو امت اسلامیہ کی سربلندی اور عالم اسلام کے لئے باعث فخر ہیں وہ لوگ جو امریکہ اور صیہونیوں کی خوشامد کے لئے ہلال شیعی یا شیعہ علاقے (Belt) کے نام سے موہوم خطرے کی باتیں کر رہے ہیں، وہ لوگ جو عراق میں عوامی اور مسلمان حکومت کو ناکام بنانے کے لئے اس ملک میں بدامنی اور برادر کشی کو ہوا دے رہے ہیں، وہ لوگ جو حماس کی حکومت پر ہر طرف سے دباؤ ڈال رہے ہیں جو ملّت فلسطین کی محبوب اور منتخب حکومت ہے، وہ لوگ خواہ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں ایسے مجرم شمار ہوتے ہیں جن سے تاریخ اسلام اور آئندہ کی نسلیں نفرت کریں گی اور انہیں غدار دشمنوں کا پٹھو سمجھیں گی۔

دنیا بھر کے مسلمانوں کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ عالم اسلام کی حقارت و پسماندگی کا دور ختم ہو چکا ہے اور اب نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ خیال باطل ہے کہ مسلمان ملکوں کو ہمیشہ مغرب کے سیاسی و ثقافتی اقتدار کے پنجہ میں اسیر رہنا ہے اور انفرادی و اجتماعی فکر و گفتار و عمل میں مغرب کی ہی تقلید و پیروی کرنا چاہیے اب خود مغرب والوں کے غرور و تکبر و ظلم و ستم اور انتہا پسندی کی وجہ سے یہ تصور مسلمان قوموں کے ذہنوں سے مٹ ہو چکا ہے۔

امت اسلامیہ کا اتحاد اہم ہے[1]

دوسرا نکتہ ہمارے زمانے میں امت اسلامی کا اتحاد ہے۔ یہ اہم نکتہ ہے ہم نے نہ صرف انقلاب کے زمانے سے بلکہ انقلاب سے کئی برس قبل شیعہ اور سنی بھائیوں کے دلوں کو نزدیک کرنے اور سب کو اس اتحاد کی اہمیت سے آگاہ کرنے کی غرض سے کوششیں شروع کی تھیں۔ میں نے بلوچستان میں انقلاب سے برسوں قبل جب میں وہاں شہر بدر کرکے بھیجا گیا تھا، مرحوم مولوی شہداد کو (جو بلوچستان کے معروف علماء میں سے تھے اور بلوچستان کے لوگ ان کو پہچانتے ہیں، فاضل شخص تھے اس زمانے میں سراوان میں تھے اور میں ایران شہر میں تھا) پیغام بھیجا کہ آئیں موقع ہے بیٹھتے ہیں اور اہل سنت و اہل تشیع کے درمیان علمی، حقیقی اور قلبی اور واقعی اتحاد کے اصول بناتے ہیں۔ انہوں نے بھی میری تجویز کا خیر مقدم کیا لیکن بعد میں انقلاب کے مسائل پیش آ گئے، انقلاب کی کامیابی کے بعد ہم نے جو نماز جمعہ کے موضوع پر پہلی کانفرنس کی تھی اس میں مولوی شہداد سمیت اہل سنت کے بعض علماء بھی شریک تھے بحث و گفتگو ہوئی اور ان مسائل پر بھی تبادلہ خیال ہوا۔

تعصّبات کی بنا پر دو طرح کے عقیدوں کے حامیوں میں اختلاف ہونا ایسا امر ہے جو فطری ہے اور یہ شیعہ و سنی سے مخصوص نہیں ہے۔ خود شیعہ فرقوں اور سنی فرقوں کے مابین ہمیشہ سے اختلافات موجود رہے ہیں تاریخ کا جائزہ لیں دیکھیں گے کہ اہل تسنن کے اصولی اور فقہی فرقوں جیسے اشاعرہ، معتزلہ، حنابلہ، احناف اور شافعیہ کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ اسی طرح شیعوں کے مختلف فرقوں کے مابین بھی اختلافات رہے ہیں۔ یہ اختلافات جب عام لوگوں تک پہنچتے ہیں تو خطرناک رخ اختیار کر لیتے ہیں لوگ دست بہ گریباں ہو جاتے ہیں۔ علماء باہم بیٹھتے ہیں، گفتگو کرتے ہیں، بحث کرتے ہیں لیکن جب علمی صلاحیت سے عاری لوگوں کی بات آتی ہے تو وہ جذبات تشدد اور مادی ہتھیاروں کا سہارا لیتے ہیں اور یہ خطرناک ہے۔ دنیا میں یہ ہمیشہ سے رہا ہے مومنین اور خیر خواہ لوگوں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ اختلافات کا سدّ باب کریں،

۱۔ شیعہ سنی علماء سے خطاب، ۲۰۰۷/۰۱/۱۵

علماء اور سربرآوردہ شخصیتوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ عوام میں تصادم نہ ہونے پائے لیکن حالیہ صدیوں میں ایک اور عامل شامل ہوگیاجو استعمار ہے میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ ہمیشہ شیعہ سنی اختلافات سامراج کی وجہ سے تھے ایسا نہیں ہے مسلمانوں کے جذبات بھی دخیل تھے، بعض جہالتیں، بعض تعصّبات، بعض جذبات بعض کج فہمیاں دخیل رہی ہیں لیکن جب سامراج میدان میں اترا تو اس نے اختلافات کے حربے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔

اس بنا پر آپ دیکھتے ہیں کہ سامراج اور استکبار کے خلاف جدوجہد کرنے والی ممتاز شخصیتوں نے امت اسلامیہ کے درمیان اتحاد پر بے حد تاکید کی ہے۔آپ دیکھیں سید جمال الدین اسدآبادی رضوان اللہ علیہ المعروف بہ افغانی اور ان کے شاگرد شیخ محمد عبدہ اور دیگر شخصیتوں اور علماء شیعہ میں سے مرحوم شرف الدین عاملی اور دیگر بزرگوں نے سامراج کے مقابلے میں کس قدر وسیع کوششیں کی ہیں کہ سامراج کے ہاتھ میں یہ آسان وسیلہ عالم اسلام کے خلاف ایک حربے میں تبدیل نہ ہو جائے، ہمارے بزرگ اور عظیم رہنما حضرت امام خمینی (رہ) ابتداء ہی سے امت کے درمیان اسلامی اتحاد پر تاکید کیا کرتے تھے۔

اختلاف پھیلانے والے نہ شیعہ ہیں نہ سنی[1]

آج عراق میں شیعہ اور سنی کو ایک دوسرے کے خلاف لڑانا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں بھی یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ افغانستان میں اگر ممکن ہوتا تو یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایران میں انہیں موقع ملے تو ایسا کریں گے۔ جہاں بھی انہیں موقع ملے وہ یہ کام کریں گے۔ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ سامراج کے آلہ کار لبنان بھی گئے ہیں تاکہ شیعہ اور سنی اختلافات پھیلائیں۔

وہ لوگ جو اختلافات پھیلاتے ہیں وہ نہ شیعہ ہیں نہ سنی، نہ شیعوں سے انہیں کوئی لگاؤ ہے اور نہ سنیوں سے، نہ شیعوں کے مقدسات کو مانتے ہیں اور نہ سنیوں کے، چند دنوں قبل امریکی صدر بش نے اپنی تقریر میں عراق کے شہر سامرا میں حضرت امام علی نقی اور حضرت امام حسن عسکری علیہما السلام کے روضوں میں بم دھماکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سلفیوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا اور شیعوں کو اس طرح بھڑکایا اور اس میں کامیاب بھی رہے، مقدس روضوں میں بم دھماکے امریکیوں کے سامنے ہوئے ہیں، اسی شہر میں حضرات عسکریین علیہماالسلام کے روضوں میں بم دھماکے ہوئے ہیں جو امریکیوں کے قبضہ میں ہے اور امریکہ کی مسلح افواج اس شہر میں گشت کر رہی ہیں۔ امریکیوں کی آنکھوں کے سامنے یہ ہوا ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ امریکیوں کی اطلاع کے بغیر امریکیوں کی اجازت کے بغیر اور امریکیوں کی منصوبہ بندی کے بغیر یہ واقعہ ہوا ہو۔ خود امریکیوں نے یہ کام کیا ہے۔

۱۔ شیعہ سنی علماء سے خطاب، ۲۰۰۷/۰۱/۱۵۔

اسلامی اتحاد غدیر کی روشنی میں[1]

رہبر معظم انقلاب اسلامی حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے مسلمانوں کے درمیان باہمی اتحاد و یکجہتی پر مکمل توجہ رکھنے کو غدیر کا ایک اور عظیم درس قرار دیتے ہوئے فرمایا: حضرت علی(ع) کو پیغمبر اسلام(ص) نے منصوب کیا تھا لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اپنے حق کا مطالبہ کرنے سے ممکن ہے اسلام کو نقصان پہنچے اور اختلاف پیدا ہو جائے تو آپ نے اس کا نہ صرف دعوی نہیں کیا بلکہ وہ لوگ جو اس منصب کے حقدار نہ تھے اور جو زبردستی اور طاقت کے زور پر اسلامی معاشرے پر حکومت کر رہے تھے آپ نے ان کے ساتھ مسلسل تعاون کیا کیونکہ اسلام کو اتحاد کی ضرورت تھی اور اسی وجہ سے حضرت علی(ع) نے اس عظیم فداکاری کو انجام دیا۔

رہبر معظم نے اسی سلسلے میں فرمایا: ایرانی عوام کے پاس آج عالم اسلام میں امامت اور ولایت جیسی قوی، مضبوط اور مستحکم منطق ہے لیکن وہ اپنے حق کے اثبات کو دوسروں کی نفی میں تلاش و جستجو نہیں کرتی اور امیر المؤمنین علی(ع) کی پیروی کرتے ہوئے وحدت و یکجہتی کی علمبردار ہے اور تمام اسلامی مذاہب کو اتحاد اور یکجہتی کی طرف دعوت دیتی ہے۔

رہبر معظم نے امت اسلامیہ کو دشمنوں کے مکر و فریب کے مقابلے میں ہوشیار رہنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا: دشمن عالم اسلام میں اختلاف کا بیج بونے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے اور غدیر کا عظیم درس، اختلاف اور تفرقہ پیدا کرنے والوں کے خلاف جد وجہد پر مبنی ہے اور اس عمل کو انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کے مقدسات کی اہانت کرنے اور ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے سے اجتناب کریں اور جیسا کہ حج کے پیغام میں بیان کیا ہے کہ مسلمان مفکرین امت اسلامی کے درمیان اتحاد اور اسلامی انسجام کو مضبوط و مستحکم بنا کر عالم اسلام کے درمیان اختلاف ڈالنے کے سامراجی طاقتوں کے شوم منصوبوں کو ناکام بنادیں۔

۱۔ عید سعید غدیر کے موقع پر خطاب۔ ۲۰/دسمبر ۲۰۰۶ء

رہبر معظم انقلاب اسلامی نے اسلام دشمن عناصر اور سامراجی طاقتوں کے مکر وفریب کے بارے میں ایرانی عوام کی آگاہی کو انقلاب اسلامی کی کامیابی کا راز قرار دیتے ہوئے فرمایا: ایرانی عوام کا خداوند متعال کی ذات پر ایمان و توکل، ذمہ داری کا احساس، دشمن کے ناپاک منصوبوں کے بارے میں مکمل ہوشیاری و آگاہی کی وجہ سے گذشتہ ۲۹ سالوں میں سامراجی طاقتوں کی تمام گھناؤنی سازشوں کے مقابلے میں ایرانی عوام کی کوششیں کامیاب ہوئی ہیں۔

امت مسلمہ کو نبی اکرم (ص) کے محور پر متحد ہونا چاہیے[1]

رہبر معظم انقلاب اسلامی حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای نے پیغمبر اسلام (ص) کے ساتھ امت اسلامی کے بے پناہ عشق اور والہانہ محبت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امت مسلمہ کو نبی اکرم (ص) کے محور پر متحد ہونے اور دشمنان اسلام کی تفرقہ انگیز اور اختلافات پھیلانے والی سازشوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی۔

رہبر معظم نے اسلامی ممالک کے سفراء کی موجودگی میں اپنے خطاب کے دوران علم و حکمت، تزکیہ نفس و محاسن اخلاق اور عدل و انصاف کو بعثت پیغمبر اکرم (ص) کے تین اہم پیغام قرار دیا اور انسانی معاشرے کی مشکلات اور مصائب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اس وقت تمام انسانوں کو انبیاء الٰہی (ع) کی تعلیمات کی سخت ضرورت ہے اور اسلام و قرآن میں یہ تمام تعلیمات موجود ہیں۔

حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای نے معنوی علوم میں انسانی معاشرے کی پسماندگی اور اخلاق و معنویت سے دوری کو دنیا کی تمام مشکلات اور جنگ و خونریزی کا سرچشمہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: مروت، انصاف، محبت اور اخلاقی پاکیزگی کی طرف اسلام کی دعوت کی تمام قومیں خصوصا تمام ممالک کے اعلی حکام اور ممتاز افراد سخت محتاج ہیں۔

رہبر معظم انقلاب اسلامی نے قیام عدل کو انسان کی ابدی ضرورت اور انبیاء الٰہی (ع) کی بعثت کا دوسرا مقصد قرار دیا اور ایران میں اسلامی معاشرہ کی تشکیل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: بعثت پیامبر اکرم (ص) کے تین اہم پیغامات، یعنی علم، اخلاق اور عدالت ملت ایران کے بنیادی اصولوں اور اساسی اقدار میں شمار ہوتے ہیں اور ہم سب کو ان اصولوں کے تحقق کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ رہبر معظم نے ان اصولوں پر کاربند رہنے اور اسلامی فرائض پر عمل کو گذشتہ اٹھائیس سالوں کی کامیابی کا راز قرار دیتے ہوئے فرمایا: اسلامی اصولوں سے پیچھے ہٹنا، طرح طرح کی مصلحتوں کے جال میں

۱۔ بعثت پیامبر اکرم (ص) کے موقع پر خطاب ۱۱/اگست ۲۰۰۶ء

پھنسنا اور دنیا میں رائج مادی مکاتب فکر کی چار دیواری میں گرفتار ہونا، بے شک ناکامی اور شکست سے دوچار ہونے کا سبب ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔

رہبر معظم انقلاب اسلامی نے فرمایا: انسانی معاشرہ دو بڑی مصیبتوں میں مبتلا ہے اول: وہ غلط راستہ جو اقوام عالم کو نیک بختی اور سعادت کے راستے کے عنوان سے دکھایا جاتا ہے دوم: عالمی امور پر بدترین افراد کا حاکم ہونا۔

رہبر معظم نے انسانی معاشرے کی سب سے بڑی مصیبت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: آج بدترین افراد دنیا کی اصلاح کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں۔امریکہ کی شیطانی اور مستکبر طاقت تمام انسانی معاشروں پر اپنی بے لگام حکومت مسلط کرنے کی کوشش میں مصروف ہے اور اسلام پر دہشت گردی اور بنیاد پرستی کا الزام لگارہی ہے جب کہ مسلمانوں پر ظلم و ستم اور دہشت گردی، جنگ و خونریزی کا اصلی سبب، خود امریکی حکومت ہے۔

حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای نے مسلمانوں میں بیداری، اسلامی شناخت کی طرف بازگشت، اور اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے اندر جرات و ہمت کو مسلم اقوام کے رنج و غم کا علاج قرار دیتے ہوئے فرمایا: امت مسلمہ قرآنی برکات اور اسلام کے نورانی احکام سے بہرہ مند ہے اور امت مسلمہ، پیغمبر خاتم (ص) کے دین سے تمسک کے سایہ میں انسانی حیات کو لاحق تباہ کن خطرات کا مقابلہ کرسکتی ہے۔

سیرت نبوی (ص) کی پیروی اسلامی دنیا کے تمام مسائل کا حل[1]

رہبر معظم انقلاب اسلامی حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای نے آج معاشرے کے مختلف طبقات، مجریہ، مقنّنہ اور عدلیہ کے سربراہوں، تشخیص مصلحت نظام کونسل کے سربراہ، فوجی اور سول حکام اور اسلامی ممالک کے سفراء سے خطاب میں فرمایا: بعثت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانوں کے لئے سب سے بڑی عید ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی، دین وسیاست کو ایک سمجھنا اور عدل و انصاف و تزکیہ و تعلیم کے لئے اسلامی حکومت قائم کرنا آج کی اسلامی دنیا کے تمام مسائل کا حل ہے۔

رہبر معظم نے تزکیہ اور انسانی کمال تک پہنچنے کے لئے رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسلسل کوششوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہونے کے بعد ہمیشہ ظاہری اور باطنی جہاد میں مشغول رہے اور اس امر سے ایک لمحہ بھی غفلت نہیں کی اور نبوی ومدنی معاشرہ تشکیل دے کر دنیا میں عظیم انقلاب کے اسباب فراہم کئے۔

رہبر معظم انقلاب اسلامی نے فرمایا: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یکسان طور پر سیاست، تربیت اور انسانوں کی تعلیم پر توجہ فرمایا کرتے تھے اور یہ اسلام میں دین و سیاست کے ایک ہونے کی دلیل ہے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں سیاست وتدبیر اور مدن کی ذمہ داری غیر مسلم کو نہیں سونپی جاسکتی اور نہ محض اخلاق و روحانیت پر اکتفا کیا جاسکتا ہے۔

رہبر معظم انقلاب اسلامی حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای نے اسلام و سیاست کو الگ سمجھنے والے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ بعض لوگ قرآن کی عبارت پر ایمان لے آتے ہیں لیکن اس کی سیاست پر ایمان نہیں لاتے اور کچھ لوگ اسلام کا سیاست میں خلاصہ کرتے ہیں اور اخلاق وروحانیت سے غافل رہتے ہیں لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں دین وحکومت اور اخلاق وحکومت

۱۔ بعثت کے موقع پر خطاب، ۲۲/اگست ۲۰۰۶ء

کا سرچشمہ قرآن و وحی ہے۔آپ نے کہا اس نکتے کا ادراک اور اس پر عمل کرنا آج امت اسلامی کی ضرورت اور مسلمان قوموں کے تمام مسائل کا حل ہے۔

رہبر معظم انقلاب اسلامی نے فرمایا: آج امت اسلامی کو حقیقی معنی میں اسلامی حکومت تشکیل دینے کی ضرورت ہے تاکہ مسلمان اخلاقی و معنوی کمالات حاصل کرکے علمی و سائنسی،سیاسی،اقتصادی اور ثقافتی میدانوں میں ہمہ گیر ترقی کی راہیں ہموار کرسکیں اور اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں پر اعتماد کرتے ہوئے دشمنوں کے مدمقابل اپنے مفادات کا دفاع کرسکیں۔

پیغمبر عظیم الشان اور صادق آل محمد علیہاالسلام کا یوم ولادت: اتحاد اسلامی کا بہترین ذریعہ

رہبر انقلاب اسلامی آیت اللہ العظمٰی سید علی خامنہ ای نے ملک کے حکام اور وحدت اسلامی کانفرنس کے غیر ملکی مندوبین سے خطاب میں مسلمانوں کے اتحاد پر تاکید کی۔ رہبر انقلاب اسلامی نے فرمایا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے مشترکات پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے اختلافات سے چشم پوشی کریں۔ اپنے خطاب میں انہوں نے ارشاد فرمایا کہ اگر ڈیڑھ ارب عالمی مسلمان، بے پناہ وسائل کے مالک اتنے سارے اسلامی ممالک، یہ غیر معمولی افرادی قوت، اگر یہ عظیم مجموعہ متحد ہو جائے اور اتحاد کے ساتھ اسلامی اہداف کی جانب بڑھنے لگے تو دنیا کی طاقتیں رجز خوانی نہیں کر پائیں گی۔ امریکا دیگر ملکوں، حکومتوں اور قوموں پر اپنی مرضی مسلط نہیں کر پائے گا، خبیث صہیونی نیٹ ورک گوناگوں حکومتوں اور طاقتوں کو اپنے پنجہ اقتدار میں نہیں جکڑ پائے گا اور انہیں اپنے مقصد اور ہدف کے تحت استعمال نہیں کر پائے گا۔ رہبر معظم انقلاب اسلامی کے خطاب کا پورا متن پیش خدمت ہے:

بسم الله الرّحمن الرّحيم

و الحمد لله ربّ العالمين و الصّلاة و السّلام على سيّدنا محمّد و آله الطّاهرين و على صحبه المنتجبين و على من تابعهم باحسان الى يوم الدّين۔

سرور کائنات، کل عالم وجود کے سردار مخلوقات، پیغمبر ختمی مرتبت حضرت محمد بن عبد اللہ اسی طرح فرزند رسول اور روئے زمین پر حجت خدا حضرت ابو عبد اللہ الصادق علیہ السلام کے یوم ولادت باسعادت کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی ہم سب کو، تمام مسلمین کو اور دنیا کے تمام روشن فکر افراد کو یہ توفیق عطا فرمائے کہ ہم ان نعمتوں کی قدر و قیمت کو پہچانیں اور ان عظمتوں کا ادراک کریں، انہیں سمجھیں اور یہ کوشش کریں کہ عالم وجود کے ان ستونوں نے جو صراط مستقیم ہمیں دکھایا ہے اس پر گامزن ہوں۔

پیغمبر اکرم ص کی ذات مقدس کی وجودی اہمیت اس قدر ہے کہ اللہ تعالی نے بشریت کو یہ نعمت عطا فرمائی تو ساتھ ہی ساتھ احسان جتاتے ہوئے فرمایا: لَقَد مَنَّ اللهُ عَلَى المُؤمِنينَ اِذ بَعَثَ فيهِم

رَسولًا مِن اَنفُسِهِم[۱]۔ امام زین العابدین علیہ الصلاۃ و السلام صحیفہ سجادیہ میں اللہ تعالی کی بارگاہ میں فرماتے ہیں: اَلحَمدُ لِلّهِ الَّذی مَنَّ عَلَینا بِمُحَمَّدٍ نَبیِّه دونَ الأُمَمِ الماضیَة وَ القُرونِ السّالِفَة[۲]۔ بشریت کو یہ عظیم عطیہ دیگر اللہ تعالی نے احسان فرمایا ہے۔ یہ نکتہ قرآن کریم اور ائمہ معصومین معصومین کے فرامین میں بڑی صراحت کے ساتھ ذکر ہوا ہے جو بڑی با عظمت بات ہے۔ «رَحمَةً لِلعٰلَمین[۳]» پیغمبر اکرم کی یہ توصیف اللہ تعالی نے فرمائی ہے۔ صرف «لِفِرقَةٍ مِنَ البَشَر» (بشر کی ایک جماعت کے لئے) یا «لِجَمعٍ مِنَ العالَمین» (عالمین میں کچھ لوگوں کے لئے) نہیں کہا، رَحمَةً لِلعٰلَمین فرمایا، سب کے لئے رحمت ہیں۔ پیغمبر اکرم اللہ تعالی کی جانب سے جو پیغام لائے ہیں وہ بشریت کو عطا کر رہے ہیں، یہ بصیرت، یہ صراط مستقیم انہوں نے تمام انسانوں کو دیا ہے۔

البتہ ایسے صاحبان قدرت اور صاحبان زور و زر بھی ہیں جو نہیں چاہتے کہ رحمت الٰہیہ کے اس دستر خوان سے عوام الناس مستفیض ہوں۔ وہ بڑی سختی کے ساتھ مخالفت کرتے ہیں اور اس ملکوتی عمل کا سد باب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالی فرماتا ہے: یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللهَ وَ لا تُطِعِ الکٰفِرینَ وَ المُنٰفِقین[۴] ان کے پیچھے نہ جاؤ، محتاط رہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ جٰهِدِ الکُفّارَ وَ المُنٰفِقینَ وَ اغلُظ عَلَیْهِم[۵] اے پیغمبر کفار و منافقین سے جہاد کرو۔ فرمایا ہے «جاهِد» یہ نہیں فرمایا؛ «قاتِلِ الکُفّارَ وَ المُنافِقین» کیونکہ قتال ہمیشہ ضروری نہیں ہوتا لیکن جہاد ہمیشہ جاری رہنا چاہئے۔

کبھی جہاد سیاسی ہوتا ہے، کبھی جہاد ثقافتی ہوتا ہے، کبھی جہاد نرم جنگ کی شکل میں ہوتا ہے، کبھی جہاد مسلحانہ جنگ کی صورت میں ہوتا ہے، کبھی جہاد ہتھیاروں سے کیا جاتا ہے، کبھی جہاد علم کے ذریعے ہوتا

---

۱. سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۶۴ کا ایک حصہ؛« بے شک اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان کے لئے خود ان کے درمیان سے ایک پیغمبر مبعوث کیا۔»۔

۲. صحیفہ سجّادیّہ، دعائے دوّم « ساری ستائش اس اللہ کے لئے جس نے اپنے نبی محمد (کو ہمارا نبی بنا کر) ہم پر احسان کیا جبکہ ماضی کی امتوں پر یہ احسان نہیں کیا،»۔

۳. سورہ انبیاء، آیت نمبر ۱۰۷ کا ایک حصہ « عالمین کے لئے رحمت ہیں۔»۔

۴. سورہ احزاب، آیت نمبر ۱؛ «اے پیغمبر اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کے حکم کی تعمیل نہ کرو»۔

۵. سورہ توبہ، آیت نمبر ۷۳ کا ایک حصہ «اے پیغمبر کفار و منافقین سے جہاد کرو اور ان سے سختی کرو»۔

ہے۔ یہ سب جہاد کی قسمیں ہیں لیکن ان تمام روشوں میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ جہاد دشمن کے خلاف کیا جارہا ہے، بشریت کے دشمن کے خلاف یہ جہاد کیا جاتا ہے، یہ جہاد ان دشمنوں کے خلاف کیا جاتا ہے جو اپنی طاقت اور دولت کی مدد سے اپنے آپ کو اور اپنی خواہشات کو تمام بشریت پر مسلط کر دینا چاہتے ہیں۔ ایسے دشمنوں سے مفاہمت بے معنی ہے۔ اِتَّقِ اللّٰہَ وَ لا تُطِعِ الکٰفِرینَ وَ المُنٰفِقین[۱].

پیغمبر (ص) کے بارے میں اور آپ کے ذریعے دی جانے والی تعلیمات کے بارے میں، جدید اسلامی معاشرے کی تعمیر کے بارے میں قدم قدم پر پیغمبر اکرم کو ہدایات دینے والی قرآن کی آیات کریمہ بہت زیادہ ہیں۔ ہماری سفارش خود اپنے لئے، اپنے نوجوانوں کے لئے، دینی مبلغین کے لئے اور ان افراد کے لئے جو رائے عامہ تشکیل دینے میں موثر ہیں، یہی ہے کہ ان تمام آیات سے رجوع کریں، قرآن کریم میں ان مفاہیم کا جائزہ لیں، یہ ایک مجموعہ ہے، یہ ایک کامل مجموعہ ہے۔ ہمارے ساتھ مشکل یہی ہے کہ ہم پیغمبر اکرم (ص) کو مخاطب قرار دیکر جو الٰہی تعلیمات دی گئی ہیں اور پیغمبر اکرم کی جو توصیف اللہ تعالی نے فرمائی ہے اس سے غافل رہتے ہیں۔ اگر یہ کامل مجموعہ ہماری نظروں کے سامنے رہے تو وہی صائب روش اور وہی صراط مستقیم جسے پیغمبر اکرم ص نے اپنایا، ہمارے سامنے نمایاں ہوجائے گا۔اِنَّکَ عَلیٰ صِراطٍ مُستَقیم[۲] اس صراط مستقیم کو ہمیں تلاش کرنا ہوگا۔

چونکہ اس نشست میں ہمارے وطن عزیز سے اور دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے برادران و خواہران گرامی، وحدت اسلامی کانفرنس[۳] کے معزز مہمان، اسلامی ملکوں کے محترم سفرا جن کا تعلق مختلف اسلامی مسلکوں، تشیع، تسنن، گوناگوں مکاتب فکر سے ہے، تشریف فرما ہیں، لہٰذا میں اس نشست میں جو بات عرض کرنا مناسب اور ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ برادران عزیز! خواہران گرامی! آج دنیائے اسلام بڑی سخت آزمائشوں میں مبتلا ہے اور ان مشکلات کی راہ حل اسلامی اتحاد ہے۔ اتحاد، امداد باہمی، ایک

---

۱. سورہ احزاب، آیت نمبر ۴۸ کا ایک حصہ۔
۲. سورہ زخرف، آیت نمبر ۴۳ کا ایک حصہ «...تم راہ راست پر ہو»۔
۳. تہران میں منعقدہ تیسویں وحدت اسلامی کانفرنس جو مورخہ ۱۵ دسمبر ۲۰۱۶ سے ۱۷ دسمبر ۲۰۱۶ تک چلی۔

دوسرے سے تعاون، فکری و مسلکی اختلافات سے آگے بڑھ جانا۔ آج عالم اسلام کے بارے میں استکبار اور استعمار کی سوچ یہ ہے کہ دنیائے اسلام کو جہاں تک ممکن ہو اتحاد سے محروم رکھا جائے۔

اگر مسلمان متحد ہو جائیں تو فلسطین کی یہ حالت نہیں رہے گی جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ آج فلسطین کی حالت بہت افسوسناک ہے۔ غزہ کی حالت دگرگوں ہے۔ مغربی اردن کی حالت بھی الگ اعتبار سے خراب ہے۔ ملت فلسطین آج نت نئی سختیاں برداشت کر رہی ہے۔ دشمن چاہتے ہیں کہ مسئلہ فلسطین ہمارے ذہنوں سے تہامٹ نہ جائے، بالکل بھلا دیا جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مغربی ایشیا کا علاقہ، یہی علاقہ جس میں ہمارے ممالک شامل ہیں اور جو غیر معمولی اسٹریٹیجک اہمیت رکھتا ہے، یعنی جغرافیائی اعتبار سے بھی، قدرتی وسائل کے اعتبار سے بھی اور آبی گزرگاہوں کے اعتبار سے بھی یہ بے حد حساس علاقہ ہے، یہ اپنے مسائل میں بری طرح الجھا رہے۔ مسلمان ایک دوسرے کے مد مقابل کھڑے نظر آئیں، ایک عرب دوسرے عرب کے سامنے کھڑا ہو اور ایک دوسرے پر حملہ کریں، ایک دوسرے کو نابود کریں تاکہ مسلمان ممالک کی افواج، خاص طور پر صیہونیوں کے پڑوس میں واقع ملکوں کی افواج روز بروز کمزور ہوتی جائیں، یہ ان کا اہم ہدف ہے۔

اس وقت اس خطے میں دو ارادے ہیں جو ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ ایک ارادہ اتحاد کا ارادہ ہے اور دوسرا تفرقہ و اختلاف کا ارادہ ہے۔ اتحاد کا ارادہ مومنین کا ہے۔ بااخلاص گلوں سے مسلمانوں کے اتحاد و انسجام کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں اور مسلمانوں کو مشترکات کی بنیاد پر متحد ہو جانے کی دعوت دیتی ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے اور یہ اتحاد قائم ہو جائے تو مسلمانوں کی آج جو حالت زار ہے وہ ایسی نہیں رہے گی، مسلمانوں کو وقار حاصل ہوگا۔ آج آپ غور کیجئے کہ ایشیا کے مشرقی ترین علاقوں سے لے کر جہاں میانمار میں مسلم کشی ہو رہی ہے، مغربی افریقا کے نائیجیریا جیسے ممالک تک ہر جگہ مسلمان قتل کئے جا رہے ہیں۔ کہیں وہ بودھ مذہب کے لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں، کہیں بوکو حرام اور داعش جیسی تنظیموں کے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو اس آگ میں گھی ڈالنے کا کام کر رہے ہیں۔ 'برٹش شیعہ' اور 'امریکی سنی' یکساں ہیں۔ یہ سب چاقو کی دو دھاروں کی مانند ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف مشتعل کریں۔ یہ تفرقہ کے ارادے کی آواز ہے جو شیطانی آواز ہے۔ اتحاد کا پیغام یہ ہے کہ سب لوگ اختلافات سے آگے بڑھ جائیں اور ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑے ہو جائیں اور مل کر کام کریں۔

اگر آج آپ استکباری قوتوں کے بیانوں پر غور کریں تو پائیں گے کہ ان میں تفرقے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ قدیم زمانے سے انگریزوں کی سیاست کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ بانٹوں اور راج کرو کی سیاست ہے، تفرقہ پھیلا کر مالک بن جاؤ، جب برطانیہ کی طاقت اپنے عروج پر تھی تو یہ اس کی پالیسی تھی۔ آج یہی پالیسی موجودہ دور کی طاقتوں نے اپنا رکھی ہے۔ خواہ وہ امریکا ہو یا خود برطانیہ جس نے حال میں پھر اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ برطانیہ ہمارے علاقے میں ہمیشہ شر انگیزی کا سرچشمہ رہا ہے، ہمیشہ قوموں کی بدبختی کی وجہ بنتا رہا ہے، اس علاقے میں قوموں کی زندگی کو جو نقصان اس نے پہنچایا ہے، دنیا کے کسی دوسرے علاقے میں کسی بڑی طاقت سے قوموں کو شاید اتنا نقصان نہ پہنچا ہو۔

برصغیر ہند میں جو آج ہندوستان، بنگلادیش اور پاکستان پر مشتمل ہے، الگ انداز سے نقصان پہنچایا، لوگوں پر سختیاں برتیں۔ افغانستان میں الگ انداز سے، ایران میں الگ انداز سے، عراق کے علاقے میں ایک الگ طریقے سے، فلسطین میں تو خیر وہ خباثت آلود اور شوم حرکت کر گزرے اور مسلمانوں کو، پوری ایک ملت کو انہوں نے آوارہ وطن کر دیا، لوگوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کر دیا۔ کئی ہزار سال سے تسلیم شدہ ایک تاریخی ملک جس کا نام فلسطین ہے، برطانیہ کی سیاست کی نذر ہو گیا۔ اس علاقے میں دو ہزار سال یا دو ہزار سال سے کچھ کم تقریبا اٹھارہ سو سال سے لے کر ادھر برطانیہ نے جو کچھ کیا ہے وہ خالص شر انگیزی اور فتنہ و فساد تھا۔ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد وہ برطانوی عہدیدار[1] یہاں آ کر اپنے بیان میں کہتی ہے کہ ایران علاقے کے لئے خطرہ ہے۔ علاقے کے لئے خطرہ ایران ہے؟ کوئی انتہائی بے شرم آدمی ہوگا تبھی علاقے کے لئے ایک طویل عرصے تک بدبختی اور خطرات و مشکلات پیدا کرنے کے بعد آ کر ہمارے مظلوم وطن عزیز پر اس طرح الزام عائد کرے گا۔ یہ انگریز اسی قماش کے افراد ہیں۔

جب سے اس علاقے میں اسلامی بیداری کے آثار نمایاں ہوئے ہیں، اس وقت سے تفرقہ انگیزی کی کوششیں بھی تیز ہو گئی ہیں۔ انگریز تفرقے کو قوموں پر مسلط ہو جانے کا موثر حربہ سمجھتے رہے ہیں۔ جیسے ہی محسوس ہوا کہ علاقے میں نئی باتیں، نئے اسلامی افکار، قوموں کی استقامت، قوموں کی انگڑائی و بیداری نظر آنے لگی ہے۔ دشمنوں نے تفرقہ انگیزی کی کوششیں بھی تیز کر دی ہیں۔ جب ایران میں اسلامی نظام

۱۔ برطانوی وزیر اعظم تھیریزا مے کی بحرین میں منعقدہ خلیج فارس تعاون کونسل کی تقریر کی جانب اشارہ ہے۔

اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا، جس نے پرچم اسلام کو لہرایا، جس نے قرآن اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور فخر یہ اعلان کر دیا کہ ہم اسلام پر عمل کریں گے، جس کے پاس طاقت بھی تھی، سیاست بھی تھی، وسائل بھی تھے، فوج اور مسلح فورسز بھی تھیں، جس کے پاس یہ سب کچھ تھا اور اس نے ان سب کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا اور روز بروز ان وسائل میں نیا اضافہ ہونے لگا تو تفرقہ انگیزی کی یہ کوششیں بہت تیز ہو گئیں۔ دشمنوں نے اس اسلامی تحریک اور اسلامی وقار کا مقابلہ کرنے کے لئے اختلافات کی آگ بھڑکانے کی اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ اسلام ان کے لئے خطرہ تھا۔ جو اسلام قوموں کو بیدار کرے وہ ان کے لئے خطرہ ہے۔ اگر اسلام ہے لیکن اس کے پاس نہ حکومت ہے، نہ فوج ہے، نہ سیاسی ادارہ ہے، نہ پیسہ ہے، نہ عظیم مجاہد قوم ہے، تو یہ ایک الگ صورت حال ہے اور جب اسلام کے پاس یہ تمام وسائل ہوں تو بالکل الگ صورت حال ہوتی ہے۔ اسلامی جمہوریہ کے پاس وسیع سرزمین، مجاہد قوم، جوش وجذبے سے بھری ہوئی مومن اور نوجوان افرادی قوت، زیر زمین ذخائر، دنیا کی اوسط سطح سے زیادہ بلند استعداد اور علم و پیشرفت کی جانب مرکوز پیش قدمی ہے۔ یقیناً ایسا ایران ان دشمنوں کی نظر میں ایک خطرہ ہے۔ اس لئے کہ وہ مسلم اقوام کے لئے نمونہ عمل بن جائے گا، اسی وجہ سے وہ اس سے دشمنی کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ اگر وہ کبھی نرمی برتنے کا دعوی کریں تو وہ دعوی جھوٹا ہے، ان کے تمام اقدامات کا باطنی پہلو تشدد آمیز ہے۔ ان چیزوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے، انہیں پہچاننے کی ضرورت ہے۔ جو دشمن اخلاقیات سے اور دین سے بے بہرہ ہے، جس کے پاس انصاف نہیں ہے، جو اپنا ظاہری روپ تو سنوار لیتا ہے لیکن در باطن ایک حقیقی درندہ ہوتا ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے قوموں کو ہمیشہ تیار رہنا چاہئے۔

ہماری نظر میں آج سب سے اہم تیاری ہے اتحاد بین المسلمین۔ مسلمان اختلافات پیدا کرنے کی طرف سے بہت ہوشیار رہیں، اس سلسلے میں شیعہ اور سنی فرقوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تمام اسلامی فرقوں کو چاہئے کہ اپنے فکری اختلافات کو بے شمار اشتراکات پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے، نظر انداز کریں اور ان سے چشم پوشی کریں۔ پیغمبر اکرم کا مقدس وجود، تمام مسلم اقوام کی محبت و عقیدت کا محور و مرکز ہے۔ پیغمبر سے سب محبت کرتے ہیں، یہ نقطہ اجتماع ہے، یہی اصلی مرکز ہے۔ قرآن تمام مسلمانوں کی توجہ اور عقیدت کا محور ہے۔ کعبہ شریف کا بھی یہی عالم ہے، تو مسلمانوں کے اشتراکات کتنے زیادہ ہیں؟! مسلمانوں کو چاہئے کہ ان اشتراکات پر توجہ دیں، علاقے میں دشمنوں کے آلہ کاروں اور استکبار کے مہروں کو پہچانیں۔ افسوس کا مقام

ہے کہ یہ کھلا ہوا دشمن آ کر ہم سے کہتا ہے کہ تم لوگ آپس میں دشمن ہو، فلاں ملک تمہارے لئے خطرہ ہے۔ یعنی تم ان کے دشمن ہو اور وہ تمہارے دشمن ہیں۔ جو اس طرح کی باتیں کر رہا ہے وہ تو دشمن ہے، ظاہر ہے وہ یہی کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ اس کی باتیں سن رہے ہیں، جو اسلامی شکل و شمائل کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنی زندگی کو اسلامی زندگی کہتے ہیں اور اسلام کے نام پر حکومت کر رہے ہیں وہ اس عہد یدار کی بات کیوں قبول کرتے ہیں؟ اس کی بات کی تصدیق کیوں کرتے ہیں؟ آخر علاقے کی بعض حکومتوں کی روش اسلام کے صریحی دشمنوں اور امت اسلامیہ کے صریحی دشمنوں کی پیروی کی روش کیوں رہے؟

میں اپنی قوم سے، عزیز ملت ایران سے یہ عرض کروں گا کہ واقعی اسلامی جمہوری نظام کی تشکیل کے بعد کے ان برسوں میں، اسی طرح اس جد و جہد کے زمانے میں جو آخر کار اسلامی جمہوری نظام کی تشکیل اور اسلامی انقلاب کی کامیابی پر منتج ہوئی، یہ قوم امتحانوں سے سرخرو ہو کر باہر نکلی ہے۔ عوام کو چاہئے کہ اس راستے کو جو ہمارے عظیم قائد امام خمینی کا راستہ ہے اور انقلاب کا راستہ ہے، ہرگز ترک نہ کریں، اسی راستے پر گامزن رہیں۔ دنیاوی وقار اور آخرت میں عزت کا یہی راستہ ہے، قرآن و عترت سے تمسک کا راستہ، احکام الٰہیہ سے تمسک کا راستہ، دشمنوں کے مقابلے میں ثابت قدمی سے ڈٹ جانے کا راستہ، حقیقت کو برملا بیان کرنے میں کسی رواداری اور تکلف میں نہ پڑنے کا راستہ، حقیقت کے دفاع کا راستہ، یہ وہ راستہ ہے جس پر ہماری قوم چلتی رہی، بحمد اللہ اب تک وہ اسی راستے پر رواں دواں رہی ہے، ملک کے عہد یداران کے پیچھے اسی سمت میں گامزن رہی ہے اور اس نے یہ پرافتخار راستہ اب تک طے کیا ہے، اگر قوم اسی راستے پر آئندہ بھی چلتی رہی اور یہ جد و جہد اسی طرح جاری رہی تو اس قوم کی دنیا و آخرت سنور جائے گی اور دنیا کے دوسرے مسلمان بھی اس سے مستفید ہوں گے۔ ہم تمام مسلمان حکومتوں اور مسلم ممالک کو آپس میں ایک دوسرے کی مدد کی دعوت دیتے ہیں اور یہ دعوت سب کے فائدے میں ہے۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ خداوند عالم تمام امت اسلامیہ، تمام اسلامی ممالک اور تمام اسلامی اقوام پر خیر و رحمت و برکت نازل فرمائے اور اس علاقے کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے۔

والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایران کا اسلامی انقلاب فلسطین کا حامی[1]

ایران میں انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد سامراج نے نئے منصوبے بنائے تاکہ یہ ظاہر کر سکیں کہ یہ انقلاب شیعی انقلاب ہے جبکہ اسلامی انقلاب اسلام کا انقلاب ہے، قرآن کا انقلاب ہے، اسلام کا پرچم لہرانا ہے۔ اسلامی انقلاب کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ اسلامی اقدار، توحید، احکام الٰہی اور اسلام کے روحانی اقدار سے دنیا کو آشنا کر رہا ہے اور کامیاب بھی ہے۔ تمام تر دشمنیوں کے باوجود ہم کامیاب ہوئے ہیں، انقلاب اسلامی نے مسلمانوں میں اسلامی عزت و وقار اور فخر کے جذبات کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ سامراج اس کا مخالف ہے اس کا دشمن ہے ورنہ اگر ہمارا انقلاب ایک شیعی انقلاب ہوتا اور ہم عالم اسلام سے الگ ہو جاتے اور اس سے کوئی سروکار نہ رکھتے تو سامراج بھی ہم سے کوئی سروکار نہ رکھتا اور نہ انقلاب سے دشمنی کرتا لیکن اس نے دیکھا کہ یہ انقلاب اسلامی انقلاب ہے۔

فلسطین کا سب سے مضبوط و مستحکم دفاع اسلامی انقلاب نے کیا، کسی فرد نے، کسی ملک نے، کسی قوم نے، کسی حکومت نے فلسطینیوں کی جدوجہد اور ان کی تحریک انتفاضہ کی ایران کی ملت و حکومت اور اسلامی نظام کی طرح حمایت نہیں کی۔ مادی امداد، اخلاقی امداد، ہم سے جو کچھ ہو سکا کیا۔ جس وقت سابق سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کیا یہ تمام اسلامی حکومتیں جو اس علاقے میں موجود تھیں مختلف تحفظات کی بنا پر خاموش رہیں لیکن امام خمینی(رہ) نے صریحاً روسیوں سے کہا کہ تمہیں افغانستان سے نکلنا ہوگا۔

۱۔ علماء شیعہ و سنی سے خطاب، جنوری ۲۰۰۰ء

فلسطین کی اصلی داستان کیا ہے؟[1]

اصلی داستاں یہ ہے کہ دنیا میں یہودیوں کا ایک بااثر گروہ یہودیوں کے لئے ایک مستقل ملک کی داغ بیل اور بنیاد ڈالنے کی فکر میں تھا۔ان کی اس فکر سے برطانیہ نے اپنی مشکل حل کرنے کے لئے استفادہ کیا۔البتہ یہودی پہلے یوگنڈا جانے اور اس کو اپنا ملک بنانے کی فکر میں تھے۔کچھ عرصہ لیبیا کے شہر طرابلس جانے کی فکر میں رہے طرابلس اس دور میں اٹلی کے قبضہ میں تھا۔اٹلی کی حکومت سے گفتگو کی لیکن اٹلی والوں نے یہودیوں کو منفی جواب دیا۔آخر کار حکومت برطانیہ کے ساتھ یہودی مل گئے۔اس دور میں مشرق وسطی میں برطانیہ کے اہم استعماری مقاصد تھے اس نے کہا ٹھیک ہے یہودی اس علاقہ میں آئیں؛ اور ابتداء میں ایک اقلیت کے عنوان سے وارد ہوں پھر آہستہ آہستہ اپنی تعداد میں اضافہ کریں۔اور مشرق وسطی میں فلسطین کے حساس علاقہ پر اپنا قبضہ جما کر حکومت قائم کرلیں اور برطانیہ کے اتحاد کا حصہ بن جائیں اور اس علاقہ میں عالم اسلام خصوصا عرب ممالک کو متحد نہ ہونے دیں۔وہ دشمن جس کی باہر سے اس قدر حمایت کی جاتی ہے، وہ مختلف طریقوں اور جاسوسی ہتھکنڈوں کے ذریعہ اختلاف پیدا کرسکتا ہے؛ اور آخر اس نے یہی کام کیا: ایک ملک کے قریب ہوجاتا ہے دوسرے پر حملہ کرتا ہے ایک کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے دوسرے کے ساتھ نرمی کرتا ہے، اسرائیل کو پہلے برطانیہ اور بعض دوسرے مغربی ممالک کی مدد حاصل رہی۔ پھر اسرائیل آہستہ آہستہ برطانیہ سے الگ ہوگیا اور امریکہ کے ساتھ مل گیا؛ امریکہ نے بھی آج تک اسرائیل کو اپنے پروں کے سائے میں رکھا ہوا ہے۔یہودیوں نے اس طرح اپنے ملک کو وجود بخشا کہ دوسری جگہوں سے آکر فلسطینیوں کے ملک پر قبضہ کرلیا۔ انہوں نے اس طرح قبضہ کیا کہ پہلے جنگ نہیں کی بلکہ مکرو فریب اور حیلہ کا راستہ اختیار کیا؛ بڑے بڑے فلسطینیوں کی بڑی بڑی اور سرسبز و شاداب زرعی زمینوں کو دگنی قیمت دیکر خریدا جن پر مسلمان کسان کام کرتے تھے ان زمینوں کے مالک یورپ اور امریکہ میں رہتے تھے۔ انہوں نے بھی خدا خدا کرکے زمینوں کو یہودیوں کے حوالے کردیا۔ زمینوں کی فروخت میں بڑے بڑے دلال شامل تھے جن میں سید ضیاء بھی تھا جس کے بارے میں معروف ہے کہ وہ رضا خان کے ساتھ ۱۲۹۹ھ ش کی سازش میں شریک تھا۔یہاں سے فلسطین جاتا اور وہاں دلالی کرتا تھا فلسطینی مسلمانوں سے

۱۔ تہران میں نماز جمعہ کے خطبے، ۱۳۷۸/۱۰/۱۰۔

یہودیوں کے لئے زمینیں خریدتا تھا! یہودیوں نے زمینیں خریدیں؛ زمینیں جب ان کی ملکیت بن گئیں، تو انہوں نے پھر بڑی بے دردی، بے رحمی اور سنگدلی کے ساتھ کسانوں سے وہ زمینیں خالی کرانا شروع کر دیا۔ بعض جگہ فلسطینیوں کو مارتے تھے، قتل کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ مکروفریب اور جھوٹ کے ذریعہ عالمی رائے عامہ کو اپنی طرف مبذول کرلیا کرتے تھے۔

یہودیوں کے فلسطین پر قبضہ کے تین مرحلے ہیں؛ پہلا مرحلہ عربوں کے ساتھ قساوت اور سنگدلی پر مبنی ہے۔ زمینوں کے اصلی مالکوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بہت سخت اور شدید تھا ان کے ساتھ کبھی بھی رحم کو روا نہیں رکھتے تھے۔

دوسرا مرحلہ عالمی رائے عامہ کے ساتھ جھوٹ اور مکروفریب پر مبنی ہے۔ عالمی رائے عامہ کو فریب دینا ان کی عجیب وغریب باتوں میں شامل ہے۔ انہوں نے صہیونی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ فلسطین آنے سے قبل وبعد اس قدر جھوٹ بولا کہ ان کے جھوٹ کی بنیاد پر بعض یہودی سرمایہ داروں کو پکڑ لیا! اور بہت سے لوگوں نے ان کے جھوٹ پر یقین کرلیا؛ یہاں تک کہ فرانس کے رائٹر وسماجی، فلسفی جان پل سیٹر، کو بھی انہوں نے فریب دیدیا۔ اسی جان پل سیٹر نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا میں نے ۳۰ سال پہلے مطالعہ کیا تھا اس نے لکھا تھا " بغیر سرزمین کے لوگ اور بغیر لوگوں کے سرزمین " یعنی یہودی وہ لوگ ہیں جن کے پاس سرزمین نہیں تھی وہ فلسطین آئے جہاں سرزمین تھی لیکن لوگ نہیں تھے! یعنی کیا فلسطین میں لوگ نہیں تھے؟ ایک قوم وہاں آباد تھی کام کاج میں مشغول تھی؛ بہت سے شواہد موجود ہیں۔ ایک غیر ملکی رائٹر لکھتا ہے کہ فلسطین کی تمام سرزمین پر زراعت ہوتی تھی یہ سرزمین تاحد نظر سرسبز وشاداب تھی بغیر لوگوں کے سرزمین کا مطلب کیا؟! دنیا میں یہودیوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ فلسطین ایک ویران جگہ تھی؛ ہم نے آکر اس کو آباد کیا! رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے لئے اتنا بڑا جھوٹ!

وہ ہمیشہ اپنے آپ کو مظلوم ظاہر کرنے کی کوشش کرتے تھے؛ اب بھی ایسا ہی کرتے ہیں! امریکی جرائد مانند ٹائم اور نیوزویک کا کبھی مطالعہ کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اگر ایک یہودی خاندان کسی معمولی حادثہ کا شکار ہو جائے تو اس کا بڑا فوٹو، ہلاک ہونے والے کی عمر اور اس کے بچوں کی مظلومیت کو بہت بڑا بنا کر پیش کرتے ہیں؛ لیکن یہی جرائد مقبوضہ فلسطین میں اسرائیل کی طرف سے فلسطینی جوانوں، عورتوں، بچوں پر

ہونے والے سینکڑوں اور ہزاروں مظالم، قساوت اور سنگدلی کے واقعات کی طرف معمولی سا اشارہ بھی نہیں کرتے ہیں!

تیسرا مرحلہ سازش اور کھوکھلے مذاکرات پر مبنی ہے اور ان کے قول کے مطابق لابی ہے، اس حکومت کے ساتھ، اس شخصیت کے ساتھ، اس سیاستداں کے ساتھ، اس روشن خیال کے ساتھ، اس رائٹر کے ساتھ، اس شاعر کے ساتھ بیٹھو گفتگو کرو! ان کے ملک کا کام اب تک مکر وفریب کے ذریعہ ان تین مرحلوں پر چل رہا ہے۔

اس دور میں بیرونی طاقتیں بھی ان کے ساتھ تھیں؛ جن میں سرفہرست برطانیہ تھا۔ اقوام متحدہ اور اس سے پہلے عالمی معاشرہ «جو جنگ کے بعد صلح کے معاملات کے لئے تشکیل دیا گیا تھا» بھی ہمیشہ اسرائیل کی حمایت کرتا رہا؛ اور اسی سال ۱۹۴۸ء میں جامعہ ملل نے ایک قرارداد منظور کی جس میں فلسطین کو بغیر کسی دلیل اور علت کے تقسیم کر دیا؛ اس قرارداد میں ۵۷ فیصد اراضی کو یہودیوں کی ملکیت قرار دیدیا؛ جبکہ اس سے قبل صرف ۵ فیصد فلسطین کی اراضی یہودیوں سے متعلق تھی؛ انہوں نے حکومت تشکیل دی اور اس کے بعد مختلف مسائل رونما ہوئے جن میں فلسطینی دیہاتوں پر حملہ، شہروں پر حملہ، فلسطینیوں کے گھروں اور بے گناہ لوگوں پر حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا؛ البتہ عرب حکومتوں نے بھی اس سلسلے میں کافی کوتاہیاں کی ہیں۔ کئی جنگیں ہوئیں اور ۱۹۶۷ کی جنگ میں اسرائیل نے امریکہ اور بعض مغربی ممالک کی مدد سے مصر، اردن اور شام کی کچھ سرزمینوں پر بھی قبضہ کر لیا اور ۱۹۷۳ء کی جنگ میں بھی اسرائیلیوں نے مغربی طاقتوں کی مدد سے جنگ کا نتیجہ اپنے حق میں کر لیا اور عربوں کی مزید سرزمین پر اپنا قبضہ جما لیا۔

مسئلہ فلسطین کی اہمیت[1]

البتہ آج بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ مسئلہ فلسطین پر کیوں بحث کرتے ہیں؛ یہ مسئلہ ختم ہوگیا ہے! میں عرض کرتا ہوں کہ مسئلہ فلسطین کسی صورت میں ختم نہیں ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ یہ تصور کریں کہ فلسطین کے اصلی مالک فلسطینی ہمیشہ اپنی اولاد کے ہمراہ اپنی سرزمین سے باہر رہیں گے ؛ یا جو فلسطینی مقبوضہ سرزمین میں ہیں وہ ہمیشہ دبی ہوئی اقلیت کی صورت میں زندگی بسر کریں گے اور غیر ملکی غاصب وہاں ہمیشہ رہیں گے ؛ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ وہ ممالک جو سو سال تک دوسرے ملک کے تصرف میں رہے ہیں انہیں دوبارہ استقلال مل گیا یہی قزاقستان، جارجیااور مرکزی ایشیائی ممالک جنہیں آپ دیکھ رہے ہیں ان میں بعض سوویت یونین اور بعض سویت یونین سے پہلے روس کے قبضے میں تھے جب سویت یونین کا وجود ہی نہیں تھا لیکن ان کو استقلال مل گیا اور وہ اپنے عوام کو مل گئے لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ فلسطین فلسطینیوں کو نہ ملے، یہ کام ضرور ہوگا اور انشاءاللہ ضرور ہو کر رہے گا۔ فلسطین فلسطینی عوام کو مل کر رہے گا لہٰذا مسئلہ ختم نہیں ہوا بلکہ اس قسم کا تصور غلط ہے۔

آج صہیونیوں اور ان کے حامیوں (امریکہ ان کا سب سے بڑا اور اہم حامی ہے) کا مکر وفریب یہ ہے کہ وہ صلح کے خوبصورت اور حسین نام سے استفادہ کرتے ہیں: صلح کیجئے؛ یہ کیسی باتیں ہیں؟ جی ہاں، صلح ایک اچھی چیز ہے؛ لیکن صلح کہاں اور کس سے؟! کوئی شخص آپ کے گھر میں داخل ہو جائے، طاقت کے زور پر آپ کا دروازہ توڑ دے اور آپ کو مارے پیٹے، آپ کے بال بچوں کی توہین کرے اور آپ کے گھر کے تین کمروں میں سے ڈھائی کمروں پر وہ اپنا قبضہ کرکے بیٹھ جائے؛ اور پھر یہ کہے کہ کیوں ادھر ادھر اس کی شکایت کرتے ہو اور مسلسل لڑائی جھگڑا کرتے ہو؛ آؤ ہم صلح کرلیں؛ کیا یہ صلح ہوگی؟ یہ صلح ہے کہ آپ کو آپ کے گھر سے باہر نکال دیا جائے؛ اور اگر آپ گھر پر قبضہ کرنے والے کے خلاف قیام کریں تو اس وقت دشمن کے حامی آئیں اور صلح کرائیں جبکہ غاصب دشمن آپ کے گھر میں بیٹھا ہوا ہے؛ اس نے آپ کے خلاف ہر ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔ آج بھی اسرائیلی حکومت تقریبا روزانہ جنوبی لبنان پر حملہ کرتی ہے؛ مجاہدوں پر حملہ نہیں؛ بلکہ جنوبی لبنان کے دیہاتوں پر، جنوبی لبنان کے مدرسوں پر؛ ابھی کچھ دن قبل اسرائیل نے جنوبی

۱۔ تہران میں نماز جمعہ کے خطبے، ۱۳۷۸/۱۰/۱۰۔

لبنان کے ایک مدرسے پر حملہ کرکے کچھ بچوں کو قتل کردیا ہے! بچوں نے تو کوئی حملہ نہیں کیا تھا، بچوں نے تو ہاتھوں میں اسلحہ نہیں لے رکھا تھا؛ اسرائیل کی ماہیت میں حملہ اور تشدد کا عنصر ہے؛ جب صہیونیوں نے لبنان پر حملہ کیا، تو ڈیر یاسین اور باقی جگہوں کے لوگوں نے تو ان کے ساتھ کچھ نہیں کیا تھا؛ لیکن صہیونیوں نے ان کا بھی قتل عام کیا؛ البتہ عربوں کے کچھ باغیرت جوان ان کے ساتھ اس بات پر لڑ رہے تھے اور یہی کہتے تھے کہ کیوں تم ہمارے گھر میں داخل ہوئے ہو اور لوگوں کا قتل کر رہے ہو؛ وہ لوگ جو صہیونیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے تھے وہ دیہاتی لوگ تھے جنہیں اسرائیل قتل عام کرکے ان کے گھروں سے نکال رہا تھا۔ دیہاتیوں نے تو کوئی کام نہیں کیا تھا؛ لہٰذا معلوم ہوا کہ اسرائیلی حکومت کی ماہیت اور طبیعت میں حملہ، خونخواری اور تشدد موجود ہے۔

اسرائیلی حکومت کی بنیاد اور داغ بیل تشدد، قساوت اور طاقت کے زور پر ڈالی گئی ہے اور اسی بنیاد پر وہ آگے بڑھ رہی ہے اور اس کے بغیر اس کی پیشرفت ممکن نہیں تھی اور آئندہ بھی ممکن نہیں ہوگی۔ کہتے ہیں کہ اس حکومت کے ساتھ صلح کریں؟! کیسی صلح؟! اگر وہ اپنے حق پر قناعت کریں یعنی وہ گھر جو فلسطین کے نام سے ہے وہ فلسطینی عوام کے حوالے کردیں اور اپنے کام میں مشغول ہو جائیں؛ یا فلسطینی حکومت سے اجازت لیں اور کہیں کہ ہم میں سے بعض کو یا سب کو یہاں رہنے کی اجازت دے دیں تو کسی کو ان کے ساتھ جنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی؛ جنگ یہ ہے کہ انہوں نے طاقت کے زور پر دوسروں کے گھر پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے؛ انہوں نے گھر والوں کو گھر سے باہر نکال دیا ہے اور اب بھی ان پر ظلم و تشدد کو روا رکھے ہوئے ہیں؛ علاقائی ممالک پر ظلم کرتے ہیں اور سب کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں؛ لہٰذا وہ صلح کو بھی بعد والے حملے کا مقدمہ بنانا چاہتے ہیں! ایسی صلح برقرار ہو جائے تاکہ یہ صلح ان کے آئندہ حملے کے لئے مقدمہ قرار پاسکے۔

مسئلہ فلسطین کا حل[1]

مسئلہ فلسطین کا راہ حل، جھوٹے اور بے بنیاد طریقوں پر نہیں ہو سکتا بلکہ مسئلہ فلسطین کا راہ حل صرف یہ ہے کہ فلسطین کے حقیقی مالک "نہ باہر سے آنے والے غاصب اور قابض مہاجرین" جو فلسطین کے اندر موجود ہیں اور جو فلسطین کے باہر ہیں وہ اپنے ملک کا حکومتی نظام تشکیل دیں۔ اگر دنیا میں جمہوریت کا دعوی کرنے والوں کی یہ بات درست ہے کہ ہر قوم کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق ہے تو فلسطینی قوم بھی ایک قوم ہے اور اس کو بھی اپنی قسمت کا فیصلہ خود ہی کرنا چاہیے۔ مقبوضہ فلسطین پر آج جو غاصب حکومت قائم ہے اس کا فلسطین کی سرزمین پر کوئی حق نہیں ہے؛ وہ ایک جعلی، جھوٹ پر مبنی اور ظالم طاقتوں کی بنائی ہوئی حکومت ہے؛ لہٰذا فلسطینی عوام سے غاصب حکومت کو سرکاری طور پر تسلیم کرنے کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر عالم اسلام میں کوئی اس غلطی کا ارتکاب کرے گا اور اس ظالم حکومت کو سرکاری طور پر تسلیم کرے گا تو گویا وہ اپنے لئے ذلت و رسوائی کا سامان فراہم کرے گا اور کام بھی بیہودہ اور بے فائدہ کرے گا؛ کیونکہ یہ حکومت دائمی نہیں ہے۔ صہیونیوں نے یہ تصور کر لیا ہے کہ وہ فلسطین پر قابض ہو گئے ہیں اور فلسطین ہمیشہ کے لئے ان کی ملکیت بن گیا ہے؛ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ فلسطین کا فیصلہ یہ ہے کہ حتمی طور پر ایک دن فلسطینی ملک وجود میں آئے گا۔ فلسطینی عوام نے اس سلسلے میں قیام کیا ہے۔ مسلمان حکومتوں اور عوام کا فرض ہے کہ وہ اس فاصلے کو زیادہ سے زیادہ کم کریں اور ایسا کام کریں کہ فلسطینی عوام اس دن تک جلد پہنچ جائیں۔

۱۔ امام خمینی (رہ) کے حرم میں زائرین کے اجتماع سے خطاب، ۱۴/ خرداد ۱۳۸۱۔

مسئلہ فلسطین کا منطقی راہ حل[1]

مسئلہ فلسطین کا منطقی راہ حل موجود ہے۔ منطقی راہ حل ایک ایسا راہ حل ہے جس کو دنیا کے تمام بیدار ضمیر لوگ قبول کرنے کے لئے مجبور ہیں جو دنیا کے آج کے مفاہیم پر یقین رکھتے ہیں۔ اور وہ راہ حل یہ ہے جس کو ڈیڑھ سال پہلے بھی ہم نے پیش کیا تھا اور اسلامی جمہوری حکومت نے بین الاقوامی سطح پر حکومتوں کے ساتھ مذاکرات میں اس حل کو بار بار پیش کیا ہے اور اب بھی ہم اسی کو پیش کریں گے اور اس پر ہم اصرار بھی کریں گے؛ یہ راہ حل خود فلسطینی عوام کے استصواب عامہ (Reffrendom) پر مشتمل ہے؛ وہ فلسطینی جو بے گھر ہوئے ہیں، البتہ وہ لوگ جو اپنے گھر اور اپنے وطن فلسطین میں واپس جانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک منطقی امر ہے۔ جو فلسطینی لبنان، اردن، مصر، کویت اور دوسرے عرب ممالک میں سرگرداں ہیں، یہ لوگ اپنے گھر اپنے وطن فلسطین واپس جائیں؛ جو لوگ جانے کے لئے مائل ہیں؛ ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ کسی کو زور زبردستی سے لائیں۔ اور وہ لوگ جو ۱۹۴۸ء میں "اسرائیل کی جعلی حکومت کی تشکیل سے قبل فلسطین میں موجود تھے چاہے مسلمان ہوں، عیسائی ہوں یا یہودی ہوں ان سے ایک عام ریفرنڈم کرایا جائے اور وہ فلسطین کی سرزمین پر عوامی اور جمہوری حکومت کا نظام عمل میں لائیں؛ یہ جمہوری قدم ہے اگر پوری دنیا کے لئے ڈیموکریسی اچھی ہے تو فلسطینی عوام کے لئے ڈیموکریسی کیوں اچھی نہیں ہے؟! اگر دنیا کے تمام لوگوں کو اپنی قسمت معین کرنے کا حق حاصل ہے، تو پھر فلسطینی عوام کو یہ حق کیوں حاصل نہیں؟! کسی کو بھی اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ فلسطین کی موجودہ حکومت کو طاقت اور مکر و فریب کے ذریعہ وجود بخشا گیا ہے اور اس میں کسی کو کوئی تردید نہیں ہے کہ صہیونی صلح آمیز طریقے سے نہیں آئے ہیں؛ بلکہ کچھ مکر و فریب کے ذریعہ اور کچھ طاقت کے ذریعہ آئے ہیں۔ اسرائیلی حکومت کا قیام دباؤ کے تحت ہوا ہے۔ بہت خوب، فلسطینی عوام جمع ہوں، ووٹ ڈالیں، فلسطین میں جو حکومت نظام سنبھالے اس کا انتخاب کریں؛ وہ حکومت تشکیل پا جائے، اور پھر وہ حکومت ان لوگوں کے بارے میں فیصلہ کرے جو ۱۹۴۸ء کے بعد فلسطین میں آئے ہیں۔ فلسطین کی عوامی حکومت ان کے وہاں رہنے کے بارے میں فیصلہ کرے تو وہ وہاں رہیں اور اگر ان کے جانے کے بارے میں فیصلہ کرے تو وہ وہاں سے چلے جائیں۔ یہ عوامی رائے بھی ہے اور

۱۔ تہران میں نماز جمعہ کے خطبوں میں، ۱۳۸۱/۱/۱۶۔

ڈیموکریسی بھی ہے۔اس میں حقوق انسانی بھی ہے اور دنیا کی موجودہ منطق کے مطابق بھی ہے۔ یہ ایک منطقی راہ حل ہے جس کو عملی ہونا چاہیے۔ غاصب اچھی زبان کے ساتھ تو اس منطقی راہ حل کو قبول نہیں کرے گا، اس مقام پر اس معاملے سے منسلک تمام افراد پر لازم ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔ عربی اور اسلامی حکومتوں، امت اسلامیہ اور بین الاقوامی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس منطقی راہ حل کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں اور اس منطقی حل کو محقق ہونا چاہیے اور ایسا ہو سکتا ہے؛ بعض لوگ نہ کہیں جناب! یہ خیالی تصورات ہیں، ایسا ممکن نہیں؛ نہیں! ایسا ممکن ہے۔ بحیرہ بالٹیک کے ممالک جو سابق سوویت یونین کے قبضے میں تھے وہ چالیس سال سے زائد عرصے کے بعد آزاد وخود مختار ہوگئے۔ مرکزی ایشیا کے بعض ممالک سابق سویت یونین کی تشکیل سے پہلے سو سال تک روس کے قبضے میں تھے بعد میں مستقل طور پر آزاد ہوگئے؛ اب قزاقستان، جارجیا، آذربائیجان اور دوسرے ممالک مستقل اور آزاد ہیں۔ پس یہ امر ممکن ہے اور نہ ہونے کی اس میں کوئی بات نہیں ہے صرف اس میں پختہ اور ٹھوس عزم کی ضرورت ہے، اس میں ہمت اور شجاعت کی ضرورت ہے؛ کمر ہمت کون باندھے گا؟ امت اسلامیہ یا اسلامی حکومتیں؟ امت اسلامیہ دلیر ہے اور اس نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ وہ ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے آمادہ ہے۔

فلسطینی عوام کی استقامت و پائیداری قابل تعریف ہے[1]

رہبر معظم انقلاب اسلامی آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے فلسطین اور غزہ میں فلسطینیوں کے قتل اور محاصرے کو امریکہ کی مشرق وسطی کی غلط پالیسی اور آناپولس کی شرمناک کانفرنس کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: اسلامی حکومتوں کو غزہ کا محاصرہ توڑنا چاہیے اور اس سلسلے میں مصری عوام اور حکومت کی اہم ذمہ داری ہے اور تمام مسلمان قومیں اس فریضہ کو انجام دینے میں مصری حکومت اور عوام کی مدد کریں۔

رہبر معظم نے فرمایا: جب تک فلسطین اور غزہ کے عوام آگ اور خون میں غلطاں ہیں اس وقت تک علاقائی ممالک کے امریکہ اور اسرائیل کے ساتھ مذاکرات کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور غزہ میں موجودہ دردناک شرائط امریکی صدر بش کے علاقہ کے دورے کا نتیجہ ہیں۔

رہبر معظم نے فرمایا: عرب حکومتوں کو ہوشیار رہنا چاہیے تاکہ ان سے یا فلسطین کے دیگر عناصر سے غزہ کے عوام کے خلاف استفادہ نہ کیا جائے اور اگر ایسا ہوا تو یہ بدنما داغ ان کی پیشانی پر ہمیشہ قائم رہے گا۔

رہبر معظم انقلاب اسلامی نے مسئلہ فلسطین کے حل کو صرف مقاومت اور جد و جہد اور پائیداری میں قرار دیتے ہوئے فرمایا: عظیم اقتصادی دباؤ، اسرائیلی فوجی حملے اور قتل و غارت کے باوجود فلسطین اور غزہ کے عوام کی استقامت و پائیداری قابل تعریف ہے اور فلسطینی عوام کو دشمنوں کی سازشوں کے بارے میں بھی ہوشیار رہنا چاہیے جو فلسطینی عوام اور ان کی منتخب حکومت کے درمیان اختلاف ڈالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

۱۔ ایرانی فضائیہ سے خطاب، ۲۰۰/۰۲/۰۸۔

عید غدیر کی مناسبت سے خطاب

رہبر انقلاب اسلامی آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای نے عید غدیر کے موقع پر ہزاروں لوگوں کے اجتماع سے خطاب میں عید کی مبارکباد پیش کی۔ رہبر انقلاب اسلامی نے فرمایا کہ عید غدیر خم کا سب سے بنیادی پیغام اسلام میں امامت کو حکومتی نظام کے طور پر متعارف کرانا ہے۔

۲۰ ستمبر ۲۰۱۶ کو اپنی اس تقریر میں رہبر انقلاب اسلامی آیت اللہ العظمی خامنہ ای نے حضرت علی علیہ السلام کی منفرد خصوصیات اور خاص طور پر آپ کے طرز حکمرانی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام کی ولایت سے تمسک کا لازمہ انہیں خصوصیات کے راستے پر چلنا اور اس عظیم ہستی کی سفارشات پر عمل کرنا ہے۔

رہبر انقلاب اسلامی نے عید غدیر کے لئے عظیم الہی عید جیسے مختلف عناوین استعمال کئے جانے کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ان اوصاف کے استعمال کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ واقعہ غدیر میں جو بہت اہم چیز رونما ہوئی وہ اسلام میں حکومتی ضابطے کی نشاندہی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ ضابطہ در حقیقت اسلامی معاشرے میں امامت وولایت کا نظریہ ہے جس کا اعلان اللہ تعالی کے حکم سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے انجام پایا۔

رہبر انقلاب اسلامی نے فرمایا کہ ضابطہ حکومت معین کرنے کے ساتھ ہی حضرت علی علیہ السلام کو امامت کے مصداق کے طور پر متعارف کرایا گیا جو بہت عظیم، نورانی، ملکوتی اور بے عیب شخصیت کے مالک تھے۔

آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای کا کہنا تھا کہ امامت اور اسلامی سماج کی رہبری کے اعتبار سے کوئی بھی امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام جیسی بلندی پر نہیں ہے اور تاریخ اسلام کی عظیم ترین علمی و عرفانی ہستیاں جیسے ہمارے عظیم قائد (امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ) جو جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے، حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے سامنے خورشید کے مقابلے میں ایک شعاع کی مانند ہیں۔

آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای نے اسلامی معاشرے میں حضرت علی علیہ السلام کی تدابیر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت، دوست و دشمن کی شناخت اور دشمنوں کی درجہ بندی میں بھی بڑی تدبیر سے کام لیتے تھے، چنانچہ دشمنوں سے تین جنگوں میں آپ کا انداز الگ الگ تھا۔

رہبر انقلاب اسلامی آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای کے مطابق امیر المومنین علی علیہ السلام جامع الجہات اور ناقابل توصیف شخصیت کے مالک تھے۔ رہبر انقلاب اسلامی نے فرمایا کہ ہمارا فریضہ اس بلند ترین منزل کی جانب پیش قدمی اور اپنی توانائی و ایمان کے مطابق ان اوصاف سے خود کو آراستہ کرنا ہے۔ رہبر انقلاب اسلامی کے خطاب کا پورا متن پیش خدمت ہے:

بسم الله الرّحمن الرّحيم

و الحمد لله ربّ العالمين و الصّلاة و السّلام على سيّدنا و نبيّنا ابى القاسم المصطفى محمّد و آله الطّيبين الطّاهرين المعصومين سيّما بقية الله فى الارضين.

آپ کو عید کی مبارک باد! اللہ تعالی اس عظیم عید کی برکت سے اور ذکر مولا کی برکت سے آپ کے قلوب کو ہمیشہ اپنے الطاف اور طمانیت و آسودگی سے بہرہ مند رکھے اور یہ توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس مناسبت اور اس جیسی دیگر مناسبتوں سے کما حقہ اور بنحو احسن استفادہ کریں۔ بحمد اللہ ہماری آج کی نشست کا آغاز بہت اچھا رہا؛ بہترین انداز میں تلاوت کلام پاک، جو اشعار یہاں پڑھے گئے، وہ الفاظ کی بندش کے اعتبار سے بھی اور مضمون و مفہوم کے اعتبار سے بھی بہت اچھے تھے۔ آپ کے قلوب مولائے متقیان کے عشق و محبت سے لبریز ہیں، اللہ کا درود و سلام ہو اس ہستی پر۔ یہی عشق، یہی شوق، یہی محبت اور یہی توجہ ان شاء اللہ ہمیں اس سمت میں لے جائے گی جو ہمارے مولا کی مرضی کے مطابق ہے۔

ایک چیز خود غدیر کے تعلق سے ہے۔ بعض جگہوں پر جو کہا گیا ہے کہ عید غدیر «عيد الله الاكبر» ہے، یعنی اسے تمام عیدوں سے برتر قرار دیا گیا ہے، تو اس کی وجہ کیا ہے؟ قرآن کریم میں کچھ آیتیں ایسی ہیں جو واقعہ غدیر کے علاوہ کہیں بھی منطبق نہیں ہوتیں۔ یہی معروف آیہ کریمہ: «اَلیَومَ یَئِسَ الَّذینَ کَفَروا مِن دینِکُم فَلا تَخشَوهُم وَ اخشَونِ اَلیَومَ اَکمَلتُ لَکُم دینَکُم وَ اَتمَمتُ عَلیکُم

نِعمَتی وَرَضیتُ لَکُمُ الاِسلامَ دیناً»[1] جو سورہ مائدہ کی شروعاتی آیتوں میں ہے، واقعہ غدیر سے سے کم اہمیت و منزلت والے کسی واقعے پر قابل انطباق نہیں ہے۔ اسی انداز کا واقعہ ہی اس فقرے کا مصداق ہو سکتا ہے: «الیَومَ یَئِسَ الَّذینَ کَفَروا مِن دینِکُم»۔ جن لوگوں نے ان آیتوں کے مضمون سے اختلاف کیا ہے، کچھ باتیں بیان کی ہیں، کچھ چیزیں پیش کی ہیں، جو مخالفین ہیں، جو لوگ واقعہ غدیر کو نہیں مانتے انہوں نے اس آیہ کریمہ کی کسی اور انداز سے تاویل پیش کی ہے، لیکن آیت کا یہ ٹکڑا قابل تاویل نہیں ہے۔ آج کا دن وہ دن ہے جب کفار آپ کے دین سے مایوس ہو گئے۔ آخر اس دین میں ایسا کون سا اضافہ ہوا ہے جس نے انہیں مایوس کر دیا؟

سورہ مائدہ کی اس آیہ کریمہ کے اس فقرے سے قبل اور بعد میں جو احکام ہیں ان کی کیا اہمیت ہے؟ یہ جملہ نماز کے بارے میں نہیں استعمال ہوا، زکات کے بارے میں نہیں استعمال ہوا، جہاد کے بارے میں نہیں استعمال ہوا، کسی بھی دوسرے فروعی حکم کے لئے استعمال نہیں ہوا کہ «اَلیَومَ یَئِسَ الَّذینَ کَفَروا مِن دینِکُم»، لہٰذا ظاہر ہے کہ یہاں مسئلہ کچھ مختلف ہے۔ فروعات سے الگ کوئی مسئلہ ہے۔ وہ مسئلہ کیا ہے؟ یہ اسلامی معاشرے کی رہبری کا مسئلہ ہے، یہ اسلامی معاشرے میں امامت اور نظام حکومت کا معاملہ ہے۔ ممکن ہے اس کی خلاف ورزی کی جائے، چنانچہ بنی امیہ، بنی عباس اور اسی طرح دوسروں نے امامت و خلافت کے نام پر بادشاہت کی اور اپنی سلطنت قائم کی، مگر اس سے فلسفہ غدیر پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی۔

غدیر میں جس چیز کا تعین ہوا ہے وہ ایک ضابطہ ہے، ایک قاعدہ ہے۔ وہاں اسلام کا ایک قاعدہ بنا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ کے آخری مہینوں میں یہ ضابطہ وضع کیا، وہ ضابطہ کیا ہے؟ یہ ضابطہ امامت ہے، ضابطہ ولایت ہے۔ انسانی معاشروں میں قدیم ایام سے حکومتیں بنتی رہی ہیں اور بشریت نے انواع واقسام کی حکومتوں کا مشاہدہ اور تجربہ کیا۔ اسلام ان حکومتوں کو، اقتدار کی ان شکلوں کو اور طاقت بڑھا لینے کے ان طریقوں کو قبول نہیں کرتا۔ اسلام امامت کو مانتا ہے۔ یہ اسلام کا قاعدہ ہے اور واقعہ غدیر اسی چیز کو بیان کرتا ہے۔ اس کا مصداق بھی واضح ہے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام وہ ہستی ہیں جن کی

۱۔ سورہ مائدہ، آیت نمبر ۳ کا ایک حصہ «...آج کفار تمہارے دین کی جانب سے مایوس ہو گئے۔ تو ان سے ڈرو نہیں بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور اسلام کو تمہارے دین کے طور پر پسند کیا۔»۔

شخصیت کے اندر یا قرآنی مفاہیم و معارف کا نمائندہ ہونے کی آپ کی حیثیت کے اندر، نہ اس زمانے میں اور نہ بعد کے ادوار میں، کوئی بھی شخص کوئی معمولی سی بھی خامی تلاش نہیں کر سکا۔ بے شک آپ کو (نعوذ باللہ) گالیاں دی گئیں، مگر دینے والے تو اللہ کو بھی گالیاں دیتے، ہیں، نعوذ باللہ پیغمبر اکرم کی شان میں بھی گستاخی کرتے ہیں، تو فحش کلامی کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ جب بھی کوئی انسان بغور جائزہ لے، تعصب اور جذباتیت سے، ایک حد تک ہی سہی، بالاتر ہو کر سوچے تو ہر گز اس عظیم نورانی پیکر، ملکوتی ہستی میں کم ترین سطح کی بھی خامی تلاش نہیں کر سکتا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو امامت کا مصداق معین فرمایا۔ یہ ایک قاعدہ بن گیا۔ اب رہتی دنیا تک جہاں بھی مسلمانوں کو ہدایت و توفیق ملی اور انہوں نے اسلام کو نافذ کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیا اور اسلامی معاشرے کی تشکیل کا تہیہ کر لیا تو ان کے سامنے قاعدہ اور ضابطہ یہی ہے؛ انہیں چاہئے کہ امامت کا احیاء کریں۔ البتہ کوئی بھی مصداق بلندی میں اس مصداق کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا جس کا تعین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے، اس سے کمتر نمونے کی خاک پا کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ہماری بڑی سے بڑی علمی، روحانی و عرفانی ہستیاں اور سیر و سلوک و عرفان کی وادیوں کی سرکردہ شخصیات بھی امیر المومنین علیہ السلام کے سامنے کوئیں کی تہہ میں نظر آنے والی نور کی پرتو کی مانند ہیں جن سے مختصر روشنی انسان کو مل جاتی ہے۔ اب اس مختصر روشنی کا موازنہ آپ خورشید سے کیجئے۔ جی ہاں، یہی صورت حال ہے، بے شک شعاع تو وہی ہے لیکن فاصلہ کتنا زیادہ ہے؟! فرق کتنا زیادہ ہے؟ ہماری عظیم ترین ہستیاں بھی جیسے ہمارے قائد بزرگوار امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ واقعی ایک عظیم، باعظمت، کامل اور جامع الحیثیات شخصیت کے مالک تھے اور ہر لحاظ سے بڑی ممتاز اور نمایاں ہستی کا درجہ رکھتے تھے۔ اب اگر ہم ان کو امیر المومنین علیہ السلام کے سامنے رکھیں تو موازنے کی یہی صورت ہوگی جو ہم نے عرض کی، یعنی یہ موازنہ خورشید کی درخشش کا موازنہ کنویں کی تہہ میں نظر آنے والی پرتو سے کرنے کے مترادف ہوگا۔ فاصلہ اس قدر زیادہ ہے۔ یہ فاصلے ہیں مگر ضابطہ یہی ہے، ضابطہ امامت ہے۔ اسلامی معاشرے میں حکومت و اقتدار کا ضابطہ غدیر میں معین کر دیا گیا اور اس کی داغ بیل رکھ دی گئی۔ یہ ہے غدیر کی اہمیت۔ غدیر کی اہمیت صرف اتنی نہیں ہے کہ وہاں امیر المومنین کا تعین عمل میں آیا۔ یہ بھی بہت اہم ہے، تاہم اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ضابطے اور قاعدے کا تعین کر دیا گیا۔ زر و زور کی حکومت بے معنی ہے، اشرافیہ کی حکمرانی بے

معنی ہوتی ہے، عوام پر تکبر سے کی جانے والی حکومت بے معنی ہے، ایسی حکومت بے معنی ہے جو صرف اپنے لئے مال واسباب جمع کرنے، توسیع پسندی اور امتیازی سہولتیں حاصل کرنے کے لئے ہو۔ خواہشات پوری کرنے کے لئے کی جانے والی حکومت بے معنی ہے۔ واضح ہو گیا کہ اسلام میں ضابطہ یہ ہے۔ یہ ضابطہ غدیر میں وضع کیا گیا۔ جب یہ ضابطہ طے ہو گیا تو «یَئِسَ الَّذینَ کَفَروا مِن دینِکُم» دین کو اس کے صحیح راستے سے منحرف کر دینے کے اپنے مقصد کی طرف سے دشمن مایوس ہو گئے۔ اس لئے کہ دین کی سمت و جہت تب تبدیل ہوتی ہے جب اس کا بنیادی جوہر بدل جائے، اصلی محور میں تبدیلی آ جائے۔ یعنی اقتدار کا محور، انتظامی سرگرمیوں کا مرکز، سربراہی کا مرکز اگر بدل گیا تو سب کچھ دگرگوں ہو جائے گا۔ عملی حقائق میں تبدیلیاں ہوتی ہیں اور بنی امیہ اور بنی عباس کے خلفا اسلام کے نام پر اقتدار میں آتے ہیں، حجاج ابن یوسف کو بھی اقتدار مل جاتا ہے۔ لیکن یہ لوگ اس اصلی ضابطے کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ آج اگر عالم اسلام میں کچھ لوگ، ایسے لوگ جو اسلامی معارف سے آشنا ہیں، قرآن سے رجوع کریں، ان ضوابط کا جائزہ لیں جو قرآن میں اللہ کی بندگی کے لئے، اللہ کے بندوں یعنی اقوام کا راستہ معین کرنے کے لئے اور زندگی بسر کرنے کے لئے بیان کئے گئے ہیں تو امیر المومنین اور آپ کے جانشینوں کی امامت کے علاوہ کسی اور نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ یہ ہمارا دعوی ہے اور ہم اپنے اس دعوے کو پوری طرح ثابت کر سکتے ہیں۔ عالم اسلام کا کوئی بھی شخص، مفکرین، دانشور، صاحب عقیدہ افراد، وہ لوگ جو کسی اور عقیدے کے ساتھ بڑے ہوئے ہیں، اگر قرآن کو، قرآنی اقدار کو اور قرآنی ضوابط کو انسانی معاشرے کی زندگی کے لئے بنیاد و معیار بنائیں تو وہ اس کے علاوہ کسی اور نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے کہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام جیسی ہستی کو اسلامی معاشرے پر حکومت کرنا چاہئے۔ یعنی طریقہ یہی ہے، صحیح راستہ امامت کا راستہ ہے۔ اس کا تعلق غدیر سے ہے۔

غدیر کی اس غیر معمولی اہمیت کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر اس دوسری آیہ شریفہ کا مفہوم پوری طرح سمجھ میں آتا ہے: «یاَیُّهَا الرَّسولُ بَلِّغ ما اُنزِلَ اِلَیکَ مِن رَبِّکَ وَ اِن لَم تَفعَل فَما بَلَّغتَ رِسالَتَه»[1] ارشاد ہوتا ہے کہ اگر آپ نے اس حکم کو نہ پہنچایا تو گویا پیغام رسالت ہی نہیں پہنچایا۔

۱۔ سورہ مائدہ، آیت نمبر ۶۷ کا ایک حصہ « اے پیغمبر تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر جو نازل ہو چکا ہے، اسے پہنچا دو اور اگر تم نے نہ پہنچایا تو گویا تم نے اس کا پیغام رسالت ہی نہیں پہنچایا ہے۔»

پہنچایا۔ پیغمبر اکرم ۲۳ سال سے جانفشانی کر رہے ہیں، وہ مکّہ کی جدوجہد، وہ مدینے کی جدوجہد، وہ جنگیں، وہ قربانیاں، وہ ایثار، وہ سختیوں کا سامنا، بشریت کی ہدایت کا وہ عظیم کام جو پیغمبر اسلام نے انجام دیا۔ اس مدت میں یہ سارے کام انجام دئے گئے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کون سا واقعہ ہے، یہ کون سا فریضہ ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو گویا کچھ بھی انجام نہیں دیا گیا ہے۔ «وَ اِن لَم تَفعَل فَما بَلَّغتَ رِسالَتَه» یہ ہر گز فروع دین کا معاملہ نہیں ہو سکتا۔ اس سے بالاتر معاملہ ہے۔ وہ مسئلہ کیا ہے؟امامت ہے۔ سب سے پہلا امام کون ہے؟ خود پیغمبر ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے منی میں فرمایا؛ اِنَّ رَسولَ اللهِ کانَ هُوَ الاِمام؛ پیغمبر پہلے امام ہیں«ثُمَّ مِن بَعدِهِ عَلیٌّ بنِ اَبی طالِب» پھر علی ابن ابی طالب اور دیگر ائمہ علیہم السلام ہیں[1]۔ اللہ تعالی نے اپنے نبی حضرت ابراہیم کا بڑا امتحان لیا اور جب آپ نے وہ تمام سخت مراحل کامیابی سے پورے کر لئے؛ نوجوانی میں آگ میں ڈالے گئے، اس کے بعد بابل گئے اور وہاں جن علاقوں میں رہے بے پناہ مشقتیں برداشت کیں، صعوبتیں اٹھائیں، بڑھاپے کے سن کو پہنچے تب اللہ تعالی نے فرمایا؛اِنّی جاعِلُکَ لِلنّاسِ اِماماً[2] اب میں تمہیں امام بنانا چاہتا ہوں۔ اسے اسے کہتے ہیں امامت۔ یہ عقیدہ ہے۔ محکم اور ٹھوس دلائل پر استوار اسلامی عقیدہ۔ ہم تمام عالم اسلام کو دعوت دیتے ہیں اور تمام مفکرین کو دعوت فکر دیتے ہیں، آج عالم اسلام کو جس اتحاد کی سخت ضرورت ہے، قرآن کی آیتوں میں تدبر اور ان حقائق پر غور کرکے اسے باآسانی حاصل کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اہل فکر حضرات ان مسائل پر توجہ دیں۔

البتہ ادھر سے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے جذبات مشتعل نہ کئے جائیں۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تشیع کے اثبات کا بس یہی طریقہ ہے کہ انسان اہل سنت اور دوسرے افراد کے نزدیک جو مقدس افراد ہیں ان کے سلسلے میں مستقل طور پر بدکلامی کرے۔ بالکل نہیں، یہ تو ائمہ علیہم السلام کی سیرت کے خلاف ہے۔ یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں کہ عالم اسلام میں ٹی وی چینل اور ریڈیو نشریات شروع ہو رہی ہیں جو شیعہ کے نام پر اپنا نصب العین یہ بنائے ہوئے ہیں کہ دیگر مسلکوں کی محترم شخصیتوں کی توہین کریں، تو صاف ظاہر ہے کہ

---

۱. کافی، جلد ۴، صفحہ ۴۶۶ (معمولی سے فرق کے ساتھ)۔
۲. سورہ بقرہ، آیت نمبر ۱۲۴کا ایک حصہ ۔

اس کا بجٹ برطانوی خزانے سے مہیا کرایا جارہا ہے۔ یہ بجٹ برطانیہ فراہم کر رہا ہے، تو یہ برطانوی تشیع ہے۔ کوئی اس خیال میں نہ رہے کہ شیعہ مسلک کی توسیع، شیعہ عقائد کا پرچار اور استحکام اسی بدکلامی اور اسی طرز گفتگو سے ممکن ہو پائے گا۔ جی نہیں، یہ لوگ بالکل برعکس عمل کر رہے ہیں۔ جب آپ نے دوسروں کو برا بھلا کہا تو ان کے گرد تعصب اور اشتعال کا ایک حصار قائم ہو جاتا ہے، جس کے بعد آپ کی حق بات بھی ان کے لئے قابل تحمل نہیں رہتی۔ ہمارے پاس منطقی باتیں بہت ہیں، منطقی پیغام کثرت کے ساتھ موجود ہیں، ایسی باتیں کہ ہر اہل فکر انہیں سننے کے بعد یقینا قبول کرے گا۔ ہمارے پاس اس طرح کی باتیں بہت ہیں۔ یہ باتیں لوگوں تک پہنچایئے۔ یہ باتیں دوسرے فریقوں کے دلوں میں ڈالئے۔ جب آپ نے گالی دینا شروع کر دیا، برا بھلا کہنا شروع کر دیا تو گویا آپ نے اپنے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی۔ اب آپ کی بات ہر گز سنی نہیں جائے گی۔ اسے دوسرے نہیں سنیں گے۔ بلکہ ایسی صورت میں امریکا، سی آئی اے اور دیگر خفیہ ایجنسیوں سے پیسے لے کر کام کرنے والے خبیث اور پٹھو گروہ جیسے داعش، النصرہ وغیرہ مٹھی بھر غافل، نادان اور سادہ لوح افراد کی مدد سے یہ حالات پیدا کر دیں گے جس کا مشاہدہ آپ نے عراق، شام اور دیگر جگہوں پر کیا۔ یہ دشمن کا مشن ہے۔ دشمن تو موقع کی تاک میں رہتا ہے۔ وہ ہر موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ ہمارے پاس حرف حق ہے، منطقی پیغام ہے، محکم موقف ہے، اس کا ایک نمونہ یہی ہے جو میں نے ابھی عرض کیا۔ یہ کچھ باتیں غدیر کے تعلق سے تھیں۔

اب حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام کے بارے میں کچھ باتیں۔ اسلام پر عقیدہ رکھنے والا مومن انسان ہو، یا کسی بھی دین کا ماننے والا انسان ہو، یا پھر کسی بھی دین کو نہ ماننے والا ملحد شخص ہو، وہ کیسا بھی انسان ہو، ایک انسان ہونے کی حیثیت سے وہ جن صفات اور اقدار کا احترام کرتا ہے وہ سب کے سب علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اندر جمع ہیں۔ یعنی علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شخصیت ایسی شخصیت ہے کہ اگر آپ شیعہ ہیں تب بھی ان کا احترام کریں گے، اگر سنی ہیں تب بھی ان کا احترام کریں گے، مسلمان نہیں ہیں تب بھی اگر آپ اس شخصیت سے واقف ہیں اور ان کے حالات زندگی سے آشنا ہیں تو ان کا احترام کریں گے۔

برسہا برس سے جو اہل سنت افراد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے فضائل لکھتے آرہے ہیں لا تعداد ہیں۔ عیسائی مصنف جارج جرداق نے پانچ جلدوں پر مشتمل وہ کتاب لکھی۔ برسوں پہلے ایک عیسائی

شخص امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں عشق و عقیدت میں ڈوب کر کتاب لکھتا ہے۔ یہی مصنف یہاں میرے پاس آئے اور اپنی کتاب کے بارے میں مجھے بتایا[۱]، کہنے لگے کہ نوجوانی سے ہی مجھے نہج البلاغہ سے آشنائی ہو گئی۔ نہج البلاغہ نے مجھے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شخصیت سے روشناس کرایا۔ اس طرح انہوں نے یہ کتاب لکھی؛ الامام علی صوت العدالة الانسانیّه۔ جس شخص کا کوئی دین نہ ہو، یعنی کسی بھی دین پر عقیدہ نہ رکھتا ہو، اگر وہ امیر المومنین سے آشنا ہو جاتا ہے تو ان کے سامنے سر تعظیم خم کرتا ہے، اظہار خاکساری کرتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام کے اندر تین طرح کی صفتیں ہیں: ایک تو روحانی و الوہی صفتیں جن کا ہم کسی بھی طرح ادراک نہیں کر سکتے۔ ایمان، وہ گہرا اور حد درجہ بلند ایمان، سبقت در اسلام، راہ اسلام میں قربانیاں۔ اخلاص؛ آپ کے عمل میں سوئی کی نوک کے برابر بھی کوئی غیر الٰہی جذبہ دخیل نہیں ہے۔ کیا ہم ان چیزوں کا ادراک کر سکتے ہیں؟ مجھ جیسے افراد کے لئے یہ کوائف کیا کسی بھی طرح قابل فہم ہیں؟ ہر کام اللہ کے لئے، رضائے خالق کے لئے، حکم پروردگار پر عمل آوری کے لئے۔ یعنی مکمل اخلاص۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی قدر و منزلت کا ادراک ہمارے بس کی بات نہیں ہے اور نہ ہم اس کی صحیح طریقے سے تشریح کر سکتے ہیں۔ علم اور اللہ کی معرفت، معرف باللہ۔ ہم اللہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ ہم جب کہتے ہیں؛ «سُبحانَ رَبِّیَ العَظیمِ وَ بِحَمدِہ» تو اس عظمت سے ہم کیا سمجھتے ہیں اور امیر المومنین علیہ السلام کا ادراک اس بارے میں کس منزل پر ہوتا ہے؟ اللہ کی معرفت۔ یہ امیر المومنین علی علیہ السلام کی صفات کا ایک سلسلہ ہے جو ہمارے لئے واقعی قابل توصیف نہیں ہے، قابل فہم نہیں ہے۔ اگر کوئی آکر ہمیں سمجھائے اور اس کی تشریح کرے تب بھی ہم اس کی گہرائی کو کما حقہ نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ یہ عظمت لامتناہی ہے، اس کے عمق کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ تو امیر المومنین علیہ السلام کی صفات کی ایک قسم یہ ہے۔

امیر المومنین کی صفات کی ایک اور قسم نمایاں انسانی اوصاف کی ہے۔ یہ وہی صفات ہیں جنہیں مسلمان، غیر مسلم، عیسائی و غیر عیسائی، دیندار اور بے دین سب پسند کرتے ہیں اور گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ «شجاعت»، «رحمدلی» وہ انسان جو میدان جنگ میں بے جگری سے لڑتا ہے، جب کسی بے

۱۔ ۲۰ مئی ۱۹۹۶۔

سرپرست خاندان کے پاس جاتا ہے تو یتیموں سے گھل مل جاتا ہے۔ خم ہو کر یتیم بچوں کو اپنے دوش پر سوار کرتا ہے، ان کے ساتھ کھیلتا ہے۔ یہ ایسی صفات ہیں کہ ہر کوئی انہیں پسند کرتا ہے خواہ دیندار ہو یا نہ ہو۔ کوئی بھی شخص جب کسی ہستی کی یہ عظمتیں دیکھتا ہے تو خود بخود سر تعظیم خم کر دیتا ہے۔ «ایثار»: ایثار کا مطلب ہے دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دینا، یعنی قربانی دینا، یعنی ایسے مواقع پر بھی جب آپ حق بجانب ہیں اللہ کے لئے، کسی مصلحت کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ اپنے اس حق سے دست بردار ہو جائیں۔ البتہ جب ذاتی حق کی بات ہو تب۔ خواہ وہ پیسے کا کوئی معاملہ ہو، وقار کا مسئلہ ہو یا کوئی اور حق ہو۔ یہ ہے ایثار کا مطلب۔ امیر المومنین علیہ السلام کی کچھ خصوصیات اس قسم کی بھی ہیں، اگر کوئی انسان ان خصوصیات کو شمار کرنا چاہے تو پوری کتاب تیار ہو جائے گی، ایک طولانی طومار تیار ہو جائے گا۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے اوصاف کی تیسری قسم حکومتی خصوصیات پر مشتمل ہے جو اسی مسئلہ امامت کا نتیجہ ہے۔ امامت یعنی اس انداز سے حکومت کرنا۔ البتہ اس کے بھی درجات ہیں اور بلند ترین درجہ امیر المومنین علیہ السلام جیسی شخصیت کے اندر نمودار ہوتا ہے۔ کس طرح کی حکومتی خصوصیات؟ جیسے انصاف، مساوات، تمام لوگوں کو یکساں نظر سے دیکھنا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو بھی جو آپ کے معاشرے میں ہیں مگر آپ کے دین پر نہیں ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام نے جب سنا کہ بسر بن ارطاۃ[1] ایک شہر میں داخل ہوا اور مکانات میں درانہ گھس گیا تو آپ بڑے دردناک لہجے میں اپنے خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں: بَلَغَنی اَنَّ الرَّجُلَ مِنهُم لِيَدخُلُ المَرأَةَ المُسلِمَةِ وَ الأُخرَی المُعاهَدَةِ فَيَنتَزِعُ حِجلَها[2] میں نے سنا ہے کہ ایک ظالم و ستمگر و گستاخ فوجی مسلمان غیر مسلمان خواتین کے گھروں میں داخل ہو گیا، "مُعاہد" یعنی وہ یہود و نصارا جو اسلامی معاشرے میں زندگی بسر کرتے تھے، یہ فوجی گھروں میں داخل ہوتے تھے اور ان کے لباس اور حِجل[3]، دستبند اور پیروں کے زیور چھینتے تھے اور لوٹ لے جاتے تھے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر انسان اس واقعے پر غم و غصے سے مر جائے تو اسے سرزنش نہیں کرنا چاہئے۔ آپ غور کیجئے! اسے کہتے ہیں شخصیت۔ عوام الناس کے لئے ان کی رحمدلی، لوگوں کے لئے ان کی دل سوزی، وہ بھی

---

۱. معاویہ کی فوج کا ایک کمانڈر جو کچھ عرصے کے لئے بصرہ کا حاکم بنا تھا۔
۲. نہج البلاغہ، خطبہ ۲۷۔
۳. یعنی پایل یا پازیب۔

سارے عوام کے لئے؛ظاہر ہے اسلامی معاشرے میں یہودی و نصرانی وغیرہ بھی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ آپ کی حکومتی خصوصیات ہیں: «عدل»، «انصاف»، «مساوات»۔

اپنی ذات کو دنیا کے لغویات اور اس کے تجملات سے دور رکھنا۔ دنیاوی حکومتوں کی ایک بہت بڑی مصیبت یہی ہے۔ ہم چونکہ ایک مملکت کے سربراہ بن گئے ہیں، ملک کے خزانے ہمارے ہاتھ میں ہیں تو اب ہمارے دل میں لالچ آجاتی ہے۔ یہاں زمین بہت اچھی ہے، یہاں بڑی سہولیات ہیں، اس میں بڑی آمدنی ہے، تو اس میں سے ہم بھی اپنا ایک حصہ لگا لیتے ہیں۔ جو لوگ حد درجہ بدبخت، روسیاہ اور قسی القلب ہوتے ہیں وہ سب ہڑپ لیتے ہیں، جیسے رضاخان۔ جن لوگوں میں کسی قدر انصاف ہوتا ہے وہ اس میں سے کچھ حصہ دوسروں کو بھی دے دیتے ہیں۔ عام طور پر اپنے حلقہ بگوش افراد میں تقسیم کرتے ہیں اور کچھ اپنے لئے رکھ لیتے ہیں۔ یہ حکومتوں کی بڑی آفتوں میں سے ایک ہے۔ دنیا کی جمہوری حکومتیں بھی اس میں مبتلا ہیں۔ آپ سنتے ہیں کہ فلاں ملک کے صدر کی بیوی نے سردیوں یا گرمیوں کی چھٹیوں میں فلاں پرکشش آب و ہوا والے جزیرے کا سفر کیا اور اتنے ملین ڈالر خرچ کئے! کہاں سے آیا یہ پیسہ؟ فلاں شاہی خاندان سیر کرنے کی غرض سے فلاں شہر گیا اور اتنے ہوٹل اور اتنے وسائل اس خاندان کے لئے مختص کر دئے گئے تھے۔ دس دن میں، بیس دن میں جو وہاں اس خاندان نے گزارے اتنے ارب ڈالر خرچ ہوئے، خرچہ اربوں ڈالر کے حساب سے ہوتا ہے۔ امامت کی روش والی حکومت ان چیزوں کی مخالف ہے۔ عمومی وسائل کا ذاتی مقاصد کے لئے استعمال اس حکومت میں ممنوع ہوتا ہے، اپنے ذاتی امور میں دنیا سے اجتناب۔

«تدبیر»: اسلامی معاشرے کے لئے تدابیر پر غور کرنا۔ دشمن کو الگ کرنا، دوست کو الگ کرنا، دشمنوں کی درجہ بندی کرنا۔ امیرالمومنین علی علیہ السلام نے اپنی حکومت کے دوران تین جنگیں لڑیں۔ دشمنوں کی تین جماعتوں سے آپ نے جنگ کی لیکن یہ جنگیں یکساں نہیں تھیں۔ معاویہ اور شام سے جنگ الگ انداز کی تھی، بصرے سے جنگ کسی اور انداز سے تھی۔ جب حضرت کی جنگ طلحہ اور زبیر سے ہوئی تو اس کا انداز الگ تھا۔ اس جنگ میں آپ زبیر کو بیچ میدان جنگ میں بلاتے ہیں اور ان سے بات کرتے ہیں، انہیں نصیحت کرتے ہیں: میرے بھائی ماضی کو یاد رکھو، ہم بہت سی جنگیں شانہ بشانہ لڑ چکے ہیں، ہم نے مل کر کام کیا ہے۔ نصیحت کا اثر بھی ہوا، تاہم زبیر کو جو کرنا چاہئے تھا انہوں نے نہیں کیا۔ انہیں امیرالمومنین علی علیہ السلام سے متصل ہو جانا چاہئے تھا۔ انہوں نے یہ کام نہیں کیا، میدان جنگ

چھوڑ کر چلے گئے۔ تو طلحہ وزبیر سے جنگ کے دوران امیر المومنین علیہ السلام کا انداز اس طرح کا تھا۔ مگر حاکم شام کے ساتھ آپ کا برتاؤ یہ نہیں ہے۔ معاویہ سے حضرت کیا کہیں؟ یہ کہیں کہ ہم اور تم پہلے ایک ساتھ تھے؟ کب ایک ساتھ تھے؟ جنگ بدر میں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوئے تھے۔ امیر المومنین نے اس کے دادا کو، اس کے ماموں کو، اس کی قوم کے افراد کو اور اس کے رشتہ داروں کو تہہ تیغ کیا۔ ماضی میں کبھی ایک دوسرے کا ساتھ نہیں رہا۔ معاویہ کے دل میں وہی دشمنی بھری ہوئی ہے اور وہ امیر المومنین سے جنگ کے لئے آیا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام دشمنوں کی درجہ بندی کرتے تھے۔

جنگ نہروان میں جہاں دشمنوں کی تعداد دس ہزار تھی، حضرت نے فرمایا کہ ان دس ہزار لوگوں میں سے جو بھی اس پرچم کے نیچے آ جائے، جو میں نے نصب کیا ہے، تو اس سے ہماری کوئی جنگ نہیں ہے۔ ان میں سے اکثر اس طرف آ گئے۔ حضرت نے فرمایا کہ جاؤ، انہیں چھوڑ دیا گیا۔ دوست کو پہچاننا، دشمن کو پہچاننا، سارے دشمن ایک جیسے نہیں ہوتے۔ بعض سے چشم پوشی کی۔ بعض افراد تھے جنہوں نے شروع میں ہی حضرت کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جناب مالک اشتر پاس ہی شمشیر بکف کھڑے ہوئے تھے، کہنے لگے کہ یا امیر المومنین! اجازت دیجئے کہ میں اس شخص کی گردن یہیں اڑا دوں جو آپ کی بیعت نہیں کر رہا ہے۔ حضرت نے ہنس کر فرمایا کہ نہیں، یہ شخص جب نوجوان تھا تب بھی تند مزاج آدمی تھا، بد اخلاق تھا، اب یہ بوڑھا ہو گیا ہے تو مزاج کی تندی اور بڑھ گئی ہے۔ اسے جانے دو۔ چھوڑ دیتے تھے اور اس طرح کے لوگ چلے جاتے تھے۔ یہ تدبیریں ہیں۔ بہترین تدبیر یہ ہے کہ جو شخص اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اسے معلوم ہو کہ اس کا سابقہ کس سے ہے اور کس سے اسے کس طرح پیش آنا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام کی حکومتی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی تھی۔

«سرعت عمل»: کام کو نہ ٹالنا۔ جیسے ہی مشخص ہو جاتا کہ یہ کام انجام دینا ہے فورا شروع کر دیتے تھے۔

«تشریح و وضاحت»: حقائق کو عوام کے سامنے پوری وضاحت سے بیان کر دیتے تھے۔ آپ نہج البلاغہ کے خطبوں پر غور کیجئے۔ ان میں بہت سی جگہوں پر ان حقائق کی تشریح اور وضاحت ہے جو اس وقت معاشرے میں موجود تھے۔ خواہ وہ حضرت کے خطبات ہوں، یا خطوط ہوں، ظاہر ہے نہج البلاغہ کا ایک حصہ خطبات پر اور ایک حصہ خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط ان لوگوں کو لکھے گئے ہیں جن پر امیر المومنین علیہ

السلام کو کوئی اعتراض کرنا تھا، یا پھر معاویہ وغیرہ جیسے دشمنوں کو لکھے گئے ہیں، یا خود حضرت کے منصوب کردہ افراد ہیں جنہیں امیر المومنین علیہ السلام انتباہ دینا چاہتے ہیں۔ اکثر خطوط ایسے ہیں، بعض خطوط میں سفارشات، فرمان اور دستور العمل ہیں، جیسے کہ میثاق مالک اشتر ہے۔ مولائے متقیان ان سب میں عوام کے لئے وضاحت کرتے ہیں، حقائق کی تشریح کرتے ہیں۔ یہ امیر المومنین علی علیہ السلام کی روش ہے۔

معاشرے کی ہدایت کرکے اسے تقوی کے راستے پر پہنچانے کا معاملہ؛ امیر المومنین علیہ السلام کے ان خطبات میں بہت کم خطبے ایسے ہیں جن میں تقوی کا حکم نہ دیا گیا ہو؛ اتَّقوا اللہ، کیونکہ تقوی ہی سب کچھ ہے۔ جب معاشرے میں تقوی کا ماحول پیدا ہو جائے تو معاشرے کی تمام روحانی و مادی مشکلات حل ہو جائیں گی۔ یہ ہے تقوی۔ البتہ تقوی کے جو صحیح معنی ہیں ان کی رو سے تقوی صرف یہ نہیں ہے کہ انسان نامحرم کو نہ دیکھے، یا دوسرے حرام کام سے دور رہے۔ یہ بھی ہے، یہ بھی تقوی کا جز ہے۔ لیکن تقوی کا دائرہ بہت وسیع تر ہے۔ تقوی کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ محتاط رہنا، اپنے حرکات و سکنات پر نظر رکھنا، خود کو راہ مستقیم پر باقی رکھنے کے لئے کوشاں رہنا، یہ ہے تقوی کا اصلی مفہوم۔ اگر معاشرے میں یہ ماحول پیدا ہو جائے تو تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ امیر المومنین علیہ السلام عوام کو ہمیشہ تقوی کی دعوت دیتے تھے۔

حق پر عمل کرنے کے معاملے میں بے باک تھے۔ کسی رواداری میں نہیں پڑتے تھے۔ انصاف کرنے میں بالکل نڈر تھے۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ امیر المومنین علیہ السلام کی زندگی میں اس طرح کے تکلفات کی گنجائش نہیں تھی۔ وہی انسان جو مالک اشتر سے کہتا ہے کہ بیعت سے انکار کرنے والے اس شخص کو جانے دو، دوسرے موقع پر سخت گیری کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، باریکیوں پر نظر رکھتے ہیں، زور دیتے ہیں۔

آپ دیکھئے کہ امیر المومنین علیہ السلام کی صفات کی یہ تیسری قسم حکومتی صفات پر استوار ہے۔ یہ ان ذاتی صفات اور روحانی و الوہی اوصاف سے الگ ہیں جو ہمارے لئے سرے سے قابل ادراک ہی نہیں ہیں، جن کی توصیف سے ہماری زبانیں قاصر ہیں۔ یہ امیر المومنین علیہ السلام کی شخصیت ہے۔ یعنی وہ جامع

الحیثیات شخصیت کہ واقعی؛«تو بزرگی و در آئینۂ کوچک ننمایی»[۱]۔ (تم اتنے بڑے ہو کہ چھوٹے سے آئینے میں نہیں سماتے) ہم ان کمزور و ناتواں آنکھوں سے، اس دید ناقص سے، توہمات سے ڈھکے ان دلوں سے اس عظیم شخصیت کو بخوبی نہیں دیکھ سکتے، لیکن بہرحال ہم اپنی زبان سے ان بزرگوار کی ایک توصیف کرتے ہیں، کچھ چیزیں ان کے بارے میں جانتے ہیں۔ غدیر میں اسی عظیم ہستی کا تعین ہوا۔

تو اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ظاہر ہے کہ ہم امیر المومنین علیہ السلام کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتے، اس طرح عمل نہیں کر سکتے، اس طرح نہیں بن سکتے۔ خود حضرت نے بھی فرمایا ہے: اَلا وَاِنَّکُم لا تَقدِرونَ عَلی ذٰلِکَ[۲] حضرت نے اپنے گورنروں اور عہدیداروں سے فرمایا کہ جس طرح میں عمل کرتا ہوں آپ اس طرح عمل کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ ہمیں اس بلند چوٹی پر اپنی نظریں مرکوز کرنا چاہئے۔ ہم نے بارہا عرض کیا ہے کہ یہ بلند چوٹی ہے۔ آپ سے کہا جائے کہ؛ وہی چوٹی آپ کی منزل ہے۔ اسی چوٹی کی جانب پیش قدمی کیجئے۔ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اسی سمت میں چل پڑیں۔ امیر المومنین علیہ السلام کے انہیں صفات کو مد نظر رکھیں اور اپنی قوت و توانائی بھر اسی سمت میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں، برعکس سمت میں نہ جائیں۔ ہمارا معاشرہ امیر المومنین علیہ السلام کے زہد و تقوی کی سمت میں آگے بڑھے، امیر المومنین علیہ السلام جیسا زاہد نہ بنے، کیونکہ یہ ہمارے بس میں ہے نہ اس کا ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے، مگر ہمیں اسی سمت میں گامزن ہونا چاہئے۔ یعنی فضول خرچی، زیادہ روی، ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی سے دور رہیں تو اس طرح ہم امیر المومنین علیہ السلام کے شیعہ بن سکیں گے۔

ہمارا عمل دوسروں کو ہمارا معترف بنا دے گا۔ ارشاد ہوتا ہے: کونوا لَنا زَیناً وَ لا تَکونوا عَلَینا شَیناً[۳] ہمارے لئے باعث زینت بنو۔ باعث زینت بنو سے کیا مراد ہے؟ یعنی اس طرح عمل کرو کہ کوئی دیکھے تو برجستہ کہے؛ واہ! امیر المومنین علیہ السلام کے شیعہ کتنے اچھے ہوتے ہیں! اگر کوئی رشوت

---

۱. سعدی، دیوان اشعار؛«پرده بردار که بیگانه خود این روی نبیند / تو بزرگی و در آیینۂ کوچک ننمایی»۔
۲. نہج البلاغہ، مکتوب نمبر ۴۵۔
۳. امالی صدوق، صفحہ ۴۰۰۔

وصول رہا ہے تو وہ باعث زینت نہیں ہے۔ یہ ایک عیب ہے۔ اگر کوئی شخص بیت المال سے زیادہ پیسہ لے رہا ہو تو یہ شیعہ ہونے کی حیثیت سے اس کے لئے عیب ہے۔ اگر کوئی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے اور معاشرے کو تقوی کی جانب لے جانے کے سلسلے میں کسی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتا تو وہ اسلامی نظام کے لئے اور اسلامی معاشرے کے لئے عیب ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی ذاتی زندگی میں اسراف کرتا ہے تو وہ بھی عیب ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ ہم مبتلا ہو گئے ہیں۔ اسراف میں مبتلا ہو گئے ہیں، زیادہ روی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ہم کئی سال سے اس بارے میں مسلسل نصیحت کرتے آ رہے ہیں؛ خود کو بھی، عوام کو بھی، دوسروں کو بھی، ہم مستقل کہتے آ رہے ہیں، بار بار کہہ رہے ہیں۔ ہمیں آگے بڑھنا چاہئے، معاشرے میں اسراف کو روکنا چاہئے۔ ہمارے مرد، ہماری عورتیں، ہمارے نوجوان، ہمارے بزرگ، سب فضول خرچی کو؛ لباس میں فضول خرچی کو، کھانے پینے میں فضول خرچی کو، زندگی کے تجملات میں فضول خرچی کو، گوناگوں سجاوٹوں میں فضول خرچی کو ترک کریں۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی کرنا کہ فلاں شادی میں، فلاں تقریب میں فلاں عورت نے یہ پہنا تھا، اس طرح زیورات پہنے تھے، ایسا میک اپ کیا تھا تو میں بھی پیچھے نہ رہوں، یہ وہی غلطیاں اور بڑے خطرات ہیں۔ یہی چیزیں زندگی کو تباہ کر دیتی ہیں۔ یہی چیزیں معاشرے میں بے انصافی پیدا ہونے کا باعث بنتی ہیں اور سرانجام یہی چیزیں معیشت کو تباہ کر دیتی ہیں۔ معیشت کی تباہی کا بڑا حصہ انہیں چیزوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ معیشت کے اندرونی استحکام کے اعتبار سے اس مقام پر پہنچ جائے کہ کوئی اسے نقصان نہ پہنچا سکے تو جو ضروری اقدامات اسے کرنا چاہئے ان میں ایک یہ ہے کہ اسراف، زیادہ روی اور فضول خرچی کو ترک کرے۔ اس کے مصادیق بہت ہیں اور میں نے اس بارے میں بہت کچھ بیان بھی کیا ہے، لہٰذا اس وقت وہی باتیں دہرانا مناسب نہیں ہے۔ پانی کے بارے میں، روٹی کے بارے میں، غذا کے بارے میں، استعمال کی دیگر گوناگوں چیزوں کے بارے میں اسراف، زیادہ روی اور فضول خرچی یا غلط طریقے سے استعمال کرنا، اس کی مثالیں بہت ہیں۔ ان چیزوں کا ہمیں خیال رکھنا چاہئے۔

ان میں بہت سے کام ایسے ہیں جن کا تعلق حکومت سے نہیں ہے، یہ ہماری اپنی ذمہ داری ہے۔ خود ہمیں اپنے گھر کے اندر، اپنی زندگی میں اس پر عمل کرنا چاہئے۔ یہ امیر المومنین علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنا ہے۔

جب ہم کہتے ہیں: «اَلحَمدُ للهِ الَّذی جَعَلَنا مِنَ المُتَمَسِّکینَ بِوِلایَةِ اَمیرِالمُؤمِنینَ وَ اَولادِهِ المَعصومین»[1] تو ولایت سے یہ تمسک کیسا ہے؟ بے شک ولایت سے تمسک کا ایک پہلو پہلو قلبی تمسک سے عبارت ہے، یعنی آپ ولایت کو تسلیم کرتے ہیں، یہ بہت اچھی بات ہے، بہت ضروری بھی ہے اور یقینا اس کے اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں، مگر تمسک کا مطلب صرف یہی نہیں ہے۔ تمسک کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہم جائزہ لیں اور جن صفات پر ہم عمل پیرا ہو سکتے ہیں، حضرت کا وہ ایثار، وہ روحانی مرتبہ، وہ معرفت، وہ خدا شناسی، وہ عبادت، وہ گریہ، وہ توجہ الی اللہ، اسی طرح کی دیگر خصوصیات تو ہمارے بس کے باہر ہیں، ان وادیوں میں تو ہم بہت زیادہ پیچھے ہیں، مگر صفات بشری کے میدان میں، ان صفات کے میدان میں جو سماج اور حکومت وغیرہ چلانے سے متعلق ہیں، جن پر عمل کرنا ہمارے بس میں ہے، البتہ ان صفات میں بھی ہم ان بزرگوار تک بلکہ ان سے کمتر افراد تک بھی نہیں پہنچ سکتے، مگر اس سمت میں تو آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ہمیں یہ کام کرنا چاہئے۔ یہی ولایت امیر المومنین سے ہمارا تمسک کہا جائے گا۔

بہر حال کہنے کو بہت کچھ ہے۔ میرے عزیز بھائیو اور بہنو! آپ توجہ دیجئے، ہم نے دشمن کے بارے میں، دشمن شناسی کے بارے میں اور دشمن کے مقابلے میں استقامت کے بارے میں بہت کچھ بیان کیا ہے اور بہت کچھ بیان کرتے رہیں گے۔ ہماری یہ ساری باتیں بالکل صحیح ہیں۔ یعنی یہی نعرے جو آپ اور دیگر احباب لگاتے ہیں اور ہمارے عہدیداران کہتے ہیں کہ ہم دشمن کے مقابلے میں ثابت قدمی سے ڈٹے ہوئے ہیں، یہ بالکل صحیح ہے، بالکل درست ہے۔ ہمیں بھی علم ہے کہ دشمن ہے۔ لیکن آپ یہ دھیان رکھئے کہ کبھی کبھی دشمن ہماری کمزوریوں کا فائدہ اٹھاتا ہے اور اسے کوئی زحمت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ ہمیں اپنی اصلاح کرنی چاہئے، اپنے آپ کو درست کرنا چاہئے تاکہ دشمن ہماری کمزوریوں کا فائدہ نہ اٹھا سکے۔ آج ہمارے دشمنوں نے ملک کے اندر اقتصادی مسائل، ضرورتوں اور خامیوں پر نظریں گاڑ رکھی ہیں۔ یہ جو ہم کئی سال اقتصادی مسائل کے بارے میں، استقامتی معیشت کے بارے میں اور اس طرح کے دیگر موضوعات کے بارے میں ابتدائے سال میں، وسط سال میں اور آخر سال میں بار بار تاکید کرتے ہیں، بار بار اسے بیان

۱۔ اقبال الاعمال، جلد ۱، باب پنجم، صفحہ ۴۶۴ (مختصر سے فرق کے ساتھ)۔

کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس خاص پہلو پر دشمن کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ دشمن چاہتے ہیں کہ ملکی معیشت کو تہس نہس کر دیں۔ عوام کی معیشت خراب ہو جائے، لوگوں کی جیبیں خالی ہو جائیں، لوگوں کے وسائل محدود ہو جائیں، پیسے کی قیمت گر جائے، قوت خرید کم ہو جائے تاکہ وہ مخالفت کرنے لگیں۔ یہ دشمنوں کا ہدف ہے۔ وہ اسلام اور اسلامی نظام سے عوام کو برگشتہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ دشمن کا اصلی ہدف ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اقتصادی شعبے کو نشانہ بنایا ہے تاکہ عوام کے حالات خراب ہو جائیں اور وہ اسلام و اسلامی نظام سے دور ہو جائیں۔ اس صورت حال کی مزاحمت کرنا کس کی ذمہ داری ہے؟ سب کی ذمہ داری ہے۔ حکومت کی بھی ذمہ داری ہے، پارلیمنٹ کی بھی ذمہ داری ہے، دیگر عہدیداران کی ذمہ داری ہے، عوام الناس کی بھی ذمہ داری ہے۔ ہم سب کی ذمہ داری ہے، ہمیں اپنی اس ذمہ داری پر عمل کرنا چاہئے۔

البتہ خوش قسمتی سے ملک کی مجموعی پیشرفت بہت اچھی ہے۔ مجھے کافی حد تک واقفیت ہے۔ مجھ سے رجوع کیا جاتا ہے۔ لوگ خط لکھتے ہیں، رجوع کرتے ہیں، پیغام دیتے ہیں، اپنے کاموں کی رپورٹ دیتے ہیں۔ میں بھی تحمل کے ساتھ ان میں سے بہت سی رپورٹوں کا جائزہ لیتا ہوں۔ آج اس ملک میں جو نوجوان احیاء اسلام کے لئے اور دین کے لئے مصروف کار ہیں، بحمد اللہ روز بروز ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو فضل پروردگار سے، نصرت خداوندی سے، ہر دشمن منجملہ امریکا اور صیہونیت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے۔ میں جو اپنی تقاریر میں بار بار کہتا ہوں اور اسے دہراتا رہتا ہوں کہ میں مستقبل کے تعلق سے پرامید ہوں تو اس کی وجہ انہیں حقائق کا مشاہدہ ہے۔ ہمارے پاس بہت سے حقائق ہیں جو ہمیں آگے لے جا سکتے ہیں۔ سماج کو آگے لے جانے والے ہیں۔ اچھے نوجوان، مومن نوجوان، میدان عمل میں وارد ہونے کے لئے پوری طرح تیار نوجوان جو ملک کے دفاع اور دین کے دفاع کے لئے میدان پیکار میں اترنے کے اشتیاق میں اشک بہاتے ہیں اور رو رو کر اجازت مانگتے ہیں کہ انہیں دفاع کے لئے جانے دیا جائے۔ یہ دو چار دس اور سو لوگوں کی بات نہیں ہے، ایسے نوجوانوں کی کثیر تعداد ہے۔ یہ وہی جذبہ ہے جو ملک کو نجات دلائے گا۔ اس کی تقویت کرنا چاہئے۔

و السّلام علیکم و رحمة الله و برکاته

یورپ اور شمالی امریکہ کے جوانوں کے نام
آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کا مکتوب

مقدمہ

رہبر انقلاب اسلامی حضرت آیت اللہ العظمی خامنہ ای نے ۲۱ جنوری ۲۰۱۵ء کو یورپ اور شمالی امریکہ کے جوانوں کو خطاب کرتے ہوئے ایک اہم خط تحریر فرمایا تھا جسے غیر متوقع طور پر عالمی میڈیا اور علمی حلقوں نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مذکورہ خط میں متعدد لطیف نکات موجود ہیں جن کی وجہ سے اس خط کی اہمیت دوچنداں ہو جاتی ہے۔

اولا یہ خط ایک ایسے موقع پر تحریر وشائع کیا گیا جب اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغربی حکومتوں اور ان کی دسترس میں موجود متعدد ذرائع ابلاغ کے ذریعے وسیع پیمانے پر تخریبی ماحول ایجاد کیا جارہا تھا اور یہ ساری سازش فرانس میں دہشت گردانہ حملوں یا مشرق وسطی میں داعش کی وحشیانہ بربریت کو بہانہ بنا کر رچی جارہی تھی۔ یقیناً ایک ایسی خطرناک فضا میں اسلامی جمہوریہ ایران کے دینی وسیاسی رہبر کی جانب سے مذکورہ اقدام دنیا کو کافی کچھ سوچنے پر مجبور کرنے کے لئے کافی تھا خصوصاً اس صورت میں جبکہ مذکورہ خط مغربی ذرائع ابلاغ کے پروپیگنڈے کے برخلاف اسلام کی ایک دوسری تصویر پیش کر رہا تھا۔ مذکورہ خط اسلام کے چہرہ کو مسخ کرنے کے لئے رچی گئی خطرناک سازش سے پردہ اٹھانے کے لئے کافی حد تک موثر تھا۔

ثانیاً ایسا پہلی دفعہ ہوا ہے کہ آیت اللہ خامنہ ای نے مغربی ممالک کے حکام کو مخاطب کرنے کے بجائے یا میخائیل گورباچوف کے نام امام خمینی (رہ) کے مشہور پیغام کے برخلاف مغربی دنیا کے عام جوانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا ہے۔ رہبر انقلاب نے یورپی وامریکی جوانوں کو اپنا مخاطب قرار دئے جانے کی وجہ خود اسی پیغام کے اندر بیان فرمائی ہے کہ نوجوانوں کا مستقبل ساز کردار، اس طبقے کے اندر موجود حقیقت تک رسائی کی تڑپ اور مغربی سیاستدانوں کا صداقت وراستی سے کوسوں دور ہونا اس پیغام کے وجود میں آنے کی وجہ بنا ہے۔ سرحدوں سے

ماورارائے عامہ پر اثر انداز ہونے ،مفاہمت کی فضابرقرار کرنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے یہ خلّاقانہ اقدام غیر روایتی ڈپلومیسی اور سیاسی حکمت عملی کا بہترین نمونہ ہے جو اس حقیقت کا کھلا ثبوت بھی ہے کہ رہبر انقلاب موجودہ سیاسی دنیامیں رائے عامہ کی روزافزوں تاثیر سے کماحقہ واقف ہیں۔

ثالثاً بذات خود رہبر انقلاب کی صوابدید کی بنیاد پر ہی یہ خط پہلے مرحلے میں سوشل میڈیا جیسے ٹوئیٹر کے ذریعے شائع کیا گیا تھا۔ عصر حاضر میں تمام دنیا خصوصاً نوجوان نسل کے اوپر انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور نت نئے ذرائع ابلاغ کے عمیق اثرات کے پیش نظر اس انوکھے اقدام نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ انٹرنیٹ، میڈیا اور مغربی پروپیگنڈہ مشینری کے زبردست حملوں کے مقابلے میں منفعل و شرمندہ ہونے کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ آگے بڑھ کر مد مقابل کا اسی کے ہتھیار چھین کر اور نئی حکمت عملی بنا کر مقابلہ کیا جائے۔

رابعاً مذکورہ پیغام مختصر ہونے کے باوجود اپنے اندر نہایت اہم موضوعات و مسائل کو سموئے ہوئے ہے جو مغربی دنیا سے متعلق مسائل (مثلاً منتقدانہ مغرب شناسی، بڑی طاقتوں کے ہاتھوں خوف و دہشت کی فضا ایجاد کرنا اور دوسروں کی ذہن سازی کرنا، مغربی دنیا میں شکل لیتے ہوئے نئے فکری رجحانات اور افکار عامہ کا بڑھتا شعور اور میڈیا کے ذریعے بے بنیاد باتوں کو اساس بنا کر افکار عامہ کو ایک طے شدہ پالیسی کے تحت اپنے مقاصد کے لئے موڑنا وغیرہ) کے ساتھ ساتھ اسلام سے متعلق مسائل جیسے اسلام کی حقیقی شناخت کی دعوت یا اسلام کے بنیادی منابع یعنی قرآن و سنت کی جانب رجوع کی دعوت وغیرہ موضوعات کو بھی اپنے اندر شامل کئے ہے۔ یہ موضوعات اسلام اور مغربی دنیا سے متعلق نئے انداز سے غور و خوض کرنے کے لئے ایک نیا دریچہ بآسانی کھول سکتے ہیں جس کا دائرہ مفکرین اور دانشوروں سے بھی ماورا ہوگا۔ نیز ان موضوعات پر غور و خوض موجودہ مسائل کو حل کرنے کی راہ میں کافی حد تک موثر ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ رہبر انقلاب کا یہ خط اور یہ پیغام ایک نئی راہ کا آغاز ہے۔ ایک ایسا راستہ جو ارتباط و روابط کے سلسلے میں ایک عملی منصوبہ کا کام انجام دے گا جس پر چل کر روشن فکر اور کھلی سوچ رکھنے والا طبقہ خصوصاً جوان طبقہ ایک پلیٹ فارم پر یکجا ہو کر منطق و استدلال کی بنیاد پر موجودہ سامراجی نظام کی تلقینات سے آزاد ہو کر ادراک ،افہام و تفہیم، غلط فہمیوں کے ازالے اور انسانی معاشرے کے مشترک مسائل کے تدارک کی خاطر آپسی گفت و شنید کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔

آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کے اس اہم خط کے سلسلے میں ایرانی محققین کے مضامین کو شائع کیا جارہا ہے جس میں رہبر انقلاب کے مذکورہ خط کے بنیادی موضوعات کی وضاحت و تشریح کی گئی ہے۔ سب سے پہلے ہم آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای کے اس پر مغز خط کے ترجمہ کو یہاں پیش کرتے ہیں:

یورپ اور شمالی امریکہ کے جوانوں کے نام مکتوب کا متن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزشتہ دنوں فرانس میں رونما ہونے والا واقعہ اور کچھ دیگر مغربی ممالک میں اسی قسم کے دوسرے واقعات نے مجھے اس امر پر مجبور کر دیا ہے کہ میں ان حالات کے بارے میں براہ راست آپ سے گفتگو کروں۔ میں آپ جوانوں سے گفتگو کر رہا ہوں، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں آپ کے والدین کو نظر انداز کر رہا ہوں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں آپ کی قوم اور آپ کے ملک کا مستقبل آپ کے ہاتھوں میں دیکھ رہا ہوں اور اس لئے بھی آپ سے مخاطب ہوں کیونکہ میں آپ کے دلوں میں حقیقت کو حاصل کرنے کی لگن و تڑپ زیادہ اور غیر معمولی طور پر دیکھ رہا ہوں۔ میں اس خط میں آپ کے سیاسی ماہروں اور حاکموں سے مخاطب نہیں ہوں کیونکہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ ان لوگوں نے مکمل طور پر جانتے بوجھتے ہوئے اپنی سیاست کا راستہ صداقت کے راستے سے جدا کر لیا ہے۔

میں اس وقت آپ سے اسلام کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں، خصوصاً اسلام کی اس شکل و صورت کے بارے میں جو عام طور پر آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ گذشتہ بیس برسوں میں یعنی تقریباً سوویت یونین کے بکھرنے کے بعد سے بہت زیادہ کوشش کی گئی ہے کہ اس عظیم آسمانی دین کو ایک خوفناک دشمن کی شکل میں پیش کیا جائے۔ افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ مغربی ممالک کی سیاسی تاریخ میں ایک طویل عرصے سے خوف و نفرت کو بھڑکانے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی پالیسی پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ میں یہاں مغربی اقوام کے درمیان مختلف اقسام کے خوف و دہشت کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔ اگر آپ بذات خود سمجھتے بوجھتے ہوئے تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ اس جدید دور میں دنیا کی دوسری اقوام اور ثقافتوں کے ساتھ مغربی حکومتوں کے غلط، جھوٹے اور مکاری بھرے برتاؤ کی بے تحاشا مذمت کی گئی ہے۔ یورپ و امریکا کی تاریخ غلامی کے سلسلے میں آج تک احساس شرمندگی کا شکار ہے، سامراجیت کی وجہ سے اس کا سر جھکا ہوا ہے، سیاہ رنگ والوں اور غیر عیسائیوں پر مظالم سے شرمسار ہے،

کیتھولک و پروٹسٹنٹ کے درمیان مذہب کے نام پر خون خرابے اور پہلی و دوسری جنگ عظیم میں نسل و قوم پرستی کی بنیاد پر خون کی ہولی کی وجہ سے آپ کی تاریخ پر مفکرین و دانشور طبقہ آج تک احساس شرمندگی کا شکار بنا ہوا ہے۔

یہ شرمندگی بذات خود ایک نیک و قابل ستائش چیز ہے۔ان نکات کو آپ کے سامنے پیش کرنے سے میرا مقصد تاریخ کی مذمت کرنا قطعاً نہیں ہے بلکہ میں تو آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنے دانشوروں اور مفکرین سے سوال کریں کہ مغربی دنیا میں عوام کا ذہن و ضمیر دسیوں یا سینکڑوں سال بعد کیوں بیدار ہوتا ہے؟ قدیم تاریخ کے بجائے جدید روزمرہ مسائل پر نئے سرے سے غور وخوض کیوں نہیں کیا جاتا؟ اسلامی تفکر اور اسلامی ثقافت و تہذیب کی ترویج میں رکاوٹ کیوں پیدا کی جاتی ہے؟

آپ بخوبی جانتے ہیں کہ توہین کرنا، نفرت کی فضا تیار کرنا اور دوسروں سے متعلق خیالی خوف پیدا کرنا وہ مشترکہ نکات ہیں جن کے ذریعے ظالم طبقہ بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی ذات سے سوال کریں کہ اس بار اتنی تیزی کے ساتھ خوف و دہشت کی فضا ہموار کرنے اور نفرتیں پھیلانے کی پرانی سیاست نے اسلام و مسلمین کو کیوں نشانہ بنا رکھا ہے؟ اور کیوں موجودہ مادی طاقتیں اسلام کو ایک کونے میں ڈھکیلنا چاہتی ہیں اور کیوں اس دین کا گلا گھونٹنا چاہتی ہیں؟ اسلام کے کون سے اقدار اور کون سی تعلیمات ان بڑی طاقتوں کے منصوبوں کے لئے خطرہ ہیں اور اسلام کی مسخ شدہ تصویر دنیا کے سامنے پیش کرنے سے انہیں کیا فائدہ ہوگا؟

اس لئے میری اولین درخواست یہ ہے کہ آپ اسلام کے خلاف اتنے وسیع پیمانے پر ہونے والے اس پروپیگنڈے کے وجوہات کے سلسلے میں تحقیقات کیجئے۔

میری دوسری درخواست یہ ہے کہ اسلام کے خلاف منفی پالیسیوں اور پروپیگنڈوں کی اس بوچھار کے رد عمل میں آپ براہ راست اسلام کو پہچانئے۔ عقل سلیم کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ کم از کم یہ جان لیں کہ وہ شئ جس سے آپ کو خوف زدہ کیا جاتا ہے اور دور رکھا جاتا ہے وہ آخر ہے کیا اور کیسی ہے؟ میں اس بات پر زور نہیں دیتا کہ آپ اسلام کے بارے میں میرا یا دوسروں کا ہی نظریہ قبول کرلیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ قطعاً اس بات کی اجازت نہ دیں کہ موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ اثر انداز واقعیت کو غلط مقاصد و خواہشات کی وجہ سے آپ کے سامنے مسخ کرکے پیش کیا جائے۔اس بات کی اجازت بالکل مت دیجئے کہ یہ

لوگ جھوٹے دعوے کرکے اپنے پالتو دہشت گردوں کو اسلام کے نمائندوں کے عنوان سے آپ کے سامنے پیش کریں۔ آپ اسلام کو اسلام کے اصلی منابع و ماخذ کے توسط سے پہچاننے کی کوشش کیجئے۔ اسلام کو قرآن کریم کے ذریعے اور رسول اسلامؐ کی حیات طیبہ کو پیش نظر رکھ کر سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

اب میں یہاں پر آپ سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ نے آج تک براہ راست خود مسلمانوں کے قرآن کی جانب رجوع کیا ہے؟ کیا پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات اور ان کی اخلاقی و انسانی سیرت کا مطالعہ کیا ہے؟ کیا آپ نے میڈیا کے علاوہ کسی دوسرے ذریعے سے پیغام اسلام کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے؟ کیا آپ نے کبھی اپنے آپ سے سوال کیا ہے کہ اسی اسلام نے برسہابرس تک کون سے اقدار کی بنیاد پر دنیا کے علمی و فکری تمدن کی آبیاری کرکے عظیم مفکر و دانشور پروان چڑھائے ہیں؟

میں چاہتا ہوں کہ آپ قطعاً اس بات کی اجازت مت دیجئے کہ وہ کمزور و غلط باتوں کے ذریعے آپ کے اور حقائق کے درمیان جذبات و احساسات کی دیوار حائل کر دیں۔ آج ذرائع ابلاغ کے نت نئے آلات نے جغرافیائی سرحدوں کو مسمار کر دیا ہے، کسی کو بھی اس بات کی اجازت مت دیجئے کہ وہ آپ کو اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی ذہنی سرحدوں میں مقید کر دے۔ اگرچہ کوئی بھی فرد اس ایجاد شدہ خلا کو پر نہیں کر سکتا لیکن آپ میں سے ہر ایک اپنے لئے اور اپنے ارد گرد کی فضا کو حقائق سے آشنا کرنے کے لئے اس خلا کے اوپر تفکر و انصاف کا پل بنا سکتا ہے۔

یہ چیلنج اسلام اور آپ جوانوں کے درمیان پہلے سے طے شدہ پلاننگ کی وجہ سے ناگوار تو نظر آئے گا لیکن یہ آپ کے جستجو اور کھوج بین والے ذہن کو نئے نئے سوالات کے جوابات تلاش کرنے پر ضرور ابھار سکتا ہے۔ یہ اقدام آپ کے پاس ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کا بہترین موقع ہے جس میں نئے نئے حقائق آپ کے سامنے خود بخود آجائیں گے۔ لہٰذا اسلام کا بہتر طور پر ادراک کرنے کے لئے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایئے تاکہ حقیقت کے سامنے اپنی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی وجہ سے آئندہ آنے والی نسلیں مغربی دنیا اور اسلام کے درمیان رشتوں پر قلم اٹھاتے ہوئے کسی قدر کم رنجیدہ ہوں۔

سید علی خامنہ ای

عصر حاضر میں فکری، روحانی اور معرفتی خلاء کو پُر کرنے کے لئے اسلامی تعلیمات کا احیاء

مولف: آیت اللہ صادق رشاد
مترجم: محمد حسن زیدی

ابلاغ پیغام سنت نبوی ہے

آیت اللہ خامنہ ای نے یورپ اور امریکی جوانوں کے نام خط لکھ کر در حقیقت سنت نبوی پر عمل کیا ہے۔ اپنے مخاطبین سے اس انداز سے بات کرنے کی بنیاد خود رسول اسلامؐ نے ہی ڈالی ہے۔ تاریخ اسلام میں اس حقیقت کا ہم مسلسل مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ جب بھی رسول اکرمؐ کچھ افراد کو کسی خطے میں روانہ فرماتے تھے تو دوسرے احکامات کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو یہی آپ کی پہلی نصیحت ہوتی تھی کہ وہاں کے جوانوں پر خصوصی توجہ دینا۔ رسول اکرمؐ فرمایا کرتے تھے: علیکم بالاحداث فانهم اسرع الی کل خیر۔ جوانوں پر توجہ دو کیونکہ وہ نیکیوں کی جانب راغب ہونے میں تیز ہوتے ہیں۔

بنیادی طور پر خود آنحضرتؐ جب دوسرے افراد سے ملاقات فرمایا کرتے تھے تو جوانوں پر خصوصیت کے ساتھ توجہ فرماتے تھے اور اپنے نمائندوں سے بھی تاکید کرتے تھے کہ جوانوں کے ساتھ روابط زیادہ رکھا کرو۔ خود آنحضرتؐ کا طریقہ کار یہ تھا کہ آپ جوان طبقے کو اپنی جانب متوجہ فرمایا کرتے تھے اور جوانوں کے دلوں کو تبدیل کیا کرتے تھے کیونکہ یہ طبقہ فطرت الٰہی سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے۔ جوانوں میں تبدیلی لانے کا ثمرہ یہ ہوتا تھا کہ ان کے خانوادوں پر بھی اس کا مثبت اثر ہوا کرتا تھا۔ عام طور پر جب کوئی جوان پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور وہ منقلب ہو کر واپس جاتا تھا تو اس کا کردار و رفتار اور اخلاق اس قدر بدل چکا ہوتا تھا کہ اس کے اہل خانہ خود بخود اس کی جانب متوجہ ہو جایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے والدین حیرت میں پڑ جایا کرتے تھے کہ اچانک اتنی تبدیلی کیسے آ گئی ہے بلکہ فوراً سوال بھی کر لیا کرتے تھے کہ یہ کیا

ہو گیا ہے؟ کس سے مل کر آ رہے ہو کہ اتنے تبدیل ہو گئے ہو؟

جب ان کے بچے وضاحت کرتے تھے کہ یہ انقلاب کیسے آیا ہے اور کس ہستی کے زیر اثر اتنی تبدیلی آئی ہے جو یہ بھی فرماتے ہیں کہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی واحسان کیا کرو تو فہیم والدین کہا کرتے تھے کہ ضرور یہ ہستی کوئی پیغمبر ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جوان اور نئی نسل جب پیغمبر اکرمؐ کی دعوت پر لبیک کہتی تھی تو گذشتہ نسل سے اس کی جھڑپیں بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ جو افراد اپنے اسلاف کے غلط عقائد پر پختگی کے ساتھ عمل کیا کرتے تھے وہ رسول اکرمؐ کے آس پاس نظر بھی نہیں آتے تھے جس کی وجہ سے گھرانوں میں اختلافات رونما ہو جایا کرتے تھے۔ کچھ افراد انہیں اختلافات کو بہانہ بنا کر رسول اللہؐ پر الزام بھی لگایا کرتے تھے کہ آپ گھرانوں میں اختلافات کی بنیاد بن رہے ہیں اور جوانوں کو اپنے والدین اور بزرگوں کی مخالفت پر مجبور کر رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ آنحضرتؐ جوان طبقے پر خصوصی توجہ فرمایا کرتے تھے اور اس طرح یہ کردار و رفتار ایک دینی سنت ٹھہرتی ہے جس پر عمل درآمد اس سنت کا احیا ہے۔

رہبر انقلاب کا یہ اقدام ایک قسم کی رہنمائی ہے۔ یہ خط اس لئے تحریر کیا گیا ہے تاکہ یہ سمجھا یا جاسکے کہ عصر حاضر میں ہماری ذمہ داری کیا ہے اور کس شئ پر بیشتر توجہ دینا چاہئے؟ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے ہمارے پاس متعدد دینی تعلیمات و پیغامات موجود ہیں اور اگر ہم ان پیغامات کو دنیا کے مختلف خطوں و طبقوں تک پہونچا پاتے ہیں تو ہم کامیاب ہیں اور اگر ہم ایسا نہیں کرسکے یا ہم سے کوتاہیاں ہو گئیں تو ہم نے نقصان کا سودا کیا ہے۔ دوسروں خصوصاً جوانوں تک اپنا دینی پیغام پہونچانے میں ہم نے بہت کوتاہیاں کی ہیں اور بہت غفلت برتی ہے۔

حضرت امام خمینی(رہ) اس موضوع پر خصوصی توجہ فرمایا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ اندرون ملک جوان طبقہ آپ کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ انقلاب اسلامی کی بنیاد جوان نسل کی فکر وجوش اور صلاحیتوں پر ہی رکھی گئی تھی۔ امام خمینی(رہ) کی گفتگو جوان طبقے پر زیادہ اثر انداز ہوا کرتی تھی لیکن ہم نے اتنا سب کچھ مشاہدہ کرنے کے بعد بھی اس اہم ترین موضوع کو یکسر بھلا دیا ہے اور اس رابطے کو وسیع پیمانے پر اور منظّم طریقہ سے آگے بڑھانے کے سلسلے میں کوئی چارہ اندیشی بھی نہیں کی ہے۔

گورباچوف کے نام امام خمینی (رہ) کا خط اور اس سے متعلق ہماری تاریخی غفلت

امام خمینی (رہ) کا گورباچوف کے نام خط ایک بہت بڑا تاریخی واقعہ ہے اور عصر رسول اسلامؐ کے بعد اس قسم کے اقدامات شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ اس سے پہلے اس قسم کا کوئی واقعہ نظر نہیں آتا جب امام خمینی (رہ) جیسی کسی عظیم شخصیت نے کسی سپر پاور کو اس طرح کا پیغام ارسال کیا ہو اور خط بھی ایسا کہ جس کا مضمون اور جس کے اندر تحریر شدہ قطعی پیشین گوئیاں مرسل الیہ پر یہ حقائق ثابت کرنے کے لئے کافی ہوں کہ اب اس کا زوال شروع ہو چکا ہے نیز اسی خط میں یہ بھی بتایا جارہا ہو کہ زوال کے بعد رونما ہونے والے حالات میں کیا کیا جانا چاہئے۔ اس سماج کی اہم شخصیات کو ان حقائق کی جانب متوجہ کرانا ایک بہت اہم اقدام تھا۔ یوں تو مارکس ازم ایک ایسی تحریک ہے جو سماجی حیثیت سے نہایت ناکارہ اور غیر مفید ہے مگر اس کی فلسفی بنیادیں کافی گہری ہیں۔ یہاں تک کہ اس تحریک کے بانیوں نے اپنے لئے ایک جدا فلسفہ بھی تراش لیا ہے۔ اس فلسفے کو حکومتوں اور حاکموں نے تمام خامیوں کے باوجود دنیا میں کافی دور دور تک پہونچانے میں بھی کامیابی حاصل کر لی تھی یہاں تک کہ ان افراد نے یہ دعویٰ بھی کر دیا کہ ان پڑھ کاریگروں کا طبقہ بھی مارکس کے اس فلسفی پیغام کے ہمراہ ہو گیا ہے۔

امام خمینی (رہ) کا خط فلسفی، عرفانی پہلو لئے ہوئے تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا نعروں سے مکمل طور پر بے حال ہو چکی تھی۔ مشرقی دنیا جس کا مرکز سوویت یونین تھا، سیاسی اور سماجی بحثوں سے خستہ ہو چکی تھی کیونکہ قریب ایک صدی کا عرصہ گزر چکا تھا اور ان نعروں اور پیغاموں کے علاوہ کچھ سنائی نہیں پڑ رہا تھا۔ لہٰذا اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک عمیق روحانی اور عرفانی تفکر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور امام خمینی (رہ) کا پیغام یہی جہت اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔

پیغام امام کے سلسلے میں ہم لوگوں سے کوتاہی ہوئی ہے اور اس خط پر جتنی توجہ دی جانی چاہئے تھی اتنی نہیں دی گئی۔ ہم نے اس پیغام کے سلسلے میں کوئی اہم اقدام نہیں کیا ہے جبکہ اس پیغام کے مضامین نہایت ہی عمیق ہیں جس میں ایک سیاسی نظام کے زوال کی پیشین گوئی کی گئی تھی جو کچھ ہی عرصے کے بعد محقق بھی ہو گئی تھی۔

میں نے روس کے کئی سفر کئے ہیں اور وہاں کی کئی یونیورسٹیوں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے مگر وہاں بھی ابھی تک بہت سے افراد اس پیغام سے مطلع نہیں ہیں۔ کچھ افراد اس پیغام سے آشنا ہیں لیکن

اس کو مزید سمجھنے کے لئے ان کے پاس کوئی کتاب نہیں ہے۔ مثال کے طور پر امام خمینی(رہ) نے اپنے اس پیغام میں ایک تجویز یہ رکھی تھی کہ ابن عربی کی «فصوص الحکم» یا ابن سینا اور «صدر المتالہین» کی کتب کا مطالعہ کیا جانا چاہئے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس خطے میں کچھ جگہوں پر سرے سے فلسفہ پایا ہی نہیں جاتا یا وہاں یہ کتب موجود ہی نہیں ہیں۔ یہ تمام کتب عربی زبان میں ہیں اور ابھی تک انگریزی اور یورپی زبانوں میں ان کا ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بعض کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جن میں سے کچھ کلیسا سے بھی وابستہ ہیں، نہایت ہی سطحی کتب کی یہ فرض کرکے تدریس کی جارہی ہے کہ یہی کتب اس ضرورت کی تکمیل کر سکتی ہیں۔

ایک بار وہاں سے واپس آنے کے بعد اندیشہ جوان سنٹر سے شائع شدہ فلسفہ اسلامی سے متعلق ایک آسان سی کتاب ہم نے وہاں ارسال کی تھی۔ ان لوگوں نے اسی کتاب کو ترجمہ کرکے اپنے نصاب کا حصہ بنا لیا تھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو کتابچہ نہایت ہی سادہ سی زبان میں یہاں کے جوانوں کو فلسفہ صدرائی سمجھانے کے لئے تالیف کیا جاتا ہے وہ وہاں کے تعلیمی نظام کا حصہ بن گیا جس کا خوب خوب استقبال بھی کیا گیا۔ گذشتہ سفر میں میری ملاقات روس میں ایران کے سفیر سے بھی ہوئی تھی۔ اس جلسے میں میں نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ امام خمینی نے اپنے پیغام میں جن کتب کی نشاندہی فرمائی ہے کم از کم انہی کتب کا ماسکو سے ترجمہ کرواکر شائع کروادیجئے تاکہ جن ہستیوں کی جانب امام خمینی(رہ) نے اشارہ فرمایا ہے ان سے متعلق یہاں ایک شناخت پیدا ہوجائے یا پھر اتنا تو ہو ہی جائے کہ ان کتب میں موجود مضامین کا خلاصہ یہاں کی فکری وثقافتی زبان میں ترجمہ کراکے شائع کردیا جائے۔ میں نے اسی موقع پر اس بات پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ہم نے ابھی تک اس تاریخی پیغام کے مضامین ومفاہیم کی نشر واشاعت کے سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کیا ہے۔

البتہ ملک کے اندر ضرور اس سلسلے میں کچھ اقدامات کئے گئے ہیں مثلا مرحوم محمدی گلپایگانی نے اس پیغام کی شرح فرمائی ہے لیکن ملک سے باہر اس سلسلے میں کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔ ہم اس خط کے سلسلے میں ایک تاریخی خطا کے مرتکب ہوئے ہیں جس کے لئے ہمیں تاریخ، امام خمینی(رہ) اور خداوند عالم کے حضور میں عذر خواہی کرنا چاہئے۔ ہمارے سیاسی نظام، ہماری حکومت، ہمارے ثقافتی اداروں، ہماری یونیورسٹیوں اور ہمارے حوزہ نے اس سلسلے میں کوتاہی کی ہے جس کے لئے ہم سبھی کو استغفار کرنا

چاہئے۔ مجھے خوف یہ ہے کہ آیت العظمی خامنہ ای کے گذشتہ پیغام کا حشر بھی اسی قسم کا نہ ہو جائے۔ ہم نے اس سلسلے میں ابھی تک کوئی موثر سیاسی اقدام نہیں کیا ہے۔ کبھی کبھی ملک کے اندر تو کچھ اقدام ہو بھی جاتے ہیں از قبیل جلسات، نشستیں یا سمینار وغیرہ جن میں ذمہ دار حضرات بھی شرکت کر لیتے ہیں لیکن چند روز بعد ہی نظر آتا ہے کہ آمدند و نشستند و برخاستند یعنی پروگرام تو ہو جاتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کچھ نظر نہیں آتا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تنہا ایک فرد اتنا بڑا کام کر جاتا ہے کہ اس کے کام کا اثر بڑے وسیع پیمانے پر ہوتا ہے جب کہ اس کام کے لئے اس کی حمایت بھی نہیں ہوتی ہے۔ میں نے ایسے افراد کا مشاہدہ ایران کے اندر بھی کیا ہے اور ایران کے باہر بھی ایسے افراد سے ملاقاتیں کی ہیں۔

دنیا اسلامی تعلیمات کی پیاسی ہے

ہم دنیا کے سامنے کیا پیش کر سکتے ہیں؟ تاریخ کے آغاز سے ہی اسلام کی گود میں توحید کی شکل میں ایک قیمتی گوہر موجود رہا ہے۔ بنیادی طور پر اسلام نے اصل اثبات خدا کے سلسلے میں بہت زیادہ گفتگو نہیں کی ہے اور خود قرآن میں بھی اثبات وجود خدا پر زیادہ آیتیں نظر نہیں آتی ہیں۔ قرآن کریم نے سب سے زیادہ شرک سے جنگ کی ہے۔ اثبات وجود خدا کو تو قرآن کریم نے حل شدہ مسئلہ تسلیم کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج دنیا کو توحید کی شدید ضرورت ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر بھی لیں کہ ادیان اور مراحل تکامل دین کے سلسلے میں جو باتیں ہوتی ہیں وہ صحیح ہیں جب کہ قطعاً صحیح نہیں ہیں اور ہم صرف تسامحاً ان کی بات کو صحیح فرض کر لیتے ہیں کہ آغاز میں انسانی سماج شرک سے آلودہ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ توحید نے اپنی جڑیں مضبوط کی ہیں۔ اگر ہم اسے صحیح فرض بھی کر لیں تب بھی دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے ہمارے پاس ایک نایاب ہیرا موجود ہے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسان فطری طور پر موحّد ہے۔ اس دنیا میں آنے والا پہلا انسان بھی موحد تھا اور خداوند متعال نے اپنے پہلے نبی کو بھی توحید کے پیغام کے ساتھ ہی دنیا میں بھیجا تھا۔

ہمارے پاس دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے ایک نہایت قیمتی گوہر موجود ہے جس کی دنیا کو شدید ضرورت ہے اور خاص بات یہ ہے کہ یہ انمول گوہر ہمارے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے کیونکہ موجودہ فرق و مسالک یا تو بے خدائی اور ایک مطلق خلا کا شکار ہو گئے ہیں جو ہستی کے لئے کسی روح کے قائل نہیں ہیں

جس کی وجہ سے وہ حیران و پریشان ہیں یا مبہم، بے بنیاد و بے معنی مفاہیم پیش کرتے ہیں جس سے انسانی ذہن مزید الجھ جاتا ہے۔امر قدسی کی بات کرتے ہیں۔ یہ امر قدسی کیا ہے؟اس مسئلے پر جتنا غور و خوض کیا جائے انسان وہم و گمان سے آگے قدم نہیں بڑھا پاتا، گویا نور خیالی کے وسط میں امر قدسی کی ایک مبہم سی فضا پائی جاتی ہے۔آگے بڑھئے تو غیر معین خدا کا نظریہ بھی سامنے آتا ہے۔آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شئ موجود بھی ہو اور معین بھی نہ ہو؟ عقیدۂ تثلیث کا معاملہ بھی اسی طرح ہے۔بعض عیسائی دانشور و مفکرین بلکہ بعض عیسائی علماء بھی اس عقیدۂ تثلیث پر سوال اٹھاتے نظر آتے ہیں۔اتنا ہی نہیں بلکہ اس عقیدے کے خلاف کتابیں بھی تحریر کی گئی ہیں، یہاں تک کہ اس عقیدے کی مخالفت کی وجہ سے تکفیر اور قتل تک بھی بات پہونچ چکی ہے۔ مغربی دنیا کے فلاسفہ اسی عقیدے کی وجہ سے دین سے جدا ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر برٹرانڈرسل اپنی کتاب ''میں کیوں عیسائی نہیں ہوں'' میں رقم طراز ہیں:

> ''جب تک میں نے ریاضیات نہیں پڑھی تھی تب تک میں اپنے والدین کی اس بات کو آسانی سے قبول کر لیتا تھا کہ خدا تین ہیں۔ تین ہوتے ہوئے ایک ہے اور ایک ہوتے ہوئے تین ہیں لیکن جب میں نے اسکول میں ریاضیات پڑھی تو میرے ذہن میں سوال پیدا ہونے لگا کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تین ایک ہو جائے اور ایک تین ہو جائے؟ اس کے بعد میرے لئے واضح ہو گیا کہ اس دین کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔''

آج بھی کلیسا میں اسی نظریۂ تثلیث کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے جس کی بعض افراد توجیہ بھی کرتے نظر آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بس کسی طرح سے اس نظریے کو ثابت کر دیں۔اس نظریے کی توجیہ کے لئے ایسے ایسے دلائل لے کر آتے ہیں جن سے خود ان تعلیمات پر ہی سوال اٹھتا ہے۔کہتے ہیں کہ آخر معارف و عقائد کے عقلی ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ انسان کو بس مومن ہونا چاہئے جس کے بعد قطعاً ضروری نہیں ہے کہ اس کا ایمان معقول بھی ہو اور اس کا نام وہ فڈیسم (Fideism) رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دین و عقل کا میدان الگ الگ ہے چونکہ ان کے پاس ان سوالوں اور اعتراضوں کا کوئی جواب نہیں ہوتا اس لئے عقل کو ہی زیر سوال لے آتے ہیں جبکہ یہ وہ سوالات ہیں جو بنیادی عقائد سے متعلق ہوتے ہیں اور جن کا مرکز دین اور جن کی اساس خدا ہوتا ہے کیونکہ اس اساس سے گہری دوسری کوئی اساس ہے ہی نہیں۔یہی وجہ ہے کہ یہ افراد عقل کو ہی سوالات کے کٹگھرے میں کھڑا کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عقل ہمارے معاملات میں دخل

اندازی کرتی ہے جس کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔ یہودیت و عیسائیت میں خدا کے بارے میں اسی قسم کے تصورات پائے جاتے ہیں۔ یہ تصورات کہاں اور ہمارا ترقی یافتہ تصور کہاں؟

ہم جس تصور و عقیدے کی بات کرتے ہیں وہ کسی بھی عاقل و متفکر انسان کو ایک نہایت عظیم پیغام دیتا نظر آتا ہے اور اگر بہتر طور پر تشریح و توضیح ہو جائے تو ہمارا عقیدہ ساری دنیا کو جاذب و خوبصورت نظر آئے گا۔ ہمارے عمیق منابع و ماخذ، ہمارا عرفان اور ہماری نہج البلاغہ کے اندر اتنی ہی کشش ہے۔ ہمارے پاس پورا خزانہ موجود ہے۔ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک نہج البلاغہ کو دنیا نے پہچانا ہی نہیں ہے۔ نہج البلاغہ آج بھی متروک ہے۔ نہج البلاغہ نے توحید کے عالی مفاہیم کو جس خوبصورت انداز میں بیان کر دیا ہے وہ اپنے آپ میں لاجواب ہے۔ نہج البلاغہ کے توسط سے ان عظیم مفاہیم کا ادراک کرنا دوسرے کسی بھی ماخذ کے توسط سے سمجھنے سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ واقعیت یہی ہے کہ ابھی تک نہج البلاغہ کے عمق تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔

مخاطبین پیغام کو قرآن و سنت کی دعوت دی گئی ہے

رہبر انقلاب نے اپنے پیغام میں اس پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ قطعاً دوسری کتب کا مطالعہ مت کیجئے بلکہ اگر اسلام کو سمجھنا ہے تو براہ راست قرآن کریم اور سنت کے توسط سے سمجھئے۔ اگر ہم اسی نہج البلاغہ اور قرآن کریم کا بہترین ترجمہ کر دیں تو یہی کافی ہوگا۔ بارہا ایسے دانشور افراد سے میری ملاقات ہوئی ہے جو وہیں یورپ میں دل کی گہرائیوں سے مضبوط ایمان کے ساتھ مسلمان ہوئے ہیں جبکہ ان کی دسترس میں ان کتابوں کے علاوہ اور دوسری کوئی کتاب تھی ہی نہیں۔ مثلا کسی نے کہا کہ میں نے ایک ایسی کتاب کا مطالعہ کیا ہے جو نہایت ہی عمیق و دلکش ہے۔ میں نے سوال کیا کہ کتاب کا نام کیا ہے تو کہا کہ قرآن اور اس نے یہ بھی کہا کہ میں اسی ایک کتاب کا مطالعہ کرکے مسلمان ہوا ہوں۔ اس کتاب کے علاوہ میں نے دوسری کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے اور نہ ہی اس کتاب کے علاوہ کسی نے مجھے اسلام سے متعلق کچھ بتایا یا سمجھایا ہے۔ اس قسم کے واقعات کا میں نے بہت مشاہدہ کیا ہے۔ چھ جلدی کتاب "امام علی: صدائے عدالت انسانی" کے مولف جارج جرداق کا واقعہ بھی اسی طرح ہے۔ ایک بار بیروت میں میرا ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہیں میں نے ان سے سوال کیا تھا کہ آخر ایک مشہور عیسائی ادیب و متفکر اچانک نہج البلاغہ کا عاشق کیسے ہو گیا؟

انہوں نے بتایا کہ میں جب تعلیم حاصل کر رہا تھا تو اکثر کالج سے بھاگ جایا کرتا تھا۔ایک بار میں اپنے قصبے سے باہر نکل گیا تھا۔ میرے اساتید، والد اور بھائی میری تلاش میں تھے۔تلاش کرتے کرتے وہ اس درخت کے پاس پہونچ گئے جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ درخت کے سائے میں مجھے نیند آ گئی تھی۔ غضبناک حالت میں مجھے بیدار کیا گیا اور فوراً ہی سوالات کی جھڑی لگا دی کہ کہاں آئے دن فرار کر جاتے ہو اور کلاس میں شرکت کیوں نہیں کرتے؟ میرے بھائی نے کہا کہ ذرا مجھے بھی دیکھنے دیجئے کہ آخر یہ روز روز بھاگتا کیوں ہے؟ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آرام سے بتاؤ کہ تمہارے کالج سے فرار کرنے کی وجہ کیا ہے اور اگر کالج نہیں جانا چاہتے تو پھر آخر کرنا کیا چاہتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ مجھے تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے (البتہ آگے چل کر انہوں نے میڈیکل سائنس میں اعلی ڈگری بھی حاصل کی) مجھے ادبیات سے شغف ہے۔ میرا بھائی بھی اہل ادب تھا۔اس نے فوراً سوال کیا کہ کیا واقعاً ادبیات سے دلچسپی رکھتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہاں۔اس نے کہا کہ اچھا میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں ایک کتاب دکھاتا ہوں اور وہ کتاب نہج البلاغہ تھی۔ جیسے ہی وہ کتاب میرے ہاتھ لگی میں تو اس کا دیوانہ ہو گیا۔اس کے بعد سے ہمیشہ نہج البلاغہ میرے سرہانے موجود رہتی ہے۔

آگے چل کر انہوں نے وہ تاریخی کتاب لکھی جو اپنے آپ میں بے نظیر ہے اور شیعہ بھی اس کتاب کے جیسی دوسری کوئی کتاب دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکے ہیں۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں موجودہ دنیا کے مسائل کو نہج البلاغہ سے استخراج کرتے ہوئے عصری زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ موجودہ زمانے کے تمام اہم مسائل جیسے حقوق انسانی، جمہوریت، آزادی وغیرہ اس کتاب کے موضوعات ہیں اور یہ وہ موضوعات ہیں جو آج کے بشر کا ارمان سمجھے جاتے ہیں جس کے بعد یہ دعویٰ بھی کر دیا گیا ہے کہ اب بشر اپنی معراج پر پہونچ گیا ہے۔ایک عیسائی نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اگر فقط انہیں موضوعات کو مد نظر رکھا جائے تب بھی نہج البلاغہ بے نظیر ہے۔ نہج البلاغہ کی طرح عرفان اسلامی بھی لاجواب ہے۔جو مفاہیم و مضامین ہمارے عرفان اسلامی میں پائے جاتے ہیں وہ نہایت گرانقدر اور عمیق ہیں۔

ایک بار ویٹیکن سٹی بھی میرا جانا ہوا تھا۔ سفر کے دوران ہمیں ایک ایسے شہر بھی لے جایا گیا جو روم سے تقریباً پچاس کیلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔پوپ گرمیوں میں وہیں قیام کرتے ہیں۔اس شہر میں ایک ایسا ادارہ بھی ہے جہاں ضرور جانا چاہئے۔ اسی ادارے میں ایک شخص ایسا بھی ہے جس نے ایران کا ایک سفر کیا

تھا اور واپسی کے بعد وہ اپنے اس سفر سے اتنا خوش تھا کہ اس نے اس کے متعلق ایک کتاب بھی تحریر کی ہے۔اس سفر کے دوران اس شخص کی ملاقات آیت اللہ امامی کاشانی سے بھی ہوئی تھی۔ملاقات کے دوران آیت اللہ کاشانی نے اسے عرفان، عشق و محبت جیسے مسائل سے متعلق ایک قصہ سنایا تھا۔مجھ سے ملاقات ہوئی تو اس نے وہ قصہ مجھے بھی سنایا۔ قصہ یوں تھا کہ ایک لڑکی کسی جوان پر عاشق ہو گئی تھی۔اس جوان کو دیکھنے کی خاطر وہ بہانے بہانے سے فرش اپنے کھڑکی کے پاس لاتی تھی اور جھٹکے دے دے کر اس فرش کو جھاڑا کرتی تھی تاکہ وہ جوان بھی اس لڑکی کو دیکھ لے۔

اس شخص نے اسی واقعے سے الہام لے کر عرفان سے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے 'فرش صوفی'۔اس کتاب کی وجہ سے ہی ہماری اور اس شخص کی ملاقات طے ہوئی تھی۔

نیز اسی شہر میں ہم نے ایک ایسے سنٹر کا بھی مشاہدہ کیا جس کے بارے ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس سنٹر کو خواتین نے قائم کیا ہے اور وہی اس کی ذمہ دار ہیں۔ یہ ایک عالمی سنٹر ہے۔ اس ادارے کا قیام کچھ اس طرح ہوا تھا کہ اٹلی کے کسی صوبے کے ایک گاؤں کی تین لڑکیوں نے آپس میں انجیل کے پیغامات میں سے ایک پیغام پر عمل کرنے کا عہد کیا تھا۔وہ پیغام یہ ہے کہ جو اپنے لئے پسند نہیں کرتے ہو اسے دوسروں کے لئے بھی مت پسند کرو اور جو اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کرو۔ان لوگوں کا انجیل کے دوسرے کسی بھی پیغام سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ بس اسی ایک پیغام پر عمل کرتی ہیں۔اپنے اس عمل کی وجہ سے انہوں نے پہلے تو اپنے گاؤں میں، پھر اپنے شہر میں اور اس کے بعد پورے ملک میں زبردست محبوبیت حاصل کی۔آج صورت حال یہ ہے کہ ان کی یہ تحریک ایک عالمی تحریک بن گئی ہے اور ان کا ایک بہت وسیع مواصلاتی نیٹ ورک ہے۔ ویسے اب یہ تینوں خواتین بوڑھی ہو چکی ہیں اور ان کی عمر اسی سال سے بھی متجاوز ہے۔جب ہم اس سنٹر کو دیکھنے گئے تھے تو ہمارے ساتھ چند عیسائی بھی تھے جن میں سے بعض عرفان کا دعویٰ بھی کر رہے تھے۔ صحیفہ سجادیہ اور دوسری کتابوں کے مضامین کے ساتھ ساتھ عرفانی مسائل کے بارے میں جتنی ہماری معلومات تھیں جب ہم نے ان کے سامنے پیش کیں تو وہ سب یہ مفاہیم سن کر مدہوش ہو گئے تھے۔

جب ہم لوگ وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ کوئی اجتماع ہو رہا ہے۔ یہ اجتماع تین روزہ ہوتا ہے جس میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد شرکت کرتی ہے۔ مجموعی طور پر سب کے سب تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور دنیا کے

گوشہ و کنار سے اس اجتماع میں شرکت کرنے کے لئے آتے ہیں۔ ہر مقرر کے پاس صرف پانچ منٹ ہوتے ہیں اور اسی مدت میں اس کو اپنی بات مکمل کرنی ہوتی ہے۔ اس اجتماع میں تقریر کرنے کے لئے مجھے بھی مدعو کیا گیا کہ میں بھی ایران سے آئے ہوئے آیت اللہ کی حیثیت سے اس پروگرام میں شرکت کروں۔ اس دعوت کو میں نے قبول کرلیا اور طے پایا کہ اگلے روز میں عرفان سے متعلق گفتگو کرونگا۔ میں نے تقریباً بیس منٹ تقریر کی تھی اور اپنی گفتگو کے دوران وہی مفاہیم و مضامین پیش کئے تھے جو ہمارے دینی معارف میں موجود ہیں اور بہت سادہ ہیں مثلاً یہ کائنات قلب کی طرح ہے، ہستی محبت محض ہے وغیرہ۔ نیز کچھ دیر قلوب کو جوڑنے والی باتیں بھی کیں۔ میری تقریر کے اختتام پر وہاں موجود افراد نے میری حوصلہ افزائی کی بلکہ کچھ دانشور تو آگے بڑھ کر میرے پاس بھی آئے اور ان سب کا یہی سوال تھا کہ یہ سارے نکات آپ نے کہاں سے بیان کئے ہیں؟ کیا یہ مفاہیم وحی ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں! یہ مفاہیم وحی ہیں لیکن اب سے چودہ سو سال قبل نازل ہوئے ہیں۔ یہ مفاہیم ان افراد کے لئے اس قدر پر کشش تھے کہ اس پروگرام کے بعد بھی ان میں سے بعض افراد نے میرے پاس خطوط ارسال کئے تھے۔

توحید سے متعلق ہمارے دینی معارف و تعلیمات اور نہج البلاغہ و صحیفہ سجادیہ جیسی کتب میں ایسے ہی پیغامات پوشیدہ ہیں۔ کچھ عرصے قبل ہمیں مدینہ میں ایک ادبی پروگرام میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس جلسے کا عنوان تھا مدینۃُ الادبی۔ کافی اچھا پروگرام تھا۔ پروگرام میں کبھی عربی اور کبھی فارسی اشعار ترجمے کے ساتھ پڑھے جا رہے تھے۔ تبھی ہمارے ایک ساتھی نے صحیفہ سجادیہ کا ایک حصہ بھی پڑھا۔ پروگرام کا ماحول ہی بدل گیا، یہاں تک کہ شرکت کرنے والے بعض افراد تو رو بھی رہے تھے۔ کسی نے سوال بھی کیا کہ یہ جو کچھ ابھی آپ نے پڑھا تھا اس کا خالق کون ہے؟ کیا یہ خود آپ ہی کے تالیف کردہ جملے تھے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں بلکہ یہ صحیفہ سجادیہ سے ماخوذ ہے جسے زبور آل محمد بھی کہا جاتا ہے اور یہ کتاب امام علی بن حسینؑ کی دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ہماری کتب ادعیہ میں شمار ہوتی ہے۔ صحیفہ سجادیہ کا یہ ٹکڑا ان کے دلوں پر ایسے جا کر لگا تھا کہ وہ سب منقلب ہو گئے تھے اور رو رہے تھے جبکہ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو سلفی تفکر کے حامل تھے اور جو جانتے بھی نہیں ہیں کہ گریہ کسے کہتے ہیں کیونکہ ان کے دل پتھر کے ہو چکے ہیں۔ یہ ہیں ہمارے دینی منابع و مصادر۔

اخلاقی مباحث میں ہمارے پاس نہایت اہم سرمایہ موجود ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی تو خصوصیت ہی ان کا اعلی اخلاق پر فائز ہونا تھا۔خداوند عالم نے آنحضرت کی کامیابی کی دلیل کے طورپر ان کی خوش اخلاقی کو ہی پیش کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ آپ کی اس خوش خلقی کی وجہ سے ہی لوگ آپ کے ارد گرد جمع ہوئے ہیں۔ اس کے برخلاف عصر حاضر میں صورت حال یہ ہے کہ اسلام پر تشدد و دہشت کا الزام عائد کیا جارہا ہے۔ آیت اللہ بہشتی کا ایک نظریہ پیش ہوا تھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ اخلاق نبوی بذات خود ایک معجزہ ہے کیونکہ معجزے کے اثرات اخلاق نبوی پر مترتب تھے اور لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد اخلاق نبوی کی وجہ سے ہی مسلمان ہوئی تھی۔ پیغمبر اکرمؐ نے اپنے اخلاق و کردار کی بنیاد پر اسلام کی تبلیغ فرمائی تھی۔آج صورتحال یہ ہے کہ ایک گروہ چاہتا ہے کہ قتل و غارتگری کی بنیاد پر دوسروں کو مسلمان بنایا جائے۔

بہرحال نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے پاس کیسے کیسے قیمتی و نادر گوہر موجود ہیں لیکن ہم ان گوہروں کو دنیاوالوں کے سامنے پیش کرنے سے قاصر ہیں جب کہ وہ مٹی کے ٹکڑوں کو گوہر بنا کر دنیا کے گلے کا ہار بنارہے ہیں اور فریب کا جادو چلا کر زہر کو دوا کے نام سے آج کے بشر اور معاشرہ کے حوالے کررہے ہیں اور اس طرح دنیا کو حقوق انسانی وآزادی کے مسموم نعروں سے ویران کررہے ہیں۔

آیت اللہ العظمی خامنہ ای کے خط کا تجزیہ بین الاقوامی تعلقات کے علمی اقدار و مفاہیم کی روشنی میں

مولف: الہام رسولی ثانی آبادی
مترجم: اطہر عباس رضوی

آیت اللہ العظمی سید علی خامنہ ای نے یورپی اور امریکی طالب علموں کے نام جو پیغام ارسال کیا ہے اسے نفسیات، تاریخ، مواصلاتی سائنس ، فلسفہ اور دوسرے انسانی علوم کے تناظر اور دائرے میں مکمل اور بھرپور تجزیہ کیا جاسکتا ہےاور اس سے مختلف معانی نکالے اور استنباط کئے جاسکتے ہیں۔مذکورہ بالا علوم اور مضامین کے علاوہ سیاسی علوم بالخصوص بین الاقوامی تعلقات بھی خط کے مضمون کی وضاحت میں بہت مؤثر واقع ہو سکتے ہیں اور مخاطب کو فہم وادراکِ متن کی ایک نئی صنف اور تکنیک سے آشنا کرا سکتے ہیں۔ حقیقت میں یہ سارے مضامین لینز کی طرح عمل کرتے ہیں جو ایک دوسرے کی مدد سے اس خط کے مضامین کو سمجھنے میں مخاطب کی مدد کر سکتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات کے علم ودانش میں موجود جن اہم ترین مفاہیم سے استفادہ کرتے ہوئے رہبر معظم کے خط کی تحلیل کی جاسکتی ہے وہ درج ذیل ہیں :

ہستی شناشی کا تحفظ

ہستی شناشی کا تحفظ بین الاقوامی تعلقات میں نسبتاً ایک جدید مفہوم ہے جسے جینیفر میٹزن[2] اور آنتھونی گیدنز[3] جیسے دانشوروں نے Social Construtivism جیسے مفاہیم کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ کلی طور پر یہ

1. Ontological security.
2. Jennifer mitzen.
3. Anthony Giddens.

مفہوم حکومتوں کی سالمیت کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا مرجع ایک حکومت کی قدریں اور اس کی بنیادی شناخت ہے۔ اگر کسی ملک کی ہستی شناسی خطرہ میں پڑ جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حکومت کی شناخت اور پہچان اور اس شناخت کو بنانے والی قدریں خطرے میں ہیں۔

اس بنیاد پر بعض اوقات ایک حکومت بغیر اس کے کہ اس کی سالمیت خطرہ میں ہو، اپنی ذات اور اپنی شناخت کے لئے خطرہ محسوس کرتی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے خیال پرداز مفکر میٹزن کی نگاہ میں نہ فقط افراد بلکہ تمام سماجی ادارے یہاں تک کہ ممالک بھی اپنی شناخت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بقول حکومتوں کو بھی دوسرے تمام سماجی اداروں کی طرح اپنی فردی حقیقت، ترجیحات اور اپنے اہداف و منافع کی ایک ثابت درک و فہم کی ضرورت ہے۔ اس نظریے کے مطابق ممالک کو بین الاقوامی تعلقات کے میدان میں اپنی ذات اور اپنے وجود کو لے کر احساس تحفظ کی ضرورت ہے اور یہ اس معنی میں ہے کہ ملکی سالمیت کی طرح شناخت و پہچان کا تحفظ بھی ممالک کے لئے خارجی سیاست میں ایک عملی محرک محسوب ہوتی ہے۔ دوسری طرف اس طرح کا خطرہ مکمل طور پر ایک نسبی امر ہے۔ دوسرے لفظوں میں سب کو اپنی ذاتی تحفظ کی تلاش ہے اور سبھی چاہتے ہیں کہ ان کے وجود کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو لیکن سبھی یکساں طور پر اس عدم تحفظ کا احساس نہیں کر سکتے ہیں اس لئے کہ بین الاقوامی نظام میں مختلف حکومتوں کی حقیقت یکساں نہیں ہے۔

اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ رہبر معظم انقلاب نے فرانس اور بعض دوسرے مغربی ممالک میں ہونے والے دہشت گردانہ حملوں اور کشت و کشتار اور قتل و غارتگری کے واقعات کے بعد اس ذاتی تہدید اور خطرہ کا مکمل طور پر ادراک کیا ہے (جو زمینی سرحدوں کے لئے نہیں ہے بلکہ ہماری ذات اور شخصیت اور ہمارے دینی عقاید کے لئے تہدید ہے) اور یہ خط لکھ کر اس کو برطرف کرنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت میں آپ کا یہ اقدام ایک عقلانی عمل ہے جسے سود و زیاں کو نظر میں رکھتے ہوئے انجام دیا گیا ہے۔

موجودہ دور میں بین الاقوامی سطح پر سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں اسلامی اقدار کے سلسلہ میں ایک طرح کی بے اعتمادی پائی جاتی ہے جسے دور کرنے میں اس خط کا اہم کردار ہے۔ اس حوالے سے برانٹ اسٹیل[1] کا یہ ماننا ہے کہ تمام بین الاقوامی سماجی ادارے اپنی پہچان اور شناخت کی حفاظت کرتے ہوئے دوسرے

1. Brent J. Steel.

تمام لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات و معاملات کو استوار اور منظّم کرکے اس پر خطر ماحول کو اپنے کنٹرول میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مشترک بیناذہنی کا مفہوم[1]

الکسانڈر ونٹ[2] اور بین الاقوامی تعلقات کے دیگر ماہرین اور نظریہ پردازوں کا یہ ماننا ہے مشترکہ شناخت یا کسی حد تک مشترکہ شناخت رکھنا حکومتوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کے علاوہ، مادّی میدانوں میں بھی ان کے تعاون و ہمکاری کے اسباب و وسائل میں اضافے کا باعث ہے۔ اصولی طور پر ھویت شناخت کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ شناخت، اعتقادات، افہام، اپنے اور دوسروں کے بارے میں توقعات اور ان کے درمیان روابط سے عبارت ہے۔ ونٹ شناخت کو کام کرنے والے کی اپنی سمجھ کا نتیجہ جانتا ہے، لیکن ایسی فہم و سمجھ کا مطلب زیادہ تر اس سے وابستہ ہے کہ دوسرے کام کرنے والے بھی اس کو اسی طرح سمجھتے ہیں یا نہیں اور اس سے بیناذہنی شناخت کے رخ اور پہلو کا پتہ چلتا ہے۔ نتیجے کے طور پر خارجی دنیا اور اس کے حوادث و واقعات کو سمجھنے کے لئے ایک مشترک فہم کی ایجاد کے لئے بین الاقوامی سماجی اداروں کی سعی و کوشش ان کے قومی مفادات کے اشتراک میں بھی موثر واقع ہوتی ہے۔

اس نقطۂ نظر کی بنیاد پر رہبر انقلاب کے خط کو قدروں اور ان قدروں پر مبنی سرکاری و غیر سرکاری سماجی اداروں اور مغربی قدروں اور ان قدروں پر مبنی سماجی اداروں کے درمیان ایک مشترکہ فہم ایجاد کرنے کی راہ میں ایک موثر قدم قلمداد کیا جاسکتا ہے۔ ایک ایسی فہم جو دین اسلام میں موجود صحیح افکار و خیالات اور قواعد و معانی کی تاکید کرتی ہے۔

ذاتی ادراکات اور باز نمائیوں کا مفہوم

بین الاقوامی روابط کے نظریہ پردازوں کے پیش نگاہ ایک دوسرا مفہوم بھی ہے جسے اپنی شخصیت کا ادراک اور اسے پیش کرنے کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ ہر حکومت اپنی اور دوسروں کی شخصیت کی ادراک کی بنیاد پر دوسروں

1. Intersubjective Common Understanding.
2. Alexander Wendt.

کو اپنا دوست، رقیب یا دشمن سمجھتی ہے اور یہ ادراک خود اپنے اور دوسروں کے درمیان رابطے کی نوعیت، اشتراک یا ان کے منافع و مفادات کے تعارض اور ٹکراؤ میں بہت زیادہ مؤثر ہے۔

بروس کرونین شناخت کے مختلف درجات کے لئے ایک نظریہ پیش کرتا ہے جس کا آغاز دشمنی سے ہوتا ہے اور آگے چل کر بعنوان رقیب اور اس کے بعد لاتعلّقی پھر تعلقات (خیر عمومی اور نوعی شناخت) اور ایثار (دوسروں کے لئے خود کو قربان کرنے کی خواہش) جیسے درجات تک پہونچتا ہے اور آخر میں ہم زیستی (اپنے اور دوسرے کے درمیان امتیازات کے خاتمے) پر تمام ہوتا ہے۔ یہ فرق بین الاقوامی سیاست کے میدان میں مختلف افکار و نظریات اور مسالک کی صورت میں نظر آتا ہے اور سپر پاؤر، بڑی طاقت اور علاقائی طاقت کی صورت میں بھی قابل مشاہدہ ہے۔

اس رخ سے رہبر معظم انقلاب کا خط دوسروں (غیر اسلامی حقیقت) کے سامنے خود (اسلامی حقیقت) کی دوستانہ تصویر پیش کرنے کے لئے ہے۔ حقیقت میں خط کے مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران بین الاقوامی سطح پر خود کو صلح طلب اور عدالت پسند حکومت مانتا ہے اور دوسری حکومتوں سے بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کے بارے میں ایسا ہی تصور کریں۔ یہ خط ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اسلام کی جو تصویر پیش کی جارہی ہے وہ غلط ہے۔

سلامتی اور تحفظ

آج کے سیاسی نظریہ پردازوں کا یہ ماننا ہے کہ سلامتی اور تحفظ جیسے مفاہیم ایک عینی اور ثابت امر نہیں ہوتے ہیں بلکہ یہ معاشرہ کی ذہنیت پر مبنی ہوتے ہیں۔ مثلاً امریکا جیسی استعماری طاقت کسی بات کو خطرہ بتاتی ہے اور دوسرے ملک اس کو مان لیتے ہیں تو وہ بات مکمل طور پر خطرہ تسلیم کرلی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ استعماری طاقتیں کسی ایسی بات کو خطرہ کے طور پیش کردیتی ہیں جو سرے سے خطرہ ہے ہی نہیں۔ سامراجی طاقتیں اسی طریقہ سے کسی موضوع کو خطرہ بتا کر جنگ چھیڑنے یا اپنے مخالفین کو راستے سے ہٹانے کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں یعنی جنگ کے شعلے بھڑکا کر اور اپنے مخالفین کو بے انتہا تکالیف و شدائد سے دوچار کرکے اور موت کے گھاٹ اتار کر یہ کہتی ہیں کہ ہم یہ سب امن و امان کو بحال کرنے کیلئے کر رہے ہیں۔

لہٰذا اس درمیان جس چیز کی اہمیت ہے وہ ذہن، ادراک، عامل کی فکر اور اس کا مخاطب ہے۔ مثال کے طور پر یہ اہم نہیں ہے کہ صدام کے پاس وسیع پیمانہ پر تباہی پھیلانے والے اسلحے جیسا کہ امریکی حکام مدعی ہیں موجود تھے یا نہیں؛ بلکہ اہم یہ ہے کہ امریکہ مختلف حکومتوں کے ذہن میں ایسے ہتھیاروں کے خوف کو راسخ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

آج کی استعماری طاقتیں دین اسلام کو ایک عالمی خطرہ کے طور پر دنیاوالوں کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔ بعض متعصب اور تشدد پسند اسلامی تنظیمیں بھی اپنے کردار کے ذریعہ اسلام کی غلط تصویر پیش کرتی ہیں۔ آیت اللہ خامنہ ای اس خط کے ذریعہ مغربی عوام اور خاص کر مغربی جوانوں کے ذہن سے اسلام کے سلسلہ میں اس غلط شناخت کو نکال کر ان کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام کبھی بھی عالمی سلامتی کے لئے خطرہ نہیں رہا ہے بلکہ یہ خود امن وسلامتی کا سب سے بڑا حامی ہے۔

بین الاقوامی نظام میں بعض مکاتب فکری یا دین انفرادیت پر زور دیتے ہیں اور دوسرے گروہوں سے کمتر ملنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض مکاتب فکری اور دین اجتماعیت پر زور دیتے ہیں اور دوسرے گروہوں سے اپنے تعلقات کو بڑھانا چاہتے ہیں اور اپنے بارے میں انہیں بتانا چاہتے ہیں۔ اس طرح کے مکتب فکر کو تشدد اور تنازعات سے دور رہنا چاہئے یعنی دوسرے لوگ اپنی مرضی سے اس سے تعلقات بنائیں۔

آیت اللہ خامنہ ای اپنے اس خط کے ذریعہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام ایک جہان شمول دین ہے جو دوسرے مکاتب فکر کے افراد کو اس میں شامل ہونے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ اسلام کی ایسی شناخت جو بین الاقوامی تعلقات میں امن وسلامتی کا خواہان ہے اور کسی بھی طرح کے ظلم وبے عدالتی کی نفی کرتا ہے۔

عالمی تمدنی معاشرہ کا مفہوم

عالمی تمدنی معاشرہ کا مفہوم حکومتوں سے ماورا سماجی اور سیاسی فضا کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں افراد اور سماجی ادارے آزادانہ طور پر اپنی سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کو انجام دیتے ہیں۔ عالمی تمدنی معاشرہ ایک نئی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سارے ایسے بین الاقوامی غیر سرکاری ادارے، سماجی تحریکیں اور چینل ہیں جو مختلف حکومتوں سے تعاون کرتے ہوئے اور ان کے ساتھ ساتھ عالمی نظام میں اپنا کردار نبھاتے ہیں۔

عالمی تمدنی معاشرہ کی طاقتیں حکومتوں کے درمیان توازن برقرار کرنے والی طاقتیں شمار کی جاتی ہیں۔اسی طرح ایسے موضوعات جن سے عالمی تمدنی معاشرہ برسرپیکار ہے (جیسے حقوق بشر، صحت و سلامتی، ایڈز، ماحولیات، کرہ ارض کے درجہ حرارت میں مسلسل اضافہ، پائیدار ترقی وغیرہ) غالباً سرحدوں سے بالاتر ہیں اور کسی ایک مملکت، خطے اور علاقے سے مخصوص نہیں ہیں اور یہ مسائل سارے ممالک سے متعلق ہیں۔ عالمی امور کے انتظام و انصرام میں عالمی تمدنی معاشرہ کے عناصر حکومتوں سے رقابت کرتے ہیں اور ان پر اثرانداز ہوتے ہیں اور یہ سرکاری اداروں کے جائز رقیب شمار ہوتے ہیں۔

اگر مخاطب کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آیت اللہ خامنہ ای نے اپنے اس خط میں عالمی تمدنی معاشرہ کو بنیاد بنایا ہے نہ کہ حکومتوں کو۔ ایسا معاشرہ جو جان راگی کے بقول آج سرکاری دائرے سے خارج ہے اور سرکاری اداروں سے تعاون کرتے ہوئے عالمی حکمرانی میں ایک اہم کردار کا حامل ہے۔ رہبر معظم انقلاب نے عالمی تمدنی معاشرہ کو مخاطب قرار دیا ہے جسے بین الاقوامی سطح کے بااثر اور نئے اداروں سے تعلقات استوار کرنے کی راہ میں ایک ہوشمندانہ قدم مانا جاسکتا ہے۔

اسلامی تہذیب و تمدن کی بنیادی اقدار پر ایک نظر

مولف: حسین خسروی
مترجم: محمد جعفر زیدی

تصور کریں آپ ایک ایسے شہر میں زندگی گزار رہے ہیں جہاں زیادہ تر افراد پڑھنا لکھنا نہیں جانتے۔ خرافات، بت پرستی، شراب نوشی، عیاشی، ناجائز تعلقات، شدید قبائلی تعصب اور چھوٹے سے چھوٹے بہانہ پر عرصہ دراز تک جنگ و خونریزی کرنا جہاں کا رائج تہذیب و کلچر ہو، ان سب سے بڑھ کر جہاں عورت کی کوئی قدر و منزلت نہ ہو، اسے غیر عادلانہ طور پر صرف جنسی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھا جاتا ہو۔ دوسری طرف آپ ایسے خشک اور بے آب و علف بیابان میں پھنسے ہوئے ہوں جو ہر امید اور مادی و معنوی ترقی کو ناامیدی اور مایوسی میں بدل دے۔

اگرچہ یہ تصور سخت اور دشوار ہے لیکن یہ اس سرزمین کی بعض خصوصیات ہیں جہاں پندرہ صدی پہلے اسلام نے اپنا قدم رکھا تھا۔ وہ دین جس کی پہلی تعلیم ہی «اقرا» تھی۔ واضح ہے کہ ان حالات میں خاص کر استحکام و سلامتی کی کمی اور عقل و منطق کے نہ ہونے کے سبب ایک تمدن کو وجود میں لانے کی راہ کو ہموار نہیں کیا جاسکتا ہے اور بالفرض اگر تمدن وجود میں آ بھی جائے تو ایسے سماج میں اس تمدن کی بقا تنازع اور جنگ و خونریزی پر ہو گی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر اس سرزمین پر علم و ثقافت کی ایک ہلکی سی جھلک بھی پائی جاتی تھی تو وہ اسی نچلے اور پست درجہ کی تہذیب و تمدن کا آئینہ تھی۔

اس سرزمین کے محنت و مشقت کرنے والے اور سخت جان لوگ اگرچہ شعر و شاعری اور ادب و ہنر میں بھی دلچسپی رکھتے تھے لیکن ان کے ادبی آثار اسی پست تہذیب کی ترجمانی کرتے تھے۔ فرض کریں اگر آج کی علمی ترقیاں اس معاشرہ میں ہوتیں تو اس کے کیا برے اور تباہ کن نتائج سامنے آتے؟ یقیناً ایک ایسا تمدن ہوتا جو قبیلہ اور نسل پرستی پر قائم ہوتا جہاں طاقت و پاور کا سکہ چلتا اور لذت و عیاشی کا بول بالا ہوتا۔

ان حالات میں حقیقی اور انسانی و اخلاقی اقدار پر قائم تہذیب و تمدن کو کیسے وجود میں لایا جاسکتا ہے؟ یہ وہی عظیم کارنامہ ہے جسے اسلام نے محض چند سالوں میں معاشرہ کی بنیادی اقدار کو تبدیل کرکے انجام دیا؛ بت پرستی و شرک کو عقیدۂ توحید سے اور درندگی، انتقام جوئی اور خود پسندی کو انسان دوستی اور محبت میں بدل دیا اور دنیا و مادیت سے ان کی توجہ ہٹا کر آخرت و ابدی حیات سے انہیں آشنا کیا۔ پیغمبر اکرم ﷺ پر سب سے پہلے جو آیتیں نازل ہوئیں وہ یہ تھیں:

"اس خدا کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا ہے، اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے، پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی ہے اور انسان کو وہ سب کچھ بتا دیا ہے جو اسے نہیں معلوم تھا"[1]۔

یہ وہ پہلا پیغام تھا جو اسلام نے بشریت کو دیا اور ہر چیز سے پہلے اس نے اپنے مخاطب کے فکر و فہم کو مورد خطاب قرار دیا، ایسا خطاب جو کسی خاص سرزمین اور کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہے۔

اس طرح کی آیتیں قرآن مجید میں جگہ جگہ موجود ہیں جو انسان کو کائنات کے اسرار و رموز اور اس پر مسلط نظام کی جانب غور و فکر کرنے کی دعوت دے رہی ہیں البتہ اس فرق کے ساتھ کہ قرآنی نقطہ نظر سے تمام اشیاء کا سرچشمہ پروردگار عالم کا ارادۂ غالب و قاہر ہے نہ کہ انسان یا اتفاق لہٰذا قرآن کریم نہ صرف تحصیل علم و دانش کا مشوق ہے بلکہ توحید کو مستحکم کرنے، معرفت الٰہی کو نشر کرنے اور مختلف علوم تک رسائی کے لئے مختلف موقعوں پر اسرار و رموز عالم سے پردہ اٹھانے والا ہے۔ قرآن مجید کی یہ عمیق تعلیمات نیز پیغمبر ختمی مرتبت (ص) کی تحصیل علم کے سلسلہ میں مسلسل سفارشیں، مسلمانوں کو ابتدا ہی سے علم حاصل کرنے کی طرف دعوت دیتی رہی ہیں۔

پیغمبر گرامی اسلام (ص) کے سامنے ایک سخت مرحلہ درپیش تھا۔ آپ کا سامنا ایک ایسی متعصب قوم سے تھا جس کی زبان اس کی شمشیر تھی اور جس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس کے بازوؤں میں نہاں تھی۔ آپ ﷺ کو اس قوم سے نرم و لطیف لہجہ میں گفتگو کرنی تھی اور آپ کی نبوت کا معجزہ بھی یہی ہے۔ دوسرے تمام انبیاء کے برخلاف پیغمبر گرامی اسلام کا معجزہ ایک مکتوب اور الٰہی کتاب کی شکل میں ہے؛ بغیر

۱۔ سورہ علق، ۱۔۵

اس کے کہ ایک حرف بھی اس میں کم یا زیادہ ہو یا اس کا دوسرا ایڈیشن تاریخ میں کہیں ملتا ہو۔ قرآن مجید ایک ایسی تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈال رہا تھا جس نے صدیوں تک دنیا پر حکمرانی کی۔ ہمارا ارادہ تاریخ کو دہرانا یا اس کی جزئیات کو بیان کرنا نہیں ہے، اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں اور رسالے لکھے جا چکے ہیں بلکہ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کس طرح ایک ایسی تہذیب و تمدن نے جنم لیا جس نے جغرافیائی سرحدوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا؟

بالفاظ دیگر اسلامی تہذیب و تمدن کبھی بھی کسی خاص سرزمین یا عرب سلاطین سے مخصوص نہیں تھی اور نہ ہے۔ یہ تہذیب اتنی وسیع ہے کہ اس نے اپنے اندر مختلف نسلوں کو سمیٹا ہوا ہے چاہے وہ عرب ہوں یا ایرانی، ترک ہوں یا ہندوستانی، رومی ہوں یا چینی؛ مشرق سے مغرب تک سب اس تہذیب کا حصہ ہیں؛ وہ سرزمین اور وہ لوگ جو اس سے قبل ہمیشہ آپس میں لڑتے تھے اور ایک دوسرے کے جانی دشمن کہلاتے تھے۔ ممکن ہے میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ کے پروپگنڈوں کی وجہ سے عام لوگوں کے ذہن میں اسلام کی صورت ایک کٹر، جنگجو اور دوسرے ممالک پر حملہ کرکے ان پر قبضہ کرنے والی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ خالص اسلام تلوار کو غلاف سے نکالنے سے پہلے گفتگو اور زبانی مجادلہ کا حکم دیتا ہے اس کی نظر میں جہاد قتل و غارت گری یا ملکوں پر قبضہ کرنے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ ایک دفاعی حربہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے مختلف بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کو دین اسلام کی دعوت دینے کا آغاز پیغمبر ختمی مرتبت (ص) قاصد اور خطوط کے ذریعہ کرتے ہیں نہ کہ فوج اور جنگ کے ذریعہ۔ جنگ کے دوران اور طاقت رکھنے کے باوجود آپ (ص) بخشش، مہربانی اور درگذر سے کام لے کر الٰہی رہبر کے اخلاق و عطوفت کی اعلیٰ مثال پیش کرتے ہیں۔ وہ پیغمبر جس نے اپنے قریبی صحابی بلال حبشی کی صرف اس وجہ سے سخت مذمت اور سرزنش کی کیونکہ وہ جنگ خیبر کے اسیروں کو ان کے مقتولین کے پاس سے لے کر گزرے تھے۔ وہ پیغمبر جس نے اپنے تمام کٹر اور جانی دشمنوں کو جنہوں نے آپ کو اور آپ کے دین کو مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی ان سب کو معاف کر دیا؛ اور شہر مکہ جو مشرکین کا مرکز مانا جاتا تھا اسے بغیر کسی جنگ و خونریزی کے فتح کیا تھا۔

اس طرح کے متعدد واقعات تاریخ کی کتابوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں اور صدر اسلام کی ہر جنگ میں اس کی مثال ملتی ہے۔ پیغمبر اکرم (ص) کی اسی سیرت اور تعلیم سے متاثر ہو کر تمام اسلامی سرزمین رفتہ رفتہ خوشحالی و ترقی کے راستے پر گامزن ہو گئی اور جب اسلام پھیلا اور مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے لوگ اس

عظیم الٰہی دین کی جانب گرویدہ ہونے لگے تو کل تک جو ایک دوسرے کے دشمن تھے وہ آپس میں بھائی ہو گئے اور ایک دوسرے پر جان چھڑکنے لگے۔

تیرہ سال تک صبر و تحمل اور مخفیانہ اور اعلانیہ طور پر وعظ و نصیحت اور اسلام کی دعوت دینے کے بعد پیغمبر اکرم ص نے اپنی جائے پیدائش سے یثرب کی جانب ہجرت کی۔ یثرب پہنچ کر آپ نے سب سے پہلے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور علمی مرکز کے عنوان سے ایک مسجد کی تعمیر کرائی اور اس طرح سے آپ نے اسلامی تمدن و تہذیب کی بنیاد رکھی۔ یثرب میں قیام کے ابتدائی دنوں میں آپ نے کچھ قوانین بھی وضع فرمائے جس میں مسلمان و غیر مسلمان دونوں کے حقوق کی مراعات کی گئی تھی جس کے نتیجہ میں یثرب میں جسے شہر نبی [مدینۃالنبی] کے نام سے جانا جاتا تھا؛ امن و سکون پایا جانے لگا۔ وہ قوانین جس نے ایک تہذیب و تمدن کے وجود میں آنے میں بنیادی کردار ادا کیا اور رفتہ رفتہ قرآن مجید کی آیات کے ذریعہ اپنے کمال کو پہنچ گیا۔

قابل ذکر ہے کہ یہ ترقی صرف مسلمانوں ہی سے مخصوص نہیں تھی۔ مدینہ میں اسلامی حکومت کی تشکیل کے ابتدائی دنوں میں ہی جب روم کی عیسائی حکومت یہودیوں کے خون کی پیاسی تھی، پیغمبر ختمی مرتبت (ص) نے یہودیوں، عیسائیوں، صابئین اور مجوسیوں کو اہل کتاب قرار دیا اور اس وقت تک ان کے تمام حقوق کو محفوظ جانا جب تک وہ جدید اسلامی حکومت کے خلاف کوئی سازش نہیں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی صدیوں تک وہ اہل کتاب خاص کر یہودی جو اسلامی سرزمین پر زندگی بسر کر رہے تھے ان کی زندگی ان یہودیوں سے جو یورپ یا دوسری جگہوں پر زندگی گزار رہے تھے نسبتا بہتر تھی۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنے دینی رسومات کو انجام دینے میں آزاد تھے بلکہ ان کے دینی علوم نے کافی ترقی بھی کی۔

لہٰذا پیغمبر ختمی مرتبت (ص) کا انقلاب دراصل عالمی پیمانہ پر ایک ثقافتی انقلاب تھا جس کی بنیاد خود غرضی اور دنیا طلبی کے بجائے خدا اور آخرت طلبی پر استوار تھی۔ اسی بنیاد کا ثمرہ تھا کہ اسلام نے علمی اور ثقافتی لحاظ سے دنیا والوں کے ساتھ تعامل شروع کیا۔ مسلمان دانشور خداوند عالم کی ذات کو تمام علوم و معارف کا سرچشمہ مانتے تھے لہٰذا انہوں نے دور دراز ملکوں کے مختلف علوم کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ انہیں قلمبند بھی کیا۔ بے جا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ مصر، چین، ایران اور یونان وغیرہ کے علمی کارناموں کو محفوظ و مستند بنانے میں مسلمان دانشوروں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اگرچہ غیر مسلم دانشور حضرات کی کاوشیں بھی ناقابل انکار

ہیں خاص کر غیر عربی زبان میں پائی جانے والی کتب کو عربی میں ترجمہ کرنے میں ان کی کاوش لائق ستائش ہے۔

اس درمیان خاندان رسالت کے اہم مرکزی کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے جنہوں نے علوم و معارف الٰہی کو نشر کرنے کے ساتھ ساتھ ہزاروں شاگردوں کی تربیت بھی کی۔ اس زمانہ میں یورپ کلیسا کے زیر نگرانی سخت حالات سے روبرو تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب اسلامی سرزمین میں ایک کے بعد دوسرے علمی مدارس، اسپتال، رصد گاہ، تجربہ گاہ اور لائبریری وغیرہ کھل رہے تھے۔ یورپ قرون وسطی کے تاریک سائے کے تلے سانس لے رہا تھا اور اسلامی دانشور پورے جوش و خروش کے ساتھ علم کی چوٹیوں کو فتح کرتے چلے جارہے تھے۔ اس عظیم میراث میں یورپ کا رول بس اتنا تھا کہ وہ دور سے اس انقلاب کا نظارہ گر تھا۔ اس دوران علمی و ثقافتی لحاظ سے یورپ کا کردار خال خال ہی نظر آتا ہے وہ بھی اس صورت میں جب کلیسا کی جانب سے اس پر الحاد و انحراف کی تہمت نہ لگے۔

اسی سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام نے جس علمی انقلاب کی بنیاد رکھی وہ کس درجہ علم کی ترقی اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب و تمدن کی تشکیل میں کارگر ثابت ہوئی۔ دین اسلام نہ صرف یہ کہ دنیاوی زندگی کی مذمت نہیں کرتا بلکہ دنیاوی زندگی کو وہ ایک جہت اور مقصد عطا کرتا ہے۔ حقیقت میں اسلام دنیا کو ترک کرنے اور رہبانیت کو سراہنے کے بجائے انسانوں کو اس حقیقت کی جانب متوجہ کرتا ہے کہ زندگی اس دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ اس دنیا سے ماورا بھی زندگی جاری و ساری رہے گی لہٰذا اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کمال کی منزلوں کو طے کرنا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ دنیاوی لذتوں اور خوشیوں کی اسلام میں کوئی حیثیت نہیں ہے بلکہ یہ سفارش کی گئی ہے کہ انسانی صلاحیتوں کو مزید شکوفا کرنے اور اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے افراط و تفریط سے بچتے ہوئے دنیاوی خوشیوں سے صحیح، منطقی اور معقول طور پر فائدہ حاصل کیا جائے اور یہی اسلام کا درمیانی راستہ ہے۔

اس نقطہ نظر سے انسانی حیات کو ایک نیا رخ ملتا ہے؛ ایک ایسی عالمانہ اور آگہی سے بھرپور زندگی جس میں قدرتی عناصر اور طاقتوں کو ایک بڑے اور عالی مقصد یعنی کمال کی بلندیوں کو حاصل کرنے کے لئے بروئے کار لایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں گذشتہ لوگوں کی میراث سے اس وقت تک فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے جب تک وہ اسلام کے مسلّم اصول سے نہ ٹکرائیں۔ یہی وہ نکتہ تھا جس کے سبب اسلامی تہذیب و تمدن نے

اتنی تیزی سے ترقی کے سفر کو طے کیا۔ اگر ہم اسلامی تمدن کے اس سنہرے دور کے مسلمان دانشوروں کے نام اور ان کے علمی کارناموں کی ایک فہرست بنائیں تو بلا شبہ سینکڑوں جلد کتابیں بھی کافی نہیں ہونگی، وہ علماء حضرات جن میں سے بعض صرف ایک ہی علم میں نہیں بلکہ مختلف علوم میں ید طولی رکھتے تھے۔

اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کے سایہ میں انسانی ترقی کے لئے ایک اہم اور سازگار ماحول فراہم ہوا تھا؛ یہاں تک کہ خود مغربی دانشوروں کا یہ ماننا ہے کہ قرون وسطی کے تاریک وسیاہ دور کے بعد یورپ کی ثقافتی اور علمی تحریک کو جو حیات نو نصیب ہوئی ہے اس میں مسلمان دانشوروں اور علماء کا بنیادی کردار تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ علمی لحاظ سے مغربی دانشور اسی راہ اور تحریک کو آگے بڑھا رہے ہیں جس کی شروعات مسلمان دانشوروں نے کی تھی تو بے جا نہیں ہوگا۔

حقیقت میں اسلام سے پہلے سماج پر پست اصول حاکم تھے، اسلام نے انہیں اعلی معیاری اصولوں سے بدل کر ان کی ترویج کی اور انسانوں کے درمیان ایک ایسا بے مثال اتحاد قائم کیا جس میں ہر ایک کے حقوق محفوظ تھے اور کسی کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ دوسروں کے حقوق کو ضائع کرے۔اس طرح سے اسلام نے عالمی پیمانہ پر اور قوم ونژاد سے ماورا ایک ایسی تہذیب وثقافت کے لئے ماحول فراہم کیا جو عظیم علمی کارناموں کا منشا قرار پائی۔

اب ہم اپنے ابتدائی کلام کی جانب پلٹیں گے کہ متعصب اور سخت جان لوگوں کے درمیان، وہ لوگ جو ثقافت کے لحاظ سے نچلی سطح پر زندگی بسر کر رہے تھے اور جن کی حیات کا کوئی مقصد اور ہدف نہیں تھا ایسے لوگوں کے درمیان اسلام نے علم، ہنر اور تہذیب وتمدن کا ایسا تناور درخت لگا دیا جس کی جڑیں توحید پر قائم تھی اور اب وہی لوگ دنیا کے سامنے اپنے آپ کو تشدد پسند، دہشت گرد اور غیر مہذب کے عنوان سے پیش کر رہے ہیں؟ کیا صاحبان عقل وخرد کے نزدیک یہ چیز قابل قبول ہے؟ مغربی میڈیا اسلام اور مسلمانوں کی جو تصویر دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے کیا اس پر شک وتردید نہیں کرنا چاہئے؟ بے شک زندہ دل، زندہ ضمیر اور آزاد انسان کا وجدان ہی اس سلسلہ میں داوری کرنے کے لئے کافی ہے۔

موجودہ عالمی طاقتوں کے درمیان عالم اسلام کا مقام و مرتبہ

مولف: علی بغیری
مترجم: منہال حسین خیر آبادی

اگر ہم اس وقت عالمی نظام میں بڑی طاقتوں کی صف آرائی کی نوعیت کو ان کی توانائیوں اور صلاحیتوں کے پیش نظر بیان کرنا چاہیں تو یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ طاقت و قوت کی صف آرائی کی نوعیت کو دنیا والوں کے سامنے اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ وہ گویا ایک حتمی، واقعی اور غیر قابل تغییر ہے جسے پوری دنیا والے مان چکے ہیں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے ہیں۔اس کے علاوہ طاقت کے موجودہ نظام کو روز بہ روز ترقی کی منزلوں کو طے کرنے کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش جاری ہے کہ موجودہ راستہ ہی انسانوں کی کامیابی اور بہترین زندگی گزارنے کا باعث ہوگا۔یہ وہ نکات ہیں جنہیں چینلوں اور دیگر ذرائع ابلاغ کے سہارے انسانوں کے ذہن میں بٹھانے اور انہیں یقین دلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔عالمی طاقت کا یہ نظام اس تگ و دو میں لگا ہوا ہے کہ اس کی طاقت مسلّم اور ایک عالمی اجماع کا ثمرہ بن کر ظاہر ہو تاکہ وہ دنیا والوں کے سامنے یہ اعلان کرسکے کہ موجودہ نظام قدرت ہی دنیا کی تمام اقوام و ملل اور تہذیب و ثقافت کے نزدیک مقبول ہے اور اسے ہر قوم و تہذیب کی مکمل تائید بھی حاصل ہے۔

واضح رہے کہ اس مفروضہ کے خلاف عالمی سطح پر اٹھنے والی ہر آواز و نظریہ کو عالمی سطح کے تقاضوں اور مطالبوں کے خلاف گردانا جاتا ہے اور جب موجودہ نظام قدرت کے مخالفین موجودہ قدرت کی نوعیت کی مشکلات اور ناعادلانہ تقسیم کی ماہیت پر اعتراض کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس استدلال سے روبرو ہوتے ہیں کہ موجودہ نظام قدرت انسانوں کی زندگی میں عقلانیت کے غلبہ کی وجہ سے وجود میں آیا ہے اور پوری تاریخ میں یہ نظام عقل و درایت سے ہم آہنگ ترین نظام ہے پس جہاں اس نظام کی نوعیت کو قبول

کرنا ہوگا وہیں اس کا احترام بھی واجب ہے اس لئے کہ ابھی تک اس سے بہتر نظام دنیا والوں کے سامنے پیش نہیں ہوا ہے۔ موجودہ ڈھانچے کی طرفداری کرنے والے اس راہ وروش کی مقبولیت کے لئے جن ہتھکنڈوں کا استعمال کررہے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے :

۱۔ لاقانونیت پر مبنی سماجی نظام ایک بے نظم سماج کے برابر ہے۔

۲۔ فاسد نظام سے بہتر اس کا نہ ہونا ہے۔

۳۔ طاقت کا موجودہ نظام انسان کی عقلانی ترقی کا نتیجہ ہے۔

۴۔ طاقت کا موجودہ نظام ہی بے مثال ہے۔

۵۔ طاقت کا موجودہ نظام انسانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے گذشتہ تمام نظاموں سے بہتر ہے۔

پس ایسے نظام کو قبول کرنا ہوگا اور اس کا پورا احترام بجالانا ہوگا لیکن یہ سوال اپنی جگہ پر موجود ہے کہ کیا طاقت کا موجودہ ڈھانچہ اپنے مدعا کے مطابق اور جیسا کہ وہ پیش کرنا چاہتا ہے بالکل ویسا ہی ہے ؟ کیا اس کی مثال پیش کرنا اور اس سے بہتر نظام لانا ممکن نہیں ہے ؟ کیا طاقت کے موجودہ نظام کو ہر گز بدلا نہیں جاسکتا ؟ کیا اسلام طاقت کے اپنے اسلامی ڈھانچے کے ذریعہ ان طاقتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا ہے ؟ کیا اس میں موجودہ نظم کو بدلنے اور دنیا والوں کے لئے اس سے بہتر نظام پیش کرنے کی صلاحیت نہیں ہے ؟ طاقت کا موجودہ نظام اسلام کو اپنا زبردست رقیب کیوں سمجھ رہا ہے ؟ کیا موجودہ عالمی نظام کو اسلام کی جانب سے کوئی خطرہ لاحق ہے جس سے بچنے کے لئے وہ اسلام کو اپنے راستہ کا پتھر سمجھ کر ہمیشہ کے لئے اکھاڑ پھینک دینا چاہتا ہے ؟ آئندہ سطور میں ہماری کوشش ہوگی کہ مذکورہ سوالوں کے تسلی بخش جواب پیش کرسکیں۔

طاقت کے موجودہ نظام کی تبدیلی کا امکان

جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک اس دنیا نے زندگی گذارنے کے مختلف ڈھانچوں کو دیکھا ہے۔ ایک وہ دور تھا جب انسانی زندگی کے لئے شہنشاہیت اور مطلق العنان حکومتی نظام کا انتخاب کیا گیا تھا۔ آج ہم تاریخ کی کتابوں میں روم، ایران اور چین کی شہنشاہیت کی داستانوں اور ان کی فتوحات کے مختلف کارناموں کا مطالعہ کرتے ہیں، وہ اپنے دور میں بلا رقیب حکومتیں سمجھی جاتی تھیں اور ان کی طاقت وقدرت کا عالم یہ تھا کہ ان کی نابودی تصورات کے باہر تھی لیکن ایک مدت کے بعد ایسی زبردست

طاقتوں کی مالک حکومتیں مختلف مشکلات اور بلاؤں میں مبتلا ہوئیں اور نہایت ذلت و بیچارگی کے ساتھ نابودی کی آغوش میں اس طرح سو گئیں کہ آج تاریخ کے اوراق میں صرف ان کے نام ملتے ہیں۔

دوسرا نظام جسے دنیا نے اور ہمارے بزرگوں نے ماضی میں دیکھا وہ دو قطبی نظام تھا جسے وہ ابھی تک بھلا نہیں پائے ہیں۔ اس دور میں روس اور امریکہ کا نام اس طرح لیا جاتا تھا گویا پوری دنیا کا مقدر انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ دو قطبی نظام اس وقت اس طرح دنیاوالوں کے اذہان میں بیٹھ چکا تھا کہ ان کی روزمرہ کی بول چال اور ذکر و فکر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس واقعہ کی زندہ مثال ستاروں کی جنگ (Star war) پر مبنی فیلم کو دیکھا جاسکتا ہے، یہ ایسا خواب و خیال تھا جو آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی عملی شکل حاصل نہ کر سکا لیکن گذشتہ دو دہائیوں کے لوگ سیاسی و غیر سیاسی کشمکش اور جنگ و خونریزی کی وجہ سے اس خواب کو واقعی سمجھتے تھے اور انہیں اس میں کوئی شک نہ تھا لیکن دنیا نے دیکھا کہ یہ سرد جنگ بھی اپنی انتہا کو پہنچی اور وہ تمام لوگ جن کا عقیدہ تھا کہ دو قطبی نظام تغییر ناپذیر ہے انہوں نے اپنی آنکھوں سے برلین کی دیوار کے انہدام اور سوویت یونین کی نابودی کو دیکھا۔

دو قطبی نظام کی نابودی اور سرد جنگ کے اختتام کے بعد قطب واحد پر مبنی نظام کو اس فرضیہ کے ساتھ پیش کیا گیا کہ قدرت و طاقت اور فوجی ساز و سامان کے میدان میں بلا تنازع قدرت کا مالک یعنی امریکہ اور عالمی سطح کے دیگر جاگیرداروں اور مدعیان قدرت کے درمیان واضح و روشن فرق ہے۔ اس نظام واحد کا مالک اس خواب و خیال میں محو تھا کہ اس کا رقیب یعنی روس نہیں رہا اور وہ طاقت کے میدان کا تنہا شہسوار ہے، اب وہ بلامقابلہ پوری دنیا پر راج کرے گا۔ امریکی مفکرین و ماہرین نے اپنا مکمل زور قلم صرف کر دیا تاکہ وہ دنیاوالوں کو باور کرادیں کہ اب طاقت کا امریکی ڈھانچہ ہی دنیا پر حکومت کرے گا۔ مشہور امریکی دانشور سیموئیل ہنٹنگٹن (Samuel Huntingtion) اپنے مقالے «تہذیبوں کا ٹکراؤ» (The clash of Civilisations) اور دوسرے مشہور دانشمند فرانسیس فوکویاما (Francis Fukuyama) اپنے «تاریخ کا خاتمہ اور آخری انسان» (The end of the History and the last man) نامی مقالہ میں واضح لفظوں میں موجودہ نظام کو انسانوں کی زندگی گزارنے کے لئے سب سے بہترین نمونہ گردانتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ نظام جو قطب واحد پر استوار ہے اس کی مشکلات بہت کم ہیں اور اس کے بعد ہم ہر گز

اس نظام میں تبدیلی کے شاہد نہ ہوں گے بلکہ یہ نظام روز بہ روز ترقی کی منزلوں کو طے کرتا جائے گا اور اس کی ترقی کو ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے۔

قطب واحد پر استوار نظام نے سب سے پہلے اپنی طاقت کی نمائش کے لئے کویت پر عراق کے حملہ کو انتخاب کیا۔ اس جنگ میں امریکہ نے دو قطبی نظام کے خاتمہ کے بعد پہلی مرتبہ اپنی قیادت میں عراق کے خلاف ایک عالمی اجماع قائم کیا۔ اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ۱۹۹۸ء کی کوزوو کی جنگ تھی جسے اس نے بڑی ہنر نمائی سے پیش کیا تھا۔ عالمی اجماع نے قطب واحد کے مالک امریکہ کی دنیا پر حکمرانی کو دکھانے کے لئے بڑے ہی وسیع پیمانہ پر پروپیگنڈے کئے اور جنگ کے میدانوں میں دنیا والوں کو کامیابی کی شہنائیاں سنائی گئیں، لیکن ۲۰۰۱ء میں قطب واحد کے مالک امریکہ نے عالمی ماحول کو پر امن و امان دکھانے کے بعد دنیا پر مکمل غلبہ پانے کے لئے قدم اٹھانے شروع کر دئے، گیارہ ستمبر کے حادثے کے بعد قطب واحد پر مبنی نظام کی ترقی مکمل غلبہ کی جانب رواں دواں ہوئی، اسی وجہ سے قطب واحد کے بعد اسے آخری غلبہ کا نام دیا گیا۔

موجودہ سیاسی ہتھکنڈوں کی نمائش کے بعد جہاں قطب واحد کے مالک امریکہ نے اقتصادی اور فوجی ٹکنالوجی کی دنیا میں اپنی برتری اور دیگر ملکوں کی عاجزی و ناداری سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنے مخصوص انداز میں دنیا کی قیادت کی باگ ڈور حاصل کرنے کے لئے دنیاوالوں کی رضایت کو بھی حاصل کرنے میں خاصا کامیاب رہا اور اگر لفظوں کو بدل کر کہا جائے تو یہ کہنا بہتر ہوگا کہ اس چھوٹی سی دنیا میں رہنے والے لوگ ایک بہترین پولیس کی شکل میں امریکہ کا احترام کرنے لگے پس یہ قطب واحد کا مالک امریکہ جہاں قدرت و طاقت میں یگانہ روزگار ہو چکا تھا وہیں عام محبوبیتوں کا مالک بھی بن چکا تھا، اس کے باوجود اس نظام کی عمر حباب سے زیادہ نہ تھی بلکہ یہ کہا جائے کہ یہ سطحی مقبولیت ۲۰۰۱ء کی افغانستان کی جنگ تک محدود رہی اور اس کے بعد امریکہ کا جو حال ہوا اسے دنیا نے دیکھا کہ وہ اپنے مغربی دوستوں کی حمایت حاصل کرنے میں بھی ناکام ہو گیا۔

قطب واحد پر قائم نظام اب اکیلا ہو چکا تھا اور یورپ والے بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے، یہ موضوع اس وقت فاش ہوا جب امریکہ نے عراق پر حملہ کیا اور امریکہ اقوام متحدہ سے حملہ کا جواز حاصل کرنے میں ناکام رہا اس لئے کہ اب یورپ اقوام متحدہ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا اور نو ظہور طاقتیں جیسے برازیل، ہندوستان اور چین ماضی کی طرح امریکہ کی پیروی کرنے کو ہر گز تیار نہ تھیں، روس جو ابھی تک

اضمحلال کے دور سے گذر رہا تھا اور اپنی بکھری ہوئی طاقت کو سمیٹنے میں مشغول تھا، اب وہ بھی امریکہ کی من مانی مخصوصا مشرقی یورپ اور قفقاز کے علاقہ میں دیوار بن کر کھڑا ہو گیا اور اسے وہاں اپنے پیر جمانے کی اجازت نہیں دی۔

پس معلوم ہوا کہ مختلف نظام حکومت کی شکست ناپذیری اور عدم تبدیلی کے متعلق جو تصورات پائے جاتے ہیں وہ تمام تر پروپیگنڈے ہیں اور موجودہ نظام کی ہمیشگی ہونے کی دلیلوں کی بھرمار کر دینے کے باوجود حقیقت میں کوئی بھی نظام باقی رہنے والا نہیں ہے بلکہ ایک ایک کرکے ہر نظام کو نابودی کا مزہ چکھنا ہوگا۔

لہٰذا اس وقت ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس دنیا میں نہ کوئی شہنشاہیت ہے، نہ کوئی دو قطبی نظام ہے، نہ ہی کوئی قطب واحد پر قائم نظام ہے اور نہ ہی مکمل اور آخری غلبہ ہے بلکہ اس وقت ہم متعدد اقطاب کو دیکھ رہے ہیں جن میں صلاحیتوں اور ذخایر کو فوج داری، ثقافت اور اقتصادیات کے میدان میں سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، اس کے علاوہ قطب واحد پر قائم نظام میں مدعیان قدرت کے درمیان جو واضح فرق پایا جاتا تھا، وہ ہر گز موجودہ اقطاب قدرت کے درمیان نہیں پایا جاتا ہے اس لئے کہ اس وقت کوئی بھی بڑی طاقت کا مدعی نہیں ہے جو ہر اعتبار سے صاحب کمال اور ہر میدان میں اکیلا شہسوار ہو، البتہ ابھی تک جو نکات ہم نے پیش کئے ہیں وہ بظاہر قابل احساس موارد تھے جو نظام حکومت کے عدم تغیر کے فرضیہ کو باطل کرتے ہیں لیکن موجودہ نظام حکومت گذشتہ نظام حکومت کے مقابلے میں کہیں زیادہ تغیرات کی حامل ہے جسے ہم آئندہ سطور پر تفصیل سے بیان کریں گے۔

حکومتی نظام کے ڈھانچے میں ماہیتی تبدیلی

سماجی روابط کی بڑھتی ہوئی شرح اور عالمی منڈی میں غیر سرکاری طاقتوں کی بہتات نے عالمی نظام کے محور حکومتوں کو چیلنج کر دیا ہے جب کہ دو قطبی نظام، یا قطب واحد پر مشتمل یا غلبہ نہائی کا نظام سب کا سب ایک حکومت اور سرکار پر منحصر تھے، آج کے دور میں حکومتوں کے اثر و رسوخ کو جغرافیائی حدود کے ذریعہ معین نہیں کیا جاسکتا اور آج ایک حکومت کے جغرافیائی حدود اس کے قوام کے اہم ترین رکن کی حیثیت رکھتے ہوئے بھی اپنے سابقہ مفہوم سے دور ہوتا چلا جارہا ہے، آج کے دور میں حکومتیں ہر گز اپنے حدود کو دیواروں، بروج اور قلعوں کے ذریعہ معین و مشخص نہیں کر سکتیں اور ہر گز یہ اطمینان نہیں رکھ سکتیں کہ ان کی قلمرو

میں کوئی بھی طاقتور رقیب اثر و نفوذ نہیں رکھتا اور ہر گز وہ اپنی خواہش کے مطابق اپنی عوام کے ذہن کو موڑ نہیں سکتیں اس لئے کہ موجودہ نظام کو بدل دینے والے نت نئے نظریہ نامحسوس طریقے سے حکومتوں کے قلمرو میں نفوذ کر سکتے ہیں یہاں تک کہ آج کی بڑی طاقتیں اور حکومتیں بھی پوری طرح سے اپنے قلمرو کو محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔

پس یہ نظریہ کہ ایک حکومت اپنے عوام کے افکار و عقائد پر مسلط ہو سکتی ہے، نہ صرف عالمی پیمانہ پر بلکہ داخلی پالیسی کے اعتبار سے بھی غیر قابل قبول اور مردود ہے، اس کے علاوہ غیر سرکاری عناصر بصورت بین الاقوامی تنظیمیں، ملٹی نیشنل کمپنیاں اور عالمی قومی و مذہبی انجمنوں نے منابع قدرت کو حکومت کے ہاتھوں سے نکالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ آج حکومتوں کی جانب سے غیر سرکاری عناصر پر قبضہ اور ان کے اثر و رسوخ کو محدود کرنے کی جی توڑ کاوشوں کے باوجود بطور اعجاب انگیز عالمی نظام میں ان کے اثر و رسوخ روز بہ روز بڑھتے جارہے ہیں۔انہوں نے بارہا موجودہ صورتحال کو بدلنے اور اس کی اصلاح کی مانگ کی ہے جو نظام حاکم کے نظریات کے خلاف ہے۔

اسی طرح گذشتہ دور میں کسی بھی نظام کی طاقت و شان و شوکت کا اندازہ اس کی فوج اور جنگی ساز و سامان سے ہوتا تھا۔ جس حکومت کے پاس فوج اور جنگی ساز و سامان کی کثرت ہوتی اسے سب سے بڑا مدعی قدرت تسلیم کیا جاتا تھا اور اسے اس میدان میں سب سے اونچا مقام حاصل ہوتا تھا۔ ایسے نظام میں لشکر کشی اور دوسروں کی سرزمینوں کو فتح کرنا ایک حکومت کی شان و شوکت کا بہترین ثبوت ہوا کرتا تھا اسی وجہ سے نوظہور شہنشاہیت اور سپر پاور طاقتوں کے لئے فوجی طاقت و قوت ہر چیز سے زیادہ اہم تھی اور ایسی صورت میں یہ امر طبیعی ہے کہ ایسے مدعی کا زیادہ تر سرمایہ اس طاقت کو سمیٹنے اور اس کی نمائش پیش کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ بڑی طاقتوں اور سپر پاور حکومتوں کا سب سے اہم مقصد فوجی طاقت کے ذریعہ اپنی فتوحات کی فہرست کو طولانی کرنا تھا لیکن آہستہ آہستہ فوجی طاقت کے ساتھ ساتھ اقتصادی طاقت بھی ایک حکومت کی قدرت کے اثبات کا اہم حصہ شمار ہونے لگی، یعنی اب ایک بڑی فوج کا مالک ہونا سپر پاور بننے کے لئے کافی نہیں تھا بلکہ سپر پاور طاقتیں فوجی ساز و سامان کے اعتبار سے برتری کے ساتھ ساتھ عالمی پیمانہ پر اقتصادی طاقت کو وسیع پیمانہ پر حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئیں۔

اکیسویں صدی میں تہذیب، شناخت اور غیر عینی عناصر بھی ایک نظام کی پیدائش میں موثر کردار کے مالک سمجھے جانے لگے بلکہ اس نظام میں مذکورہ عناصر کے رسوخ سے یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ وہ اس نظام میں بنیادی تبدیلی لانا چاہتے ہیں، اس لئے کہ ماضی میں فوجی طاقت کو معلوم کرنے کے ذریعہ قدرت کے قانون کی تبعیت بھی رفتہ رفتہ محقق ہو جایا کرتی تھی لیکن آج کے دور میں طاقت کا مفہوم بالکل بدل چکا ہے اور آج کسی نظام کی پیروی کے لئے صرف فوجی طاقت ہی کافی نہیں ہے لہٰذا اگرچہ ہر نظام اپنے آپ کو تغییر ناپذیر اور ہمیشگی تصور کرتا رہا ہے لیکن تاریخ نے ماضی میں گذرے نظام کی اضمحلالی اور ان کی نابودی کی داستانوں کو سمیٹ رکھا ہے۔ ایک نظام کو دوام اور ہمیشگی بخشنے والے تمام عناصر آج کے دور میں تغیر و تبدل کا شکار ہیں اسی وجہ سے آج کے دور میں سپر طاقتوں کو بھی اپنی حاکمیت اور طاقت کو باقی رکھنا ماضی کی بہ نسبت بہت دشوار اور سخت ہو چکا ہے۔

قدرت و طاقت کا مفہوم طولی اور عرضی دونوں اعتبار سے بدل چکا ہے اس لئے کہ اگر قدرت کا عرضی اعتبار سے مطالعہ کیا جائے تو آج کے دور میں قدرت کا ظہور صرف فوجی طاقت میں منحصر نہیں رہا بلکہ اس میدان کا دوسرا دعویدار یعنی اقتصاد ایک نئی طاقت بن کر ابھرتا ہوا نظر آرہا ہے جو اس کا ایک اہم رکن بن چکا ہے اور اگر طولی اعتبار سے قدرت کے مفہوم کو دیکھا جائے تو قدرت کی سختی اور حدت رنگ بدل کر قدرت نرم میں بدل چکی ہے، اسی طرح عالمی دعویدار مختلف رنگ و بھیس میں ابھر کر سامنے آرہے ہیں اور ایک حکومت اپنے سابقہ معنی میں عالمی پیمانہ پر اپنی قدرت و طاقت کو خطرہ میں دیکھ رہی ہے، پس یہ ماننا ہوگا کہ عالمی نظام میں تبدیلی اور تنوع ایک اجتناب ناپذیر واقعیت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ موجودہ نظام اور سابق نظام میں فرق اتنا ہے کہ ماضی میں ایک نظام کے عناصر بدلا نہیں کرتے تھے فقط ان کی ظاہری شکل میں تھوڑا بہت فرق آتا تھا مثال کے طور پر شہنشاہیت دو قطبی یا قطب واحد میں تبدیل ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے ایک نظام کے تمام عناصر قدرت اور حکومت کے محور پر قائم ہوا کرتے تھے لیکن موجودہ دور میں جہاں اس کی وضع و قطع میں تبدیلی آئی ہے وہیں اسے قوام عطا کرنے والے عناصر میں کافی تبدیلی واقع ہوئی ہے، نیز موجودہ نظام کو باقی رکھنے اور اس کی حیات کو دوچنداں کرنے کے لئے اگرچہ بہت تگ و دو کی جارہی ہے لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو سابقہ نظام کا ہوا تھا اس لئے کہ اس کی بنیاد متزلزل اور عناصر ضعیف ہو چکے ہیں۔

اس مقام پر اس اہم نکتہ کو بھی بیان کر دیا جائے کہ نظام بنانے والے جدید عناصر جیسے شناخت و تہذیب، فوجی اور اقتصادی عناصر کے برخلاف انعطاف پذیر ہوتے ہیں اور ان میں نرمی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان میں تبدیلی کا امکان زیادہ فراہم ہوتا ہے۔ موجودہ حالات کے پیش نظر شناخت ، تہذیب اور ثقافت کا کردار بڑھتا جارہا ہے۔ یہ غیر عینی عناصر حقیقت میں عینی عناصر کی طرح تغییر کے مقابلے میں ڈٹے نہیں رہتے بلکہ تبدیلی اور جابجائی کا پرجوش استقبال کرتے ہیں۔ بے شک قدیمی عناصر کی سخت گیری غیر قابل انعطاف نظام کے ایجاد کی باعث ہوتی ہے، یعنی ایسے نظام میں کسی قسم کی کوئی نرمی اور انعطاف نہیں پایا جاتا اور ایک سوکھی لکڑی کے مانند ہوتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ گذشتہ نظام بہت ہی سخت گیر تھا جس میں کسی بھی قسم کے نقد اور اصلاح کا امکان نہیں تھا اور ہر اصلاح و نقد کا شدت سے مقابلہ کیا جاتا تھا۔

جدید نظام کی انعطاف پذیری اور نرمی باعث ہوئی کہ اس میدان میں وہ مدعیان قدرت بھی کود پڑے جو ابھی تک حاشیہ میں رہا کرتے تھے۔ اب وہ زمانہ ختم ہو چکا ہے جب صرف وہی لوگ اس نظام میں دخالت کر سکتے تھے جن کے پاس فوجی اور اقتصادی طاقت ہوتی تھی بلکہ اس دور میں شناختی اور تہذیبی عناصر کے مالکین بھی اس نظام میں حصہ لے سکتے ہیں بلکہ یہ سہولت بھی مہیا ہو چکی ہے کہ مذکورہ غیر عینی عناصر کے مالکوں کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ ان عناصر کو بطور تمام و کمال اور وافر مقدار میں رکھتے ہوں اس لئے کہ موجودہ منعطف نظام میں عناصر کی کمیت اور ان کی کیفیت کا کوئی معیار نہیں ہے اور ان کی کوئی اہمیت بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے جدید نظام عام انسانوں اور ہمیشہ حاشیہ پر رہنے والے مجبور لوگوں کو اس نظام میں وارد ہونے کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔

اس نظام میں عام لوگوں کا شامل ہونا اور صاحبان ثروت و قدرت کے ہاتھوں سے اس کا خارج ہونا عالمی پیمانہ پر ایک نئے نظام کے وجود میں آنے کا باعث ہوگا، اس لئے کہ جدید نظام میں شناخت اور تہذیب کو زیادہ اختیارات اور قدرت حاصل ہے اور تہذیب و شناخت انسانوں کے آپسی تعلقات سے وجود میں آتے ہیں جو ہر گز صاحبان قدرت و ثروت کے اختیار میں نہیں ہے، اسی وجہ سے جب صاحبان قدرت و ثروت نظام پر اپنی گرفت کو کمزور پاتے ہیں اور جب ان کی قدر و منزلت فنا پذیر دکھائی دینے لگتی ہے تو وہ مختلف قسم کے پروپیگنڈوں کا سہارا لیتے ہیں تاکہ نقد و اشکال کا شدت سے مقابلہ کر سکیں اور عمومی افکار و اذہان کو موجودہ ڈھانچے پر راضی رہنے اور اسے باقی رکھنے کی تلقین کرتے رہیں۔

اس کے باوجود رائے عامہ کا یہ طوفان اور انقلاب ان کی ملمع کاری کو رہنے نہیں دے گا اس لئے کہ موجودہ حالات و شرائط اس امر کے متقاضی ہیں کہ ہر قوم و نسل کی شراکت کے ذریعہ واقعی جمہوریت دنیا میں قائم ہو، ذرائع ابلاغ کی ترقی کے باعث مختلف تہذیبوں میں تعلقات بڑھ گئے ہیں اور عام لوگوں کو یہ نایاب موقع فراہم ہوگیا ہے کہ وہ ایک جامع و کامل نظام کا خود انتخاب کریں۔ پس معلوم ہوا کہ نئے مدعیان قدرت اصلاح چاہتے ہیں اور وہ ہر گز قدیمی مدعیان قدرت کی سخت گیری کو تحمل نہیں کریں گے۔

کیا موجودہ نظام سب سے بہتر اور کامل ہے؟

موجودہ نظام کی پوری کوشش ہے کہ وہ اپنے آپ کو بہترین اور کامل ترین نظام کے عنوان سے پیچنوائے جو سابقہ نظام کے عیوب کو ختم کرکے اور عقل جمعی کی شراکت سے وجود میں آیا ہے لیکن عملی طور پر یہ نظام انسانی معاشرہ کی عقلانیت کی وجہ سے وجود میں نہیں آیا ہے بلکہ اسے صاحبان قدرت وثروت کے درمیان رقابت کا نتیجہ سمجھ سکتے ہیں۔ گذشتہ دور میں انسانی سماجی کی تقسیم بصورت مالک اور رعیت رہی ہے اور زیادہ تعداد ہمیشہ رعیت کی رہی ہے اور ہر گز واقعی معنی میں ان سے حکومت کرنے کے طور طریقے کے بارے میں مشورہ نہیں لیا گیا، سابقہ نظام میں یہ فرضیہ مسلّم مانا جاتا تھا کہ حکومت ایک منسجم نظام کا نام ہے جس کی صرف ایک آواز ہے اور وہ آواز عام انسان کی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذکورہ دعوے کو مان لیا جائے تو کیا بے شمار جنگیں، خونریزیاں، قتل و غارت گری، فقر و فاقہ اور ظلم و ستم عام انسانوں کا مطالبہ تھا یا پھر ان لوگوں کی کرتوتیں تھیں جو قدرت و طاقت کے شیدائی تھے اور خود کو عام انسانوں کا نمائندہ گردانتے ہوئے اپنی آرزوؤں کو دنیا کے تمام انسانوں کی آرزو کے نام پر پیش کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے؟ صاحبان قدرت وثروت ایسے حالات میں عالمی سماج کی نیابت میں بات کرتے ہیں جب کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے ان کے منافع کو غارت کرنے میں مشغول ہیں اور ان کی مصلحتوں کی حفاظت کی راہ میں قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ لوگ پروپگنڈوں اور رائے عامہ پر قبضہ کرنے کے ذریعہ عام لوگوں کو ایک ایسی خواہش کے تحقق و تعمیل کی ڈگر پر لگادیتے ہیں جس میں دولتمندوں کو بھرپور فائدہ پہنچتا ہے اور عام انسانوں کے حصہ میں بد بختی و بے چارگی آتی ہے پس یہ

مسلّم ہے کہ سابقہ نظام صرف کچھ ہی انسانوں کے لئے سود آور تھا اور عام انسانوں کے لئے صرف ضرر و زیان کا باعث تھا۔

عالمی حکومتی نظام میں اسلام سے بے توجہی کے اسباب

موجودہ عالمی نظام جن حالات و شرائط سے دوچار ہے، اس کے پیش نظر اس کے انتظام کو عقلانی بنانے کے لئے بڑی رکاوٹوں کا سامنا ہے۔اس میں جدید طور طریقے اور افکار کو قبول کرنے کا لازمی انعطاف و جھکاؤ موجود نہیں ہے۔ ایسے حالات میں اسلام جو ایک عالمی دین ہے اور اس کی اساس عقلانیت پر استوار ہے اور ہمیشہ قدرت وثروت پر قبضہ جمانے والوں سے برسرپیکار ہے، اسے ایسے لوگوں کی نفرتوں اور منفی اقدامات کا سامنا ہے ۔ اسلام اپنی بے مثال اقدار کی بناپر موجودہ نظام کے قدیمی اصول و قوانین کو بالکل بدل دے گا اور اگر اس نظام میں اسلام کے وارد ہونے سے صرف اور صرف اس کی ظاہری شکل جیسے شہنشائیت سے دو قطبی میں بدل جاتی تو شاید عالمی پیمانہ پر اسے بہت کم مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا لیکن اسلامی اقدار نہ تنہا موجودہ نظام کی ظاہری شکل کو بدل دینا چاہتے ہیں بلکہ اس کی ماہیت اور محتوا سبھی کچھ کو بدلنے کے خواہاں ہیں۔

اسلام ایک مکمل اور مستقل مکتب فکر و نظام حیات ہے جس کی بناپر اس کے جملہ رقیب جیسے لیبرل ازم اور کمیونیزم اس کے مقابلے میں متحد ہو جاتے ہیں۔اسلام کا دعویٰ ہے کہ عالمی نظام نے ابھی تک جو بھی تبدیلیاں اپنے وجود میں مشاہدہ کی ہیں وہ سب ظاہری ہیں اور سابقہ تمام نظام بظاہر ایک دوسرے کے رقیب ہونے کے باوجود سبھی مادیات کے طرفدار، قدرت محور، تشدد پسند، بشری عقلانیت کے مخالف اور دنیا کی اقلیت میں رہنے والے صاحبان قدرت وثروت کے طرفدار رہے ہیں لیکن اسلام نے قدرت کا دامن تھامنے کے بدلے عدالت کا سہارا لیا، حاکم کی پیروی کرنے کے بدلے صرف اور صرف اپنے پروردگار کی اطاعت کی، انسانوں کے درمیان مساوات کی بات کی اور عوام فریبی اور جھوٹے پروپیگنڈے کی جگہ عقل و منطق کو اپنا ذریعہ بنایا۔ اسلام نے سابقہ تمام نظاموں کے برخلاف جو قدرت کو اپنا قیم اور قوام بخش قرار دیتے ہیں، انسانوں کے حق میں خدا کی سب سے عظیم نعمت اور ہر فرد کی رہنما عقل کو ذریعہ بنایا۔ چنانچہ اسلام اپنے اصول اور اقدار کی بناپر عالمی نظام کے ٹھیکیداروں کی جانب سے مورد غضب واقع ہو رہا ہے اور اسے ہر روز نت نئے جان لیوا حملوں کا سامنا رہتا ہے۔

اسلام کا موجودہ مقام و مرتبہ

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جاچکا کہ عالمی نظام میں اسلام اور اسلامی تفکرات کے رسوخ کی راہ میں عالمی نظام کے ٹھیکیداروں کی لاکھ مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود انسانوں کی عقلانی عناصر نے روایتی اور قدیمی نظام کی ماہیت کو بدلتے ہوئے دنیا کے تمام انسانوں کے کانوں تک اسلام کے پیغام کو پہنچانے کا راستہ ہموار کردیا ہے۔

اسلامی مباحث میں قدیم نظام کی ماہیت کی تبدیلی بہت آسان مانی جاتی ہے اس لئے کہ آج انسانوں کی عقلانیت رفتہ رفتہ ترقی کرچکی ہے اور اس راہ میں وہ مسلط عناصر جو خدادادی عقلانیت کی طرفداری کے بدلے، ڈرانے دھمکانے، قلع و قمع کرنے اور لوگوں کو دھوکہ میں رکھنے کو اپنا طور طریقہ بنائے ہوئے تھے، ہرگز ان کو برداشت نہیں کیا جاسکتا، یہ وہی انجام ہے جس کی طرف خداوند عالم نے قرآن کریم میں اشارہ فرمایا ہے اور ''وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ'' یا ''أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ'' جیسی آیتیں بیان کرتی ہیں۔

متقی اور صالح وہی لوگ ہیں جو خدا کی عطا کردہ عظیم نعمت اور باطنی رہبر یعنی عقل کی مدد سے ترقی یافتہ زندگی اور واقعی آزادی تک پہنچنے کے لئے انسانوں کے سامنے زندگی کے راستے کو ہموار کردیتے ہیں، البتہ اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے کہ وہ صاحبان قدرت و شوکت جن کی حیات و منافع گذشتہ نظام کی بقا میں ہے وہ ہرگز جدید نظام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے اور اپنے منافع لئے وہ عوام فریبی، رعب و وحشت اور قتل و غارتگری جیسے حربوں کا سہارا لیں گے اور ایک عظیم جنگ و قتل و غارتگری کو بعید نہیں گردانا جاسکتا۔

عالمی نظام میں ذرائع ابلاغ کی فراوانی اور غیر مادی و تہذیبی عناصر کے اثر و رسوخ نے اس کے لئے بڑی مشکلیں کھڑی کردی ہیں اور اب موجودہ سخت گیر نظام کے بدلے انعطاف پذیر اور اصلاح شدہ نظام کی ضرورت ہے۔ اسلام کو اس میدان سے باہر نکالنے کے لئے موجودہ نظام کی تمام تر کوششوں اور تگ و دو کے باوجود مشرقی اور مغربی تہذیبوں میں اسلام کا بول بالا عالمی نظام میں بنیادی تبدیلیاں اور اسلام کی مورد حمایت عقل گرائی کے غلبہ کی خبر دے رہی ہے۔ خدا کی عطا کردہ عقل کا رفتہ رفتہ کمال یافتہ ہونا

اسلام کے متبادل نظاموں کے کھوٹے پن کو پہچاننے اور حقیقت کو مجاز سے الگ کرنے میں عام انسانوں کی مدد کرے گے۔

اگرچہ ابھی تک اسلام کو اتنا موقع نہیں ملا کہ وہ عالمی پیمانہ پر اپنے نظام کی بنیاد رکھے لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ موجودہ عالمی نظام پہلے سے زیادہ اس وقت سماجیات سے متاثر ہوا ہے اور ایسے میں اسلام کا روز بہ روز چڑھتا ہوا سورج آخرکار عالمی سیاست میں اسلام کے موثر اقدامات کا باعث ہوگا اور یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اسلام کا عالمی خواب نیک تعبیر سے ہمکنار ہوگا اور اسلام اپنے عالمی نظام کو حاکم بنانے میں کامیاب ہوگا اس لئے کہ روز بہ روز انسانوں کی عقل کی ترقی اب ہر گز موجودہ عالمی نظام کو اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ وہ حقائق کو دگرگوں کر سکیں اور اس پر پردہ ڈال سکیں۔

عصر حاضر میں ذرائع ابلاغ اور حوادث و واقعات کی دوبارہ نمائش: ایک مختصر مطالعہ

مولف: ڈاکٹر روح الامین سعید
مترجم: اطہر عباس رضوی

حقیقت یہ ہے کہ ہم آج ایسے دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں حقیقت و مجاز کے درمیان کی حد شکست و ریخت سے دوچار ہے۔ آج ذہن انسانی کے لئے اس بات کی تشخیص کہ ایک امر واقعی ہے یا غیر واقعی، سہولت و آسانی کے ساتھ ممکن اور میسّر نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے جس چیز کو ذہن نے ایک ناقابل انکار اور خلل ناپذیر حقیقت کے عنوان سے قبول کیا ہے، اس کا دنیا میں سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو یا کم سے کم اس کی نوعیت اور کیفیت وقوع مورد قبول روایت سے مختلف ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ اس صورتحال کے لئے موجودہ ذرائع ابلاغ یعنی ریڈیو، ٹیلیویژن اور اخبار وغیرہ ذمہ دار ہیں۔ ماضی قریب میں انسان بلاواسطہ واقعات و حقائق سے روبرو ہوتا تھا اور انہیں خود اپنے حواس کے ذریعے درک کرتا تھا، لیکن موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ، ذہن انسانی اور رونما ہونے والے واقعات کے درمیان واسطے کا کام انجام دیتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں انسان دنیا کو ذرائع ابلاغ (ریڈیو، ٹیلیویژن، اخبار) کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اکثر واقعات سے بلاواسطہ روبرو ہونے کا موقع کھو دیتا ہے یعنی انسان آج کی وسیع و عریض دنیا اور پے در پے رونما ہونے والی حیرت انگیز مواصلاتی تبدیلیوں کے باعث، رونما ہونے والے حوادث واقعات سے آگاہی حاصل نہیں کر پاتا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ وہ ذرائع ابلاغ کی زبان سننے کے لئے مجبور ہے۔ اس طرح سے آج ذرائع ابلاغ کو واقعات کو روایت اور نقل کرنے کا منبع اور سرچشمہ مانا جاتا ہے اور ذرائع ابلاغ ہی رونما ہونے والے واقعات کی انسانوں کے لئے تصویر سازی کرتے ہیں۔

عصر حاضر میں واقعیت اور واقعیت کو پیش کرنے کی درمیانی حد ختم ہو چکی ہے اور واقعی دنیا وہی ہے جسے ذرائع ابلاغ پیش کرتے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں آج کی دنیا کو ایک مافوق الفطرت دنیا جاننا چاہئے جس میں انسانوں کا سروکار اور تعلق اصل واقعیت سے نہیں ہے بلکہ ان تصاویر و تعابیر سے ہے جسے ذرائع ابلاغ پیش کر رہے ہیں یعنی اس وقت تصویروں نے واقعیت کی جگہ لے لی ہے۔ بطور مثال ذرائع ابلاغ سیاستدانوں کی جو تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ اصل سے کہیں زیادہ واقعی لگتی ہیں لہٰذا دور حاضر میں معنی و واقعیت نے اپنی جگہ تصویر کو دے دی ہے اور جو کچھ ہم واقعیات کے بارے میں جانتے ہیں وہی ہیں جو ذرائع ابلاغ تصورات کے سانچے میں ڈھالتے اور ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

آج نوبت یہ آ گئی ہے کہ جو حوادث وواقعات فلموں، تصویروں یا رپورٹوں کی شکل میں پیش کئے جاتے ہیں وہ اصل واقعہ سے کہیں زیادہ واقعی اور حقیقی لگتے ہیں۔ اس مافوق الفطرت دنیا میں ذرائع ابلاغ الفاظ و کلمات کے ذریعے حوادث و واقعات کی اپنے طریقے سے تفسیر کرتے ہیں اور اپنے خود ساختہ معانی کو مخاطبین کے ذہن میں بٹھاتے ہیں تاکہ اس کے حوالے سے ان کے ادراکات کی تعمیر نو کر سکیں ۔آج کے انسانوں کی زندگی ٹیلیویژن جیسے ذرائع ابلاغ کے شکنجے میں اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ حقیقت کو مجاز اور مجاز کو حقیقت سے تشخیص دینا ناممکن ہوتا ہے۔

اس درمیان تحفظ و سلامتی جیسے مفاہیم جن کی ماہیت سیال اور انتزاعی ہوتی ہے اور دنیا میں ان کا کوئی معین مصداق نہیں ہوتا ، ان پر ذرائع ابلاغ کے اس کھیل کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں چونکہ سلامتی کا کوئی عینی مصداق نہیں ہوتا ہے لہٰذا ذرائع ابلاغ اس مفہوم کو اپنے طور پر طے کر سکتے ہیں یعنی ذرائع ابلاغ اپنے مخاطبین کے ذہن پر سلامتی اور تحفظ کے حوالے سے اپنا مخصوص نظریہ تحمیل کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کسی حادثے اور واقعے کو مخاطب کے سامنے سلامتی کے خطرہ کے طور پیش کر سکتے ہیں جب کہ حقیقت میں وہ واقعہ کسی تہدید کا پیش خیمہ نہیں ہے۔ لہٰذا اگر مان لیں کہ ذرائع ابلاغ آج کی دنیا میں اس طرح انسانوں کے نظریات اور ذہنی تصورات کو تشکیل دیتے ہیں ،اس وقت امن و سلامتی جیسے مفاہیم کی تشکیل میں ان کا محوری اور مرکزی کردار روز روشن کی طرح آشکار و واضح ہو جائے گا۔

ذرائع ابلاغ اپنے نافذ آلات ووسائل کی بدولت خاطر خواہ معنی و مفہوم کی تخلیق کر سکتے ہیں اور ان معانی و مفاہیم کو خصوصا تصویر کی گویا زبان میں ہر قوم ملّت، فرقہ و نسل اور تمدّن و تہذیب کے مخاطبین کیلئے قابل فہم بنا سکتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ نظریات، تصورات اور انسانوں کے ادراکات کو قالب اور پیکر عطا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی مفہوم کو پوری دنیا میں پھیلا سکتے ہیں۔ اس حساب سے شاید کسی دوسری چیز میں مسلّط گفتگو کی خدمت کیلئے معانی و مفاہیم بنانے اور پھر انہیں وسیع تر پیمانے پر پیش کرنے کے لحاظ سے اتنی گنجائش وصلاحیت نہ ہو۔ کہا جاسکتا ہے کہ ذرائع ابلاغ ایک طاقتور لاؤڈ سپیکر کی طرح عمل کرتے ہیں جس سے مسلّط گفتگو کی آواز اور اس کی گونج پوری دنیا میں سنائی دیتی ہے۔ بلا شبہ یہی وجہ ہے کہ سلامتی، امن اور ناامنی جیسے مفاہیم کے بناوٹی اور جعلی معانی القا کرنے کے مقصد سے ذرائع ابلاغ کی تصویر سازی کا ہمیشہ امریکہ کے تسلّط پسندانہ مقاصد کے تحقق میں بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

اس تغیر اور تبدیلی میں سیاستدانوں کی تشخیص اور صوابدید کے مطابق تحفظ اور سلامتی کے جعلی مفاہیم پر بحث و گفتگو کے نتیجے میں تعیین مصداق کے بعد ذرائع ابلاغ کی باری آتی ہے تاکہ وہ ان مفاہیم کی نشر و اشاعت کریں اور انہیں لوگوں تک پہونچائیں۔ ذرائع ابلاغ اپنی تمام تر طاقت و ذرائع کو بروئے کار لاتے ہیں اور الیکٹرانک میڈیا اپنی پوری طاقت صرف کر دیتا ہے تاکہ مختلف طریقوں سے مختلف معاشروں کے لوگوں کے تصورات و ادراکات پر گہرائی کے ساتھ اثرانداز ہو اور سب کو اس بات پر مجبور کر دے کہ دنیا پر مسلط مغربی افکار و نظریات اور رجحانات کے آئینے میں اپنا اور اپنے ارد گرد کی تبدیلیوں کا جائزہ لیں۔

آخری دہائیوں میں امریکہ کے ذرائع ابلاغ اور الیکٹرانک میڈیا کا مطالعہ کرنے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے پروگراموں کی شکل و صورت اور مضمون کو وائٹ ہاؤس کے لیڈروں کی راہ و روش سے ہم آہنگ کر رکھا ہے۔ یہ ہم آہنگی اور ہمسوئی واضح طور پر ہالی ووڈ کی پر مخاطب فیلموں میں قابل مشاہدہ ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۰ کی دہائی میں جس وقت سوویت یونین روبزوال تھا، Dilta Force یا Iron Eagle جیسی فلموں میں کمیونیزم کی جگہ اسلامی شدّت پسندوں کے خطرات کو دکھانے اور منعکس کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح کی فلموں میں عربی مسلمانوں کو امریکہ کا دشمن نمبر ایک اور مشرق وسطیٰ کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی سیاسی و فوجی مداخلتوں کا میدان دکھایا گیا ہے۔

یہ روش ۱۹۹۰ کی پوری دہائی میں قائم و دائم رہی اور رفتہ رفتہ عرب کے مسلمان جوان ہالی ووڈ کی فلموں میں دہشت گرد جماعت کی صورت میں بدل گئے ۔ لمبی لمبی ڈاڑھی والے جوان، فلسطینی اور عربی لباس پہنے ہوئے جوان جو ہر جگہ دہشت گردی، شورش وبغاوت، بم سازی، بمباری، اغوا، ہائی جیکنگ اور ناامنی و وحشت کا باعث اور محرک ہیں اور امریکہ یا دوسرے ممالک کے مردوں، عورتوں اور معصوم بچوں کی زندگیاں خطرے میں ڈالتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۹۴ کی True lies، ۱۹۹۶ کی Executive Decision اور ۱۹۹۸ کی The S Iege پر فروش فلمیں ہیں جن میں مسلمانوں کے منفی اور خوفناک چہرے کو نمایاں کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے اور مضمون کے اعتبار سے تینوں میں کافی مشابہت بھی ہے۔

ملحوظ رہے کہ ہالی ووڈ اس طرح کی جذاب، دلچسپ اور پُرکشش فلمیں بنا کر اور ان کو پوری دنیا کے بازاروں میں پہونچا کر حقیقت میں اپنے بے شمار مخاطبین کے لئے نمونہ سازی کرتا ہے۔ ایسے لوگ جنھوں نے اپنی پوری زندگی میں کسی بھی عربی ملک کو نزدیک سے نہیں دیکھا ہے حتیٰ یہ بھی نہیں جانتے کہ عربستان یا عراق جغرافیہ کے نقشے پر کہاں واقع ہے، جب الیکٹرانک میڈیا اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس طرح کے بے شمار شبہات سے روبرو ہوتے ہیں تو لاشعوری طور پر ان کے پیغامات میں موجود مفاہیم سے متاثر ہوتے ہیں۔ جب کوئی امریکی یا یورپی متعدد فلموں میں یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ جہاں بھی کسی کا قتل ہوتا ہے، یا بم گزاری ہوتی ہے، یا کسی ہوائی جہاز کو اغوا کیا جاتا ہے وہاں عرب مسلمانوں کا ہاتھ ہوتا ہے، رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں اسلام اور دہشت گردی و ناامنی کے درمیان ایک طرح کا منطقی رابطہ برقرار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ہر اس چیز سے جو اسلام سے وابستہ ہے، حتیٰ نعرۂ تکبیر اور کلمۂ توحید سے بھی جسے ہالی ووڈ کی فلموں میں دہشت گردی کا رول ادا کرنے والے اداکار وحشیانہ مظالم کرتے وقت اپنی زبان پر لاتے ہیں، گریزاں، متنفر اور بیزار نظر آتا ہے اور ان سے نہایت شدّت کے ساتھ نفرت کرنے لگتا ہے۔

بلاشبہ جن لوگوں نے فلم The S Iege دیکھی ہے اور پردے پر شہر نیویارک میں شدت پسند مسلمانوں کے دل ہلا دینے والے دہشت گردانہ اقدامات دیکھے ہیں، جب اس فلم کی نمائش کے تین سال بعد یعنی ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ میں واقعی دنیا میں ایک دہشت گردانہ حملے سے روبرو ہوتے ہیں اور ان کی حیرت زدہ نگاہوں کے سامنے عالمی تجارت کی دو فلک بوس عمارتیں زمیں بوس ہو کر رہ جاتی ہیں اور حکومت کی جانب سے اس حادثہ کے ذمہ داروں کی حیثیت سے کچھ لوگوں کی پہچان کرائی جاتی ہے تو ان کی ماہیت اور اغراض

و مقاصد سے وہ بیگانہ نہیں ہیں لہٰذا ذرائع ابلاغ اور الیکٹرانک میڈیا کے جادو سے ایسا کام کیا جاسکتا ہے کہ پوری دنیا کے لوگ سپر پاور ملک کے دشمن کو پوری دنیا کا دشمن اور نا امنی کا روشن مصداق مان لیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ مسلّط بحث و گفتگو ذرائع ابلاغ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے دنیا کے لوگوں کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھا سکتا ہے کہ فقط امریکہ کے زیر سایہ ہی تحفظ و سلامتی قائم رہ سکتا ہے اور صرف امریکہ ہے جو اپنے عظیم قدرتی منابع اور ذرائع سے استفادہ کرتے ہوئے باغیوں، سرکشوں اور عالمی صلح و امن کے دشمنوں کا صفایا نیز حقوق بشر کی حفاظت کر سکتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے پروگرام بالخصوص سنیما اور فلمیں اس طرح کے پروگراموں سے مملو اور پر ہیں جو امریکہ کو ایک منجی، مصلح، فداکار اور انسانوں کی جان و مال اور ناموس کے محافظ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

آج ریمبو، راکی، سپر مین، اسپائیڈر مین جیسی ہالی ووڈ کی مشہور اور محبوب فلمیں، حقیقت میں امریکی طرز کی عدالت خواہی کا نمونہ ہیں، ایسے مافوق الفطرت انسان جو مرتے نہیں ہیں اور فلم کے مسحور کن اور ہیجان آور حوادث میں جہاں کہیں بھی کوئی حق پائمال ہوتا ہے یا کوئی شیطان صفت دشمن حملہ آور ہوتا ہے اور لوگوں کی زندگی کو خطرات سے دوچار کرتا ہے تو فوراً نام نہاد امریکی جانباز حادثہ کی جگہ ظاہر ہو جاتے ہیں اور اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے برضا و رغبت موت کے منھ میں کود پڑتے ہیں تاکہ اپنی طاقت کے ذریعہ مظلوم و ستم دیدہ لوگوں کو نجات دیں اور پھر سے امن و امان قائم کریں۔

آج جب تماشہ دیکھنے والے مجازی دنیا سے حقیقی دنیا میں قدم رکھتے ہیں اور وائٹ ہاؤس کے رہبروں کی شعلہ بیانیوں کو ریڈیو اور ٹیلیویژن پر سنتے اور دیکھتے ہیں، جب دیکھتے ہیں کہ امریکی سیاستداں گیارہ ستمبر کے ہولناک حادثے کے بعد امریکہ کو بشریت کا نجات دہندہ کہتے ہیں اس لئے کہ اپنی طاقت کی وجہ سے امن و سلامتی برقرار کرنے اور دنیائے آزاد کے دشمنوں کو سرکوب اور پائمال کرنے کیلئے ایک سنگین اور تاریخی ذمہ داری کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے، جب ٹیلیویژن کے صفحے پر نا امنی اور دہشت گردی کے بانی کے عنوان سے مسلمانوں کی تصویر دیکھتے ہیں، جب اصطلاحِ محور شرارت ان کے کانوں میں پڑتی ہے اور جب ایران اور شمالی کوریا کے میزائیلی اور ایٹمی خطرے سے ان کو ڈرایا جاتا ہے تو یہ وہ جگہ ہے جہاں ایک نامحسوس رشتہ ذرائع ابلاغ کی مجازی دنیا کو دنیائے حقیقی سے جوڑتا ہے اور فلموں اور ٹی وی کے پروگراموں میں موجود تمام استعارات، کنایات، تمثیلات، علامات اور نمونے رمز گشا ہوتے ہیں اور پردے سے باہر

آتے ہیں۔ایسے پروگراموں کا غیر مستقیم اور پوشیدہ پیغام یہ ہے کہ ناامنی اور عدم تحفظ کا عارضہ فقط امریکہ اور اس کے ہم پیمانوں کی فعالانہ مداخلت سے بہبود پائے گا البتہ کچھ دوسرے ذرائع ابلاغ بھی پردہ پوشی کے بغیر اور مزید صراحت لہجہ کے ساتھ سیاسی پیغامات دیتے ہیں اور آشکارا طور پر امریکی لیڈروں کے لئے لاؤڈ سپیکر کا کام کرتے ہیں۔ حقیقت میں دور حاضر کی بہت ساری فلموں اور ٹی وی کے پروگراموں کو دنیا کی سلامتی و تحفظ اور ناامنی کے مفاہیم و مصادیق کے لحاظ سے امریکہ کی روایت کا مروّج جاننا چاہئے۔ان ہنری آثار کے خالق فلمی داستانوں کی ہنرمندانہ روایت گری سے اور ترقی یافتہ تکنیک کے استعمال اور مخصوص بصری جلووں کی بدولت ہر دیکھنے والے کو مسحور کردیتے ہیں اور اپنا دیوانہ بنا لیتے ہیں۔وہ اس بات میں کامیاب ہوئے ہیں کہ بہترین طریقے سے واقعات کو جیسا کہ خود چاہتے ہیں مخاطبین کے لئے بیان کریں اوران کے ذہنوں میں تصویر سازی اور سپر پاور ملک کے سفارشی پیغامات کو غیر مستقیم طریقے سے پیش کرنے کے ساتھ ایسا کام کریں کہ مخاطبین ناخواستہ طور پر عالمی سلامتی و ناامنی کی امریکی روایت کو بعنوان روایت مسلّط قبول کرلیں۔

مثال کے طور پر گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حادثے کے بعد مغربی ذارئع ابلاغ کا سب سے اہم مقصد امریکی معاشرہ اور عالمی معاشرہ کو پر امن بنانے کے لئے افغانستان و عراق پر امریکی حملے کے لئے جواز پیش کرنا تھا۔ہالی وڈ کے آخری برسوں کی بہت ساری فلمیں اور سیریل،پر التہاب اور تشویش و اضطراب آور حوادث کی تصویر کشی کرتے ہیں، جس کے ضمن میں امریکی معاشرہ خارجی حملات و خطرات کے باعث حالت اعتدال سے باہر ہورہا ہے اور بے گناہ امریکی شہری طرح طرح کے مخرّب دہشت گردانہ اقدامات منجملہ ایٹمی اور بایولوژیک دہشت گردانہ حملوں کا شکار ہورہے ہیں، بے رحم اور سفاک قاتل اور دہشت گرد جنھوں نے امریکی معاشرے سے سلامتی کو سلب کررکھا ہے، عام طور پر مسلمان ہیں اور ان کے نام عربی ہیں اور وہ اپنے سیاسی مقاصد کو پورا کرنے کیلئے ہر غلط کام کرنے کیلئے تیار ہیں اور ملکی سطح پر اغوا، قتل و کشتار، بیجا ٹیکس وصول کرنے، ایٹمی مراکز کے نظام میں خلل ڈالنے، مرگبار وائرلیس چھوڑنے اور ایٹمی بم نصب کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے ہیں۔

اس درمیان، امریکہ کے مردانِ سیاست جیسے وائٹ ہاؤس، وزارت دفاع اور سیکوریٹی اہلکار دہشت گردوں اور دہشت گردی سے مقابلہ کرنے کیلئے میدان میں قدم رکھتے ہیں اور امریکی قوم اور بشریت کو

نجات دینے کیلئے شجاعانہ اقدام کرتے ہیں تاکہ بحران اور آشفتگی پر کنٹرول کرکے دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنادیں اور پھر سے نظام میں امن وامان واپس آجائے۔ ان فلموں میں یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ امریکہ کی سلامتی و تحفظ پوری دنیا کی سلامتی کے مترادف ہے اور سبھی دوسری چیزوں پر مقدم ہے۔

اس طرح کی فلمیں مخاطب کے ذہن میں ایک سوق الجیشی تصویر پیدا کرتی ہیں جس کی وجہ سے وہ لاشعوری طور پر سلامتی کو واپس لانے کے لئے امریکہ کے ہر اقدام کو حق بجانب مانتا ہے۔ مخاطبین چار وناچار فلم کی منطق کو قبول کر لیتے ہیں۔ ایسی منطق جو یہ باور کرانے کی کوشش کرتی ہے کہ اگر امریکی پولس اہلکار دہشت گردی پھیلانے والے کچھ مسلم جوانوں کو قبول جرم کے لئے ایذا واذیت پہنچاتے ہیں تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ ایسا دھماکہ کرنے والے ہیں جس سے ہزاروں اور لاکھوں بے گناہ لوگ مارے جائیں گے۔

اب اگر ہالی ووڈ کی فلموں میں دکھائی جانے والی امریکی فوجیوں کی مثبت شبیہ کو افغانستان و عراق میں اور ابوغریب و گوانتاموے کے جیلوں میں امریکی ظلم وبربریت سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ذرائع ابلاغ واقعات کو ایک مقصد کے تحت بار بار دکھا کر اور مخاطبین کو جعلی اور ذہنی سرحدوں میں محصور ومقیّد کرکے اور وائٹ ہاؤس کے دل پسند راستے کی طرف ان کے افکار کو موڑ کر امریکہ کے عالمی تسلّط واقتدار کو بڑھانے اور اس کی مضبوطی اور استحکام کے لئے کتنی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

یہ ذرائع ابلاغ امریکہ کے دشمنوں بالخصوص مسلمانوں کی سست و ضعیف تصویریں پیش کرکے حقیقت میں مخاطب اور حقیقت و واقعیت کے درمیان ایک عاطفی اور احساساتی بند باندھتے ہیں، جس کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی معاشرے میں اندھی نفرت پیدا ہوتی ہے اور نسل پرستی، قومی تعصّبات اور کینہ پروری و کدورت کو ہوا ملتی ہے اور سب بغض وعناد اور نفرت کی آگ میں جھلنے لگتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ بظاہر مسلمان دہشت گردوں اور سفاک قاتلوں کے وحشیانہ حملوں کی تصویریں پوری دنیا میں پھیلاتے ہیں لیکن امریکی فوجیوں کے ہاتھوں افغانستان، پاکستان اور عراق میں سیکڑوں بے گناہ انسانوں کے قتل عام پر ان کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی ہے۔ شارلی ابدو[1] کے مشکوک حادثے کو اپنی خبروں میں

---

1. Charli e Hebdo.

سرفہرست قرار دیتے ہیں اور سرخیوں میں رکھتے ہیں، لیکن آسانی کے ساتھ چیپل ہیل[1] حادثہ اور تین مسلمان طالب علموں کے قتل سے گزر جاتے ہیں۔ذرائع ابلاغ حتیٰ فلم American Sniper میں ایک جنگی جنایتکار کو ایک قومی ہیرو کے عنوان سے پیش کر سکتے ہیں۔ نتیجتاً اس بات میں کوئی تردید نہیں ہے کہ آج پوری دنیا خصوصا مغربی ممالک میں اسلام ہراسی کی ترویج کا اصلی سبب نظام تسلّط کے حامی ذرائع ابلاغ ہیں جو اپنے نافذ آلات ووسائل پر تکیہ کرتے ہوئے انسانوں کے ذہن کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں اور ان واقعات کو بار بار دہراکر سلامتی و تحفظ جیسے پیغامات کو بہت ہنر مندانہ طریقے سے ان کے دل و دماغ میں راسخ کرنا چاہتے۔

سپر طاقت ملک کے لئے ان ذرائع ابلاغ کا گرانقدر محصول، مختلف ممالک کے لوگوں کے افکار عمومی کی ہدایت اور عالمی پیمانے پر اس کے لئے مناسب اور مطلوب فضا ایجاد کرنا ہے تاکہ تسلّط پسند اور اقتدار طلب اغراض و مقاصد کے تحقق کے لئے سخت فوجی اور عسکری طاقت و قوت کا استعمال جائز و مشروع اور توجیہ پذیر ہو۔اس حساب سے کہنا چاہئے کہ اکیسویں صدی کا انسان اپنی ظاہری آزادی کے برخلاف عمیق طور پر مغربی ذرائع ابلاغ کے بڑے بڑے چینلوں کے ذریعے بنائے گئے ذہنی حصاروں میں گرفتار ہو گیا ہے۔

1. Chapel Hill.

معلومات عامہ اور مغربی ممالک میں اس کی موجودہ صورتحال

مولف: محمود بابائی
مترجم: منہال حسین خیرآبادی

عصر حاضر میں مغربی سماج میں زندگی بسر کرنے والوں کی معلومات عامہ کے ذرائع کیا ہیں اور وہ کس حد تک عالمی واقعات سے واقف ہیں؟ آج کے دور میں مغربی سماج کی معلومات عامہ عالم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور دشمنی پر کیوں قائم ہے اور وہ اسلام کو اپنی بقا کے لئے بہت بڑا خطرہ کیوں گردانتے ہیں؟ اگر ان لوگوں نے بعض نام نہاد اسلامی جماعتوں اور تنظیموں کے شدت پسند رویہ اور متعصبانہ اقدامات کی وجہ سے یہ رویہ اپنایا ہے تو پھر فلسطینیوں پر مظالم اور غیر انسانی سلوک کی بنا پر وہ اسرائیل سے نفرت کیوں نہیں کرتے اور ویسا ہی تصور اس کی نسبت کیوں نہیں رکھتے؟ کیا مغربی انسانوں کی معلومات عامہ کو ایک منظّم سازش کے تحت کنٹرول کیا جارہا ہے؟

مذکورہ تمام سوالوں کا جواب social constructivism کے ذریعہ دیا جاسکتا ہے جس میں سوال کرنے والوں کو پوری طرح مطمئن کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ نظریہ خارجی واقعیات کے مستقل رونما ہونے کو مردود قرار دیتے ہوئے اسے سماجی حالات و شرائط کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ ایک دوسری عبارت میں یوں کہنا مناسب ہے کہ جو شخص اس نظریہ کا طرفدار ہے اس کے لئے کسی بھی واقعیت کی اصالت اہم نہیں ہے بلکہ اس کے لئے وہ مشترکہ درک و فہم زیادہ ضروری ہے جو بنیادی طور پر ایک واقعیت کو وجود کا لباس عطا کرتا ہے۔ (سماجی واقعات کو حقیقت سے روشناس کرتا ہے)

اس نظریہ کے مطابق خیالات، تصورات اور ذہنی ساز وکار انسانی سماج میں فیصلہ کن کردار نبھاتے ہیں اور ایک مہمل واقعیت کو حقیقی واقعیت میں بدل دیتے ہیں۔ جب بھی کوئی واقعیت سماج کے اندر سے جنم لیتی ہے تو اس کی ایک خاص شکل و صورت اور حدود ہوتے ہیں اس لئے کہ کوئی بھی تصور سماجی امور میں

غیر جانبدار نہیں ہوتا یعنی کوئی بھی تصور، ذہنی سازوکار بلکہ مادی حقائق کو ان کی حقیقی شکل میں پیش نہیں کرتا بلکہ اس میں دخل و تصرف کرتا ہے اور پھر اسے منظر عام پر پیش کیا جاتا ہے۔

اس نظریہ کے مطابق شناخت بہت اہم ہے۔ شناخت ایک ذہنی مفہوم ہے جس کا تعلق انسان کی خود اپنی اور دوسروں کی شخصیت سے ہے اور انسان کی ذاتی شہرت طلبی اور معرفت سے وابستہ ہے۔ البتہ یہ فہم و شعور اس امر سے بھی متعلق ہے کہ کیا دوسرے لوگ بھی اس کو ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ وہ خود ہے یا نہیں؟ یعنی ایک انسان کی شناخت کے لئے اپنے آپ اور دوسروں کے درمیان ایک حدبندی کی ضرورت ہے یعنی لوگوں میں خصوصی امتیازات کا پایا جانا لازمی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ہم اسی وقت اپنی معرفت حاصل کر سکتے ہیں جب ہمیں معلوم ہو جائے کہ ہم کیا نہیں ہیں یا ہم میں اور دوسروں میں کیا فرق ہے پس معلوم ہوا کہ شناخت کے تعیین میں دوسروں کے مقابلے میں حدود کی تعیین اور اپنے ساتھ دوسروں کی غیریت کو سمجھنا بہت اہم ہے۔

اس نظریہ کے مطابق شناخت کا مسئلہ عینی اور ثابت نہیں ہے بلکہ اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے جو سماج میں اور سماجیات کے ذریعہ وجود میں آتی ہے، پس شناخت کے مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے منیت و غیریت کو سمجھنا اور اس سلسلہ میں معلومات عامہ کو فراہم کرنا بہت اہم ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ایک انسان کی شناخت سماج میں رائج عقائد و نظریات اور توقعات کی دین ہے، لہٰذا شناخت کے مسئلہ میں مادی وسائل و ابزار کی فراہمی کے علاوہ سماجی ذرائع معلومات کو مہیا کرنا بہت ضروری ہے یا یوں کہا جائے کہ افکار و نظریات اور اقدار و افکار بھی ایک انسان کی اپنی شناخت اور منیت میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا بیانات کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی سماج کی معلومات عامہ کیونکر اور کن ذرائع ابلاغ کے ذریعہ وجود میں آتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں یہ کہنا مناسب ہے کہ معلومات عامہ معمولاً اس سماج پر حاکم آئیڈیالوجی کے زیر اثر رہتی ہے یعنی سماج پر حاکم آئیڈیالوجی سماج میں رہنے والوں کی اپنی اور دوسروں کی شناخت بلکہ پوری کائنات اور تاریخ عالم کے متعلق نظریات و عقائد کو جنم دیتی ہے۔ سماج میں رہنے والے لوگوں کی ذہنیت کو بنانے اور ان کے عقائد و افکار کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے والے ذرائع تہذیب و ثقافت سے متعلق ادارے جیسے تعلیمی نظام اور ذرائع ابلاغ و علما اور دانشور حضرات ہوتے ہیں لیکن ان سب میں میڈیا اور ذرائع ابلاغ سب سے زیادہ انسانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

دوریوں کو کم کرنے والی حیرت انگیز ٹکنالوجی کے دور میں سماج کی ذہنیت کو بدلنے میں ذرائع ابلاغ کا اہم کردار ہے جو اپنی طاقت کے بل بوتے پر پورے سماج کی ذہنیت کو بدل سکتا ہے اور معلومات عامہ کو ایک نیا رخ دے سکتا ہے۔ اس کی طاقت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ منٹوں میں ایک معمولی مسئلہ کو سماج میں عام اور اسے زندگی کے سب سے اہم مسئلے کے طور پر پیش کر سکتا ہے اسی طرح ایک اہم اور ضروری مسئلہ کو دائمی یا وقتی طور پر سماج کی ذہنیت سے خارج کر سکتا ہے۔

تاریخی واقعات اور رونما ہونے والے حوادث کی تحلیل اسی وقت میسر ہوتی ہے جب اس واقعہ کو انجام پائے ایک زمانہ ہو چکا ہو اور اس دور کے حالات و شرائط ختم ہو چکے ہوں۔ اس وقت صحیح فیصلہ تک پہنچ سکتے ہیں اور ممکن ہے کسی واقعہ کے بارے میں ایک نئی رائے بھی قائم ہو جائے۔ پس جو سماج مختلف پروپگنڈوں کی زد میں ہو ایسے سماج میں رونما ہونے والے واقعات سے حقیقت کا پردہ اس وقت فاش ہوتا ہے جب ایک زمانہ اور ایک مدت گذر چکی ہو یا وہ حادثہ میڈیا کے قبضہ سے باہر ہو چکا ہو اور اسے فراموش کر دیا گیا ہو اسی وجہ سے بہت بار مشاہدہ ہو چکا ہے کہ بعض سماج کے لوگ تاریخ کے تلخ مسائل جیسے غلامی، ذات پات کا بھید بھاؤ، نسل کشی، سامراجیت اور جنگ و جدال کی جزئیات سے معمولا سالہا سال بلکہ صدیوں کے بعد باخبر ہوتے ہیں۔

اس وقت social constructivism کے نقطہ نظر سے مغربی سماج میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق معلومات کی تحلیل کی جاسکتی ہے اور اس مقالہ کی ابتدا میں پیش کئے گئے سوالوں کے مدلل جواب دیئے جاسکتے ہیں۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ یورپی اور امریکی سماج میں زندگی گذارنے والوں کی معلومات مغربی سماج پر مسلط آئیڈیالوجی یعنی لبرل سرمایہ داری کے سایہ میں پیدا ہوئی ہے، یعنی مغربی سماج میں جینے والوں کے نظریات اور اقدار مسلط آئیڈیالوجی، میڈیا، نظام تعلیم، فرہنگی مراکز، مسلط آئیڈیالوجی کے طرفدار دانشور اور مخصوصا میڈیا کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں، اس کے بعد یہی معلومات مغربی انسان کی شناخت، اس کی ماہیت اور دوست و دشمن کی ماہیت کی تعریف کرتی ہے پس معلوم ہوا کہ مغربی سماج کی رائے عامہ حقیقت میں اسی چیز کو قبول کرتی ہے جسے مسلط آئیڈیالوجی انہیں بتاتی ہے اور انہیں یقین دلاتی ہے۔

مغربی سماج میں رہنے والے لوگ سالہا سال سے میڈیا اور اسی جیسے دیگر ذرائع کے زیر نظر ہیں اسی نے

ان کے ذہنوں میں مسلمانوں کے لئے نفرت عام کی ہے اور انہیں مغربی سماج کا سب سے خطرناک دشمن بتایا ہے۔ مغربی عوام نے اپنی میڈیا کے ذریعہ بے شمار جنگ و جدال، قتل و غارتگری، اغوا اور دہشت گردی کے واقعات میں بظاہر مسلمانوں کو دخیل دیکھا ہے اور اپنی میڈیا پر مسلمانوں کو ایک منفور اور دہشت گرد کی شکل میں پایا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق مغربی سماج میں جینے والوں کی ذہنیت سالہا سال سے بدخواہی اور نفرت پر قائم ہو رہی ہے اور یہ زہریلی تبلیغات نے جو ابھی تک جاری و ساری ہے، مسلمانوں سے متعلق دیرینہ دشمنی اور نفرت کو عقیدہ کی شکل میں بدل دیا ہے یعنی وہ پوری طرح اپنی میڈیا پر یقین رکھتے ہیں اور مسلط آئیڈیالوجی کے دائمی پروپیگنڈے نے انہیں اس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے کہ اب وہ اپنی شناخت کو اسلامی شناخت سے بالکل متضاد گردانتے ہیں۔

مذکورہ بیان کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جس چیز نے مغربی سماج میں اسلام کو منفور اور ایک خطرناک دشمن بنایا ہے حقیقت میں وہ مغربی سماج کے لوگوں میں اس کی شناخت ہے جسے میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ نے جنم دیا ہے۔ اسی طرح بعض متعصب، رجعت پسند، جنگ طلب اور نام نہاد اسلامی تنظیمیں جیسے القاعدہ، طالبان اور داعش نے مغربی میڈیا کو اسلام کے خلاف زہر اگلنے کے لئے مواقع فراہم کئے اور ان لوگوں نے مذکورہ تنظیموں کے پیش کردہ اسلام کو بڑھا چڑھا کر بلکہ انتہائی خطرناک شکل میں پیش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے بلکہ وہ لوگ ایسی ہی باتوں کو بہانہ بنا کر پوری دنیا پر غنڈہ راج قائم کر کے دیگر ممالک کو اپنے سامنے جھکانا چاہتے ہیں اور اپنے اقدامات کی توجیہ بھی کرتے ہیں۔

فلسطین میں اسرائیل ظلم و ستم کر رہا ہے لیکن مغربی سماج میں اس کے خلاف کوئی بھی نفرت انگیز ذہنیت قائم نہیں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ اس طرح کی بربریت اور ظلم و ستم کو مغربی میڈیا عوام کے سامنے پیش نہیں کرتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مغربی میڈیا اسرائیل کو ایک مظلوم حکومت کی صورت میں پیش کرتا ہے جو اپنے دفاع کے لئے دہشت گرد فلسطینیوں سے برسرپیکار ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ صورتحال اسی وقت تبدیل ہو سکتی ہے جب مغربی سماج میں رہنے والوں کی ذہنیت اسلام اور مسلمانوں کے سلسلہ میں بدل دی جائے اور اس کی جگہ واقعی اسلام اور حقیقی مسلمان کی تصویر بٹھا دی جائے، یا ایک دوسری عبارت میں یوں کہا جائے کہ ہر سماج میں مسلط آئیڈیالوجی کے خلاف

ایک محاذ قائم کیا جائے اور ان کی غلط باتوں کے مقابلے میں حقائق کو پیش کیا جائے اگرچہ اس وقت ہم مغربی سماج میں مسلط آئیڈیالوجی کے خلاف مختلف نعروں اور اعتراضوں کو سنتے رہتے ہیں لیکن حاکم آئیڈیالوجی کو دبانے اور اس کا منھ توڑ جواب دینے کے لئے یہ اعتراضات کافی نہیں ہیں اور ان میں مقابلے کے لئے لازمی طاقت و قوت نہیں ہے اور نہ ہی رائے عامہ پر قبضہ کرنے اور انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی ضروری صلاحیتیں موجود ہیں۔

ایسے ماحول میں اسلام مخالف آوازوں اور نعروں سے پریشان ہونے کے بجائے اسے ایک بہترین موقع سمجھتے ہوئے حقیقی اسلام کو عام کیا جائے، اسلام کی غلط تفسیر کو لوگوں کے ذہن سے مٹایا جائے اور اس کے لئے مغربی سماج کے اذہان اور مختلف ذرائع جیسے عالمی تنظیموں اور مسلط آئیڈیالوجی کے مخالفین سے رابطہ اور مغربی سماج میں تہذیبی اور تبلیغی سرگرمیوں کا سہارا لیا جائے، چونکہ اسلام سالہا سال سے مغربی سماج میں میڈیا کے زہریلے پروپگنڈوں کی زد میں رہا ہے اور ایک عرصہ سے مغربی لوگوں کو اسلام سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے لہٰذا رائے عامہ سے غلط باتوں کے خاتمے اور اسلام کی فطری اور حقیقی صورت پیش کرنے کے لئے عالمی پیمانہ پر مختلف معاشروں اور قوم وملت سے رابطہ برقرار کرنا ہوگا اور یہ مشورہ اسی وقت کارگر ہوگا جب اسلام کی عام المنفعت سیاست اور کھلی ذہنیت کا سہارا لیا جائے ، اسی سلسلہ کی ایک زبردست کڑی آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای دامت برکاتہ کا وہ مشہور خط ہے جسے آپ نے مغربی جوانوں کے ذہنوں سے اسلام کی غلط تفسیر کو مٹانے کے لئے لکھا تھا تاکہ اس سیاست کو مہمیز کیا جاسکے اور مغربی میڈیا کی زہریلی تبلیغات کا توڑ پیش کیا جاسکے۔

دنیا پر غالب نظام حکومت کی خود ساختہ اسلام دشمنی

مولف: ہادی آجیلی
مترجم: منہال حسین خیرآبادی

علم سیاست کی رو سے دیکھا جائے تو اصطلاح میں "گفتگو" کا مطلب ہے: بیانات، خیالات اور مفاہیم کا ایک ایسا مجموعہ جن کے درمیان ایک منطقی رابطہ پایا جاتا ہے اور اسی رابطہ کی بنیاد پر اسے مستقل اور نئی شناخت ملتی ہے جو آخرکار دنیا سے متعلق ہمارے تصورات اور عقائد و نظریات کے وجود میں آنے کا سبب بنتے ہیں۔

جدید نظریات گفتگو کو ایک سماج پر مسلط آئیڈیالوجی کی جگہ کھڑا کرتے ہیں اور اسے ایک مستقل مکتب فکر کی صلاحیت و قابلیت عطا کرتے ہیں یعنی جب بھی کوئی گفتگو اور گفتمان کسی سماج پر حاکم ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ضرور ایک مخصوص مکتب فکر ہوتا ہے جس کے ذریعہ اس کی تعریف ہوتی ہے اور اس کے حدود معین کئے جاتے ہیں۔

جب بھی کوئی مکتب فکر کسی سماج پر اپنا قبضہ جمانا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اسے اپنے رقیب آئیڈیالوجی کو مغلوب کرنا اور راستے سے ہٹانا پڑتا ہے، اس کے بعد اسے ممتاز حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ایک نئی آئیڈیالوجی کو یہ مقام و منزلت اس وقت نصیب ہوتی ہے جب مطلوبہ سماج خود بھی اس نئی آئیڈیالوجی کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائے یعنی آئیڈیالوجی کے بنیادی تصورات اور خیالات سماج کی رگوں کے اندر نفوذ کر جائیں، لہٰذا اگر کوئی سماج کسی آئیڈیالوجی کو قبول نہ کرے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ آئیڈیالوجی ابھی تک ناقص ہے اور قدرت نمائی کے مرحلہ تک نہیں پہنچی ہے۔ کوئی بھی نئی گفتگو دو طریقوں سے غلبہ حاصل کرتی ہے: سلبی اور ایجابی۔ سلبی طریقہ میں سب سے پہلے عدمیات کی بحث سامنے آتی ہے یعنی سماج میں کیا نہیں ہے۔ اس مرحلہ میں وہ مسلسل عدمیات کو شمار کرتی ہے، گویا وہ عدمیات کی مرہون منت ہے اس لئے کہ جب بھی کوئی نئی آئیڈیالوجی وجود میں آتی ہے اور عدمیات کی بحث کو چھیڑتی ہے تو اس بحث کے

آغاز ہوتے ہی اس کا وجود مسلّم الثبوت ہو جاتا ہے۔

اس بات کو اگر ایک نئی عبارت میں پیش کیا جائے تو یہ کہنا بہتر ہوگا کہ آئیڈیالوجی اپنی شناخت کو معین و مشخص کرنے کے لئے دیگر رقیب آئیڈیالوجی کے مقابلے میں اپنی غیریت اور اپنی ایک مستقل شناخت کو معین کرنے کی راہ میں قدم اٹھاتی ہے۔ اس نئی شناخت کو معین اور مشخص کرنے کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ اس علم کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر کسی آئیڈیالوجی کو رقیب آئیڈیالوجی کے مقابلہ میں غیریت حاصل نہ ہو سکے اور اس کے حدود معین نہ ہو سکیں تو اس کے لئے جعلی غیریت کو معین و مشخص کرنا ضروری ہے یعنی ایک دشمن کے وجود کی برکت سے ایک گفتگو کے جملہ ارکان ایک محور پر قائم ہو جاتے ہیں لہٰذا ہر مکتب فکر یا آئیڈیالوجی کے لئے واجب ہے کہ وہ اپنے برابر کا ایک دشمن سراغ لگائے جس کی مدد سے وہ اپنی شناخت کو معین و مشخص کر سکے۔ اگر کسی آئیڈیالوجی کا دشمن اس کے قد سے چھوٹا ہو تو اسے چاہئیے کہ اپنے دشمن کو بڑا اور اپنے برابر میں پیش کرے تاکہ اسے اعلی مقام اور رتبہ مل سکے جیسا کہ امریکہ کے لئے صدام جیسا دشمن کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا اور یقیناً امریکہ جیسی عظیم حکومت کے لئے صدام کا قد بہت چھوٹا تھا لیکن امریکیوں نے صدام کو عالمی پیمانہ پر ایک عظیم دشمن کی شکل میں پیش کیا اور پوری دنیا کو اس کے مقابلے کے لئے کھڑا کر دیا۔

مذکورہ سلبی اقدامات کے بعد اب دوسرا مرحلہ ایجاب و قبول سے شروع ہوتا ہے جس میں ایک آئیڈیالوجی کے مفاہیم کی تبلیغ کا موقع فراہم ہوتا ہے اس لئے کہ کسی بھی آئیڈیالوجی کے مقام و مرتبہ کو ثابت کرنے کے لئے ہمیشہ سلبی اقدامات ایجابی اقدامات پر مقدم ہوتے ہیں البتہ اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے کہ اگرچہ رقیب آئیڈیالوجی کو معین کرنا اپنی شناخت کا باعث ہوتا ہے لیکن بعض اوقات معکوس نتیجہ بھی ظاہر ہو سکتا ہے، اس لئے کہ جہاں ایک طرف آئیڈیالوجی کی ماہیت مشخص ہوتی ہے وہیں دوسری طرف جب کوئی آئیڈیالوجی اپنے غیر کو رقیب کی نظر سے دیکھتی ہے تو گویا وہ اسے بزرگی اور برابری کا درجہ دیتی ہے اور ناخواستہ طور پر اسے اپنی جانشین اور ایک بدیل بنا بیٹھتی ہے، یعنی یہ امکان پایا جاتا ہے کہ ایک غالب اور مسلط آئیڈیالوجی کی ضعف و ناتوانی کی بناپر اس کے ماتحت مناطق اس کے رقیب کی جانب جھک جائیں اسی وجہ سے یہ کہنا بجا ہے کہ شناخت کو مستقل کرنا اور غیریت پر زور دینا کبھی کبھی خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے گویا اس کی مثال دو دھاری تلوار کی مانند ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں عالمی پیمانہ پر مسلط مغربی آئیڈیالوجی نے اسلام کو اپنا رقیب مان لیا

ہے ؟اس سوال کے جواب میں یہ کہنا مناسب ہے کہ ۱۹۷۹ء میں ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد امریکہ کے منافع کو دو زاویوں سے سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا۔اس عظیم واقعہ کے بعد سیاست کے میدان میں امریکہ کے ماتحت مناطق بکھر گئے اور ایران میں ایک ایسی حکومت نے جنم لیا جو امریکہ کے جبری اور مسلط نظام کے مقابلے میں قیام کاارادہ رکھتی تھی اس لئے کہ اسلامی جمہوریہ ایران نے عالمی پیمانہ پر دو قطبی نظام کو للکارا تھا اور اس کی وجود کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس نے مغربی طاقت امریکہ اور مشرقی طاقت روس سے منھ موڑ کر ایک مستقل راستہ اپنایا تھا۔ ایران کا یہ جسورانہ اقدام مستقبل میں ایشیا جیسے غنی اور ثروتمند خطے میں نہایت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

انقلاب اسلامی ایران کے قیام کے بعد مشرقی اور مغربی طاقتوں کو اس کے وجود سے جو خطرہ لاحق تھا اس سے کہیں زیادہ خطرہ اسلامی انقلاب کی آئیڈیالوجی سے تھا جس نے پوری دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا یعنی جب دنیا والے دو قطبی نظام میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے آزاد خیال اور اشتراکی پارٹیوں کے ٹھیکیداروں یعنی امریکہ اور روس کا سہارا لینا چاہتے تھے اور ہر ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے میں کوشاں تھے، ایسے حالات میں جب کہ مغربی دانشوروں نے دین کو معطل، بے اثر اور اسے اپنا بازیچہ و کھلونا بنا رکھا تھا اور دین و سیاست کی جدائی کا مسئلہ عالمی پیمانہ پر تسلیم شدہ قرار دے دیا گیا تھا، میشل فوکو کے بقول ایک الٰہی انقلاب وجود میں آیا جس نے مغربی فکر کو تہہ و بالا کر دیا اور اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا اس لئے کہ اسلامی انقلاب کے ذریعہ قائم ہونے والا نظام ایک ایسی حکومت کا خواہاں تھا جو اسلامی احکام پر قائم ہو اور عالمی ستمکاروں کے مقابلے میں ڈٹا رہے، اس کا نعرہ تھا نہ مغرب، نہ مشرق بلکہ فقط اسلامی جمہوریت۔

ہم یہاں پر اس بات کو ہر گز فراموش نہیں کر سکتے کہ مغربی آئیڈیالوجی کو انقلاب اسلامی کے ذریعہ جو نقصان اٹھانا پڑا ہے وہ اشتراکی آئیڈیالوجی کے ذریعہ اٹھائے گئے نقصانات سے کہیں زیادہ ہے اور ان دونوں کا ہر گز ایک دوسرے سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ کمیونزم الحاد اور مادیت کے اعتبار سے لبرل ازم سے بہت مشابہ ہے لیکن اسلام نے سیاست کے میدان میں دین کو دوبارہ پیش کرنے اور اسلامی تعلیمات کے سہارے حکومت کرنے کے فرضیہ کو ثابت کرکے مغربی آئیڈیالوجی یعنی دین و سیاست کی جدائی اور مادیت کے خلاف محاذ قائم کر دیا۔ موجودہ رائج اور مسلط آئیڈیالوجی اس خیال میں تھی کہ عالمی پیمانہ پر دین و سیاست کی جدائی کو مان لیا گیا ہے اور اسے ایک تسلیم شدہ امر قرار دے دیا گیا ہے لیکن بیسویں صدی میں اسلامی

انقلاب نے ان کے خواب و خیال پر پانی پھیر دیا اور ایک ایسی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کی بنیاد دین و سیاست کی یکجہتی پر قائم تھی۔ اس طرح وہ مغربی آئیڈیالوجی کو روندتے ہوئے دین کے اصول و مبانی کے سہارے ایک مستقل آئیڈیالوجی کو قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا، اسی وجہ سے مغربی آئیڈیالوجی کو اپنے وجود کے متعلق خطرہ محسوس ہونے لگا اور ان کا یہ احساس بجا بھی تھا، اسی خطرہ کے احساس کے بعد انہوں نے اسلامی آئیڈیالوجی اور مکتب فکر کو اپنا رقیب مان لیا اور اسے اپنے وجود کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھنے لگے۔ اسی خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے انہوں نے بہت پہلے سے اس کے خلاف پروپگنڈے اور زہر افشانی شروع کر دی تھی اور اس وقت بھی بہت زور و شور سے جاری ہے۔

ہمیں اس نکتہ کو سمجھنا ضروری ہے کہ اس وقت مغربی سماج میں بعض ایسے مشکل مسائل پیش آ گئے ہیں جن کے جوابات اسلامی مباحث میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ انہیں مشکل مسائل میں سے ایک مسئلہ شناخت کی گمشدگی ہے جو دوسری عالمی جنگ یا اس کے بعد وجود میں آیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور عصر نو کے تمدن کی ایک سیاہ تاریخ رقم ہو گئی۔ اس عظیم تباہی کے بعد مغربی انسان عصر نو کی جدیدیت اور اپنی شناخت کی تعریف کرنے میں مردد ہو گیا یہاں تک کہ انسانوں کا ایک عظیم گروہ جو عدمیت اور جدیدیت کا نقاد بنا حقیقت میں وہ جدیدیت کو تمام مصائب و آلام کی بنیاد سمجھنے لگا تھا اور اسی تردد میں وہ عدمیت کا شکار ہو گیا۔

اس عظیم جنگ کے خاتمہ کے بعد حاکم نظام یعنی سرمایہ داری اور اس کے بھید بھاؤ اور بے عدالتی کے خلاف بغاوت اور اعتراضات کا بازار رونق پا گیا اور اگر امریکہ نے یورپ کے اقتصاد کی فرسودہ کشتی کو مارشل منصوبہ کے ذریعہ کنٹرول نہ کیا ہوتا اور اس میں جان نہ ڈالی ہوتی تو یہ اندیشہ پیدا ہو چکا تھا کہ یورپی سماج لیبرل نظام کے خلاف قیام کے باعث سویت یونین کے حملہ کے بغیر کمیونسٹ ہو جائے گا۔ اس کی سب سے واضح اور زندہ مثال یورپین ممالک میں موجود کمیونسٹ پارٹیاں ہیں جو اس وقت فرانس اور اٹلی میں طاقتور مکتب فکر کی حیثیت سے موجود ہیں۔ مغربی سماج میں شناخت کا بحران مختلف شعبہ ہائے حیات میں جیسے آرٹ، موسیقی، سینما، ادبیات اور لباس پوشی کے نئے رنگ و ڈھنگ میں ظاہر ہو چکا ہے اور اس وقت جدیدیت اور اس کے مظاہر کے خلاف یورپ میں ہر طرف سے زبردست حملے ہو رہے ہیں اور اسے زبردست مسائل و مشکلات کا سامنا ہے۔

موجودہ دور میں مغربی سماج کی سب سے بڑی مشکل معنویت کا نہ ہونا ہے۔ اس وقت مغربی سماج میں بے دینی اور دین سے دوری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ وہاں لوگ خود بخود اپنی فطری احساسات کی بناپر معنویت اور دینداری کی طرف مایل ہورہے ہیں۔ مغربی سماج میں معنویت کی طرف بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے اور لوگوں کے درمیان شناخت کے بحران کو کم کرنے کے لئے من گھڑت اور جعلی معنویت جیسے امریکہ کے اصلی باشندوں کا عرفان، شیطانی عرفان، یاشینتو، اوشو، اکنکار، زِن، کابالا وغیرہ کو مختلف شکل و صورت میں پیش کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ عرفان کی مذکورہ تمام جعلی صورتیں جسے مسلط آئیڈیالوجی نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ سب کے سب ماہیت کے اعتبار سے فرد گرا ہیں اور ان میں کسی بھی طرح سے سیاسی اور اجتماعی پہلو نہیں پایا جاتا۔

شاید یہ بات کہنا بجا ہو کہ معنی کا بحران مغربی سماج کی تمام مشکلات جیسے شناخت کا بحران، بحران معنویت اور گھرانوں کی تباہی و بربادی سے کہیں زیادہ سخت ہے اس لئے کہ آج کا مغربی انسان معنی کی تعیین اور زندگی کے ہدف کو سمجھنے سے بالکل عاجز نظر آرہا ہے اور جدیدیت کے دانشمندوں کے پاس اس مشکل کے لئے کوئی راہ حل اور جواب نہیں ہے، مخصوصا جدیدیت کو مترقی سمجھنے والے بنیادی طور پر عدمیت کے قائل ہیں اور کسی بھی فکر و نظر کو قابل بھروسہ نہیں سمجھتے اسی وجہ سے آج کا مغربی انسان شدت سے ایک زبردست پشت پناہ کی تلاش اور اپنی شناخت کی تعریف اور اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھنے کی تگ ودو میں منہمک ہے اور کبھی کبھی شناخت اور زندگی کے معنی کو سمجھنے لئے مجبور ہو کر جھوٹی شناخت جیسے کسی موسیقی گروپ کی حمایت کی طرف رخ کرتا ہے اور ان سے اپنے احساسات کو جوڑ کو اس احساس کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اس وقت پورے عالم میں موجود تمام ادیان ومکاتب کے درمیان اگر کوئی دین موجودہ انسان کے سوالوں کا جواب دے سکتا ہے اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے تو وہ دین اسلام ہے، اس لئے کہ دیگر ادیان جیسے عیسائیت، یہودیت، بودیسم اور کنفوسیوسیسم ہر گز ظلم و ستم اور موجودہ صورت حال کے خلاف قدم اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے اور وہ ہر گز اپنے ماننے والوں کے لئے بے عدالتی کے خلاف قیام اور غلامی کی زنجیروں سے رہائی کے لئے کوئی نمونہ عمل پیش نہیں کرسکتے، لیکن اسلام ایک سماجی اور کمال یافتہ دین ہونے کی بناپر ظلم و ستم کے خلاف جہاد اور عدالت طلبی کے لئے قیام کا طور طریقہ یورپین سماج مخصوصا مہاجروں اور دیگر اقوام و ملل کے لئے پیش کرسکتا ہے جو اپنی حکومتوں کے ناروا سلوک کا شکار ہیں اور اس

طرح انہیں شناخت، معنویت اور با مقصد زندگی جینے کا طریقہ سکھا سکتا ہے۔

پس اگر یورپی سماج کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ آسانی سے اسلام کے ذریعہ اپنی تمام مشکلات کا حل اور سوالوں کا جواب حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی سب سے زندہ مثال اس وقت یورپی سماج میں اسلام کی طرف بڑھتا ہوا میلان ہے اور یہ میلان اس قدر شدید ہے کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھ کر آج یورپین ممالک تشویش میں مبتلا ہو گئے ہیں، اسی تحریک کو روکنے کے لئے انہوں نے عالمی پیمانہ پر اسلام کے خلاف زہریلی تبلیغات کا سلسلہ شروع کر دیا اور ہر طرف اسلام کے خلاف پروپگنڈے میں مشغول ہو گئے، اس لئے کہ وہ اپنے سماج کو اسلامی تعلیمات اور اس کی جذابیت کی زد میں مشاہدہ کر رہے ہیں اور ان کی آئیڈیالوجی نابودی کے خطرہ سے نزدیک ہو چکی ہے۔

ایک دوسری عبارت میں یوں کہنا مناسب ہے کہ اس وقت اسلام کی ترقی اور اس ترقی سے موجودہ آئیڈیالوجی کو لاحق خطرہ سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے یورپی سماج کے سربراہوں کے پاس دنیا والوں کے سامنے اسلام کا خوفناک چہرہ اور تحریف شدہ اسلام پیش کرنے اور مسلمانوں کو دہشت گرد بتانے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے، اس لئے کہ انہیں خوب معلوم ہے کہ اگر انہوں نے اسلام سے مقابلہ میں معمولی سی کوتاہی بھی کی تو یہ تحریک پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

البتہ موجودہ آئیڈیالوجی کی جانب سے ایسے تحقیر آمیز حربے استعمال کرنا، نفرت و خوف کا بازار گرم کرنا اور تحریفات کا سہارا لینا کوئی نئی بات نہیں ہے اور تاریخ میں اس کی مثالیں کم نہیں ہیں یا یوں کہا جائے کہ اسلام سے متعلق تحریفات کی کہانی صرف اسلام سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کی دیگر مثالیں بھی موجود ہیں اس لئے کہ غالب فکر اور مسلط آئیڈیالوجی اپنی حیات کو باقی رکھنے کے لئے مجبور ہے کہ وہ کسی غیر کو تلاش کرے اور اس کے مقابلے میں اپنی حیثیت کو مستقل بنائے۔ اس واقعیت کی ایک زندہ مثال دوسری عالمی جنگ کے دوران فاشیزم اور نازی ازم کے درمیان دیکھنے کو ملتی ہے جو اپنی بقا کے لئے غیریت اور استقلال کی تلاش میں ہیں۔ جرمنی کے خلاف پروپیگنڈے اس قدر شدید تھے کہ ٹوٹی ہوئی صلیب شیطان کی نشانی سمجھی جانے لگی تھی اور کسی کو گرفتار کرنے، اسے شکنجہ کرنے اور اسکے خلاف مقدمہ چلانے کے لئے اس پر فاشیست کی تہمت لگانا کافی تھی۔

فاشیزم کے خاتمہ اور دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر کمیونیزم کے مقابلے میں لیبرل سرمایہ داری نے

قیام کیا اور مشرقی طاقت روس کی کمیونسٹ حکومت اور اس کے تحت الحمایہ حکومتوں کے خلاف سخت پروپیگنڈے میں مشغول ہوگئے، اسی زہریلی تبلیغات کے سایہ میں امریکہ نے عالمی فضا کو دو حصوں میں تقسیم کردیا ایک حصہ کو لیبرل سرمایہ داری کا نام دیا اور دوسرے کو کمیونزم کا نام دیا اور کمیونسٹی فکر اور اس کے حامیوں کو دنیا کی تمام مصیبتوں اور بلاؤں کا سرچشمہ قرار دیا۔ رونالڈ ریگن کی جانب سے اسے شیطانی شہنشاہیت کا لقب دیا گیا۔ امریکہ نے کمیونزم سے مقابلہ کے لئے مک کارٹیسم کو جاری کیا اور کمیونسٹ ہونے یا روس سے رابطہ رکھنے کو سخت جرم قرار دیا اور اس کے لئے جیل کی سزا مقرر کردی گئی، اسی طرح کمیونزم کی ترقی کو روکنے کے بہانے دنیا کے مختلف ممالک میں بغاوت اور فوجی مداخلت کا راستہ ہموار کیا جانے لگا اور امریکہ نے اسے اپنا ہتھکنڈہ بناتے ہوئے بہت سے ملکوں میں مداخلت کی اور وہاں پر بغاوت کے راستے ہموار کئے۔

سرد جنگ کے خاتمہ اور سویت یونین کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کے بعد اب لیبرل سرمایہ داری کا کوئی رقیب نہیں تھا، پس ایک بار پھر اسے ایک رقیب کی ضرورت کا احساس ہوا لہٰذا اس نے اس کردار کو نبھانے کے لئے سیاسی اسلام کا انتخاب کیا البتہ سیاسی اسلام کے مظاہر جیسے اسلامی جمہوریہ ایران یا القاعدہ تنظیم مسلط آئیڈیالوجی کے لئے چھوٹے تھے لہٰذا اسے اپنے ہدف تک پہنچنے کے لئے اس دشمن کو عظیم دکھانا اور دنیا والوں کے سامنے اسے عالمی دشمن کی حیثیت سے پیش کرنا بہت ضروری تھا، پس اس نے اس منحوس منصوبے کو ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کے واقعہ کے ذریعہ عملی بنایا۔

اس حادثہ کی مدد سے سیاسی اسلام کی گفتگو مسلط آئیڈیالوجی کے قد و قامت کے برابر نظر آنے لگی۔ اس طرح سیاسی اسلام اور دہشت گردی کے درمیان رابطہ جوڑا گیا اور دہشت گردی، فاشیزم اور کمیونزم کے بعد مسلط آئیڈیالوجی کا مد مقابل اور ایک بہترین رقیب ابھر کر سامنے آیا جسے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ پس اس سوال کا جواب کہ کیوں پرانی طرز کی زہر افشانی اور خوف و ہراس کا ماحول اس وقت بہت تیزی سے اسلام کے خلاف بروئے کار لایا جارہا ہے اور غیر معمولی طور پر مسلمانوں کو اس کا نشانہ بنایا جارہا ہے، ہمیں مسلط آئیڈیالوجی کی بقا اور غلبہ کو برقرار رکھنے کے لئے ایک رقیب کی تلاش اور اسے اپنا مد مقابل بنا کر دنیا والوں کے سامنے پیش کرنے میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

جدید مغربی تہذیب کے کارنامے اور دیگر ثقافتوں سے اس کا تعلق

مولف: سید حسین شہرستانی
مترجم: منہال حسین خیرآبادی

اس مختصر مقالہ میں جدید مغربی تہذیب کی تاریخ میں رونما ہونے والے نمایاں واقعات اور دیگر اقوام و ملل اور ثقافتوں کے ساتھ ان کے سلوک کو بیان کیا گیا ہے۔

یہ ایک ایسی تاریخ ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مغربی مورخین اپنی گذشتہ تاریخ پر سرسری نظر ڈالتے ہیں تو رنجیدہ کیوں ہو جاتے ہیں، وہ تاریخ جو اس نکتہ کو بخوبی بیان کرتی ہے کہ کیا دیگر تہذیبیں مخصوصاً اسلامی تہذیب مغربی تہذیب کی قرضدار اور اس کی احسان مند ہیں؟ یا یہ فقط مغربی دنیا ہے جس کے دوش پر سیکڑوں چھوٹے بڑے جرائم اور جنگوں کا بوجھ ہے اور بدلہ چکانے کے بجائے وہ خود مدعی بنے بیٹھے ہیں؟

البتہ کسی بھی فیصلہ سے پہلے اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ تاریخ کی یہ تہمت تقریباً ہر قوم و ملت پر صادق آتی ہے اور کوئی بھی قوم ایسی نہیں ہے جس کا دامن ہر قسم کی برائی اور گندگی سے پاک ہو لیکن جب مغربی میڈیا کی دھاندلی اور سینہ زوری دیکھی جاتی ہے کہ اپنے گلے میں جھانکنے کے بدلے وہ دنیا کی ایک معکوس تصویر پیش کرنا چاہتے ہیں اور اسلام کے مقابلے میں مغربی تہذیب کو حق بجانب ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ مغربی تہذیب کے دوسرے نامحسوس اور خفیہ پہلوؤں کے چہرہ سے پردہ اٹھایا جائے اور اس کی جانچ پڑتال کی جائے۔

بے شک اگر اس مسئلہ کو تاریخی زاویہ نظر سے تطبیقی طور پر موجودہ مغربی میڈیا اور ان کی تہذیب میں اسلام کے خلاف زہر افشانیوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ پیش کیا جائے تو بہت بہتر اور ثمر بخش ہوگا۔

مغربی تہذیب کے ٹھیکیداروں کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیاوالوں کو جمہوریت جیسا انمول تحفہ پیش کریں گے

اور انہیں ان کی ظالمانہ و جابرانہ حکمرانوں سے نجات دلائیں گے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اس انمول تحفہ کی مدد سے دنیا کو مذہبی تشدد اور قومی وفکری تعصّبات سے دور کریں گے اور جہاں بھی رہیں گے اور جس سرزمین کے سفیر بنیں گے وہاں تحفظ و سلامتی اور رحم و مروت کا بہترین ہدیہ اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ وہ لوگ دنیا والوں اور حکومتوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے عوام کی فردی اور اجتماعی آزادی کو کسی بھی قیمت پر ضائع نہ ہونے دیں۔ وہ لوگ عوام کے ذہنوں میں یہ بات بٹھادینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی حکومتوں سے شہری حقوق کا مطالبہ کریں۔ دہشت گردی اور قتل و غارت گری کے خلاف جنگ میں وہ لوگ دنیاوالوں کے سامنے اپنے آپ کو کمانڈر اور سردار کی صورت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے اس ہدف کی تکمیل کے لئے کئی بڑی جنگیں شروع کیں۔ وہ لوگ اپنے آپ کو نسل یہود کا بہت بڑا مدافع سمجھتے ہیں اور اس گمان باطل میں مبتلا ہیں کہ انہوں نے یہود ستیزی کے خلاف محاذ قائم کرکے انسانیت کے حقوق کو ادا کردیا ہے۔

اسی طرح یہ گمان بھی پایا جاتا ہے کہ مغرب نے ٹکنالوجی کی دنیا میں ہنر نمائی کے ذریعہ پوری انسانیت کی کامیابی کا راستہ فراہم کیا ہے لہٰذا دنیا کی تمام قوموں پر واجب ہے کہ وہ اقتصادی ترقی و خوشحالی کے لئے مغربی ممالک کی پیروی کریں۔

یہ مغربی حکمرانوں اور سربراہوں کے تفکرات اور جملے ہیں جسے وہ دنیا کی اقوام و ملل اور حکومتوں سے آمرانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ موجودہ نوشتہ اس حقیقت سے پردہ گشائی کرے گا کہ تاریخ ایسی باتوں اور دعووں کے مقابلے میں کیا کہتی ہے اور ان کے نظریات کے مقابلے میں تاریخ کا فیصلہ اور موقف کیا ہے۔

مذہبی جنگیں

مغربی تاریخ نو مذہب کے نام پر عظیم خونریز جنگوں سے شروع ہوئی جو عیسائیت کی نئی شاخ پروٹسنٹ اور کیتھولیک کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ یہ وہ جنگیں تھیں جو مذہبی تعصب اور انتہاپسندی کی سب سے واضح و روشن مصداق ہیں اور ایسی مثال عالم اسلام میں ہرگز دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یہ تیس سالہ جنگیں ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کی موت کا باعث ہوئیں جن میں بھوک اور پیاس سے مرنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہاں پر ان جنگوں کے نقصانات کو تفصیل سے بیان نہیں کیا جاسکتا بلکہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ محض اندازہ

و گمان اور ایک تخمینہ ہے۔ اس خسارہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۶۱۸ میں جنگ سے پہلے جرمنی کی کل آبادی دو کروڑ دس لاکھ تھی لیکن جنگ کے خاتمہ کے بعد ۱۶۴۸ء میں یہ آبادی گھٹ کر ایک کروڑ تیس لاکھ ہو گئی تھی۔

اگر ہم تھوڑا پیچھے جائیں تو ویران کن اور تباہ کن صلیبی جنگوں کا سیاہ کارنامہ جدید مغربی تہذیب کے دامن پر صاف دکھائی پڑے گا جسے مغربی حکمرانوں نے مذہبی تعصب کے نام پر شروع کیا تھا۔ اگر انصاف کی نظر سے اس جنگ کا مطالعہ کیا جائے اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے سلوک و رواداری کو ملاحظہ کیا جائے تو یقیناً مغربی تاریخ اسلام کے مقابلے میں بہت شرمندہ ہوگی۔ قرون وسطیٰ کی دو عظیم جنگوں نے عیسائیت کے چہرے کو غیر انسانی و غیر عقلانی اور حد سے زیادہ مخدوش بنادیا ہے جب کہ اس کے پیغمبر حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام تھے جو اخلاق و کردار، رحم و مروت اور عشق و محبت کے پیغمبر تھے۔

سامراجیت

مغربی تہذیب قرون وسطیٰ سے ہوتی ہوئی عصر حاضر تک کا صعوبت بار سفر طے کرتی ہوئی آئی ہے۔ اس سفر میں اس نے ایسی حکومتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جو عیسائیت اور مذہبی حکومتوں کے مقابلے میں قائم ہوئیں۔ اس دور میں جو تبدیلیاں وجود میں آئیں اور دنیا نے جس انقلاب کو دیکھا اس کی زد میں جہاں سیاست تبدیل ہوئی وہیں فن، ادب، فلسفہ اور حقوق جیسے مفاہیم بھی تبدیل ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یورپ میں اس تبدیلی کو دنیاپرستی سے تعبیر کیا گیا یعنی اس دور میں دینی امور کو دنیوی امور سے جدا کر دیا گیا اور دین و دنیا کی جدائی کی بنیاد ڈالی گئی گویا دین کو دنیاداری کی راہ میں رکاوٹ قرار دیتے ہوئے اسے متروک قرار دے دیا گیا لیکن افسوس یہ ہے کہ دیندار حکومتوں کے خاتمہ اور تہذیب نو کے قائم ہونے کے بعد نہ صرف قتل و غارت گری اور تعصّبات و ہٹ دھرمی میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ بشری تاریخ کی خونخوار ادوار سے زیادہ اس دور میں انسانیت نے قتل و غارتگری اور تباہی و بربادی کو دیکھا، مخصوصا اس دور کی عظیم تباہی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؛ ایک: دیگر ممالک اور سرزمینوں کو فتح کرنے کے لئے یورپ کی لشکر کشی اور قتل و غارت گری اور دوسری یورپین ممالک کے درمیان آپسی خانہ جنگی اور تباہی و بربادی۔

سامراجیت کے حملات چار سو سال تک جاری رہے اور اس میں ایسی خونریزیاں، قتل عام اور تباہی و

بربادی ہوئی جس کے سامنے چنگیز، آتیلا اور سکندر جیسے بادشاہوں کے دامن خالی نظر آنے لگے۔ امریکہ کی کھوج جہاں ایک عظیم تمدن قائم تھا اور وہاں کے باشندے متمدن سمجھے جاتے تھے، سامراجیت کے جرائم کی ایک مستقل تاریخ ہے جب کہ یورپی سامراج نے اسے امریکہ کی کھوج کا نام دیا اور دنیا والوں کے ذہنوں میں یہ بٹھانے کی کوشش کی کہ یہ سرزمین انسانوں کے وجود سے خالی تھی تاکہ وہ اس سرزمین کے اصلی باشندوں کے قتل عام پر پردہ ڈال سکیں۔ اہل یورپ نے اس سرزمین کی طرف ہجرت کی اور وہاں کے ۹۰ یا ۹۵ فیصد باشندوں کو قتل کرکے اپنے مستقل قیام کے لئے راہ ہموار کی۔ یہ قتل عام اس قدر وسیع پیمانہ پر انجام دیا گیا تھا جو آبادی اس ہجوم سے پہلے سات کروڑ یا نو کروڑ تھی وہ ایک صدی تک قتل عام کے بعد صرف اور صرف ساڑھے تین کروڑ باقی بچی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک منظّم سازش کے تحت وسیع پیمانہ پر چھ کروڑ ساٹھ لاکھ امریکہ کے اصلی باشندوں کا قتل عام ہوا، یہ تعداد ان اسی لاکھ یا ایک کروڑ تیس لاکھ مرنے والوں کے علاوہ ہے جو پچاس سال تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے مختلف کانوں میں کام کرتے رہے۔

آسٹریلیا میں جب ۱۷۸۸ء میں انگلینڈ کی حکومت قائم ہوئی تو اس وقت سے ۱۹۱۱ء تک یہاں کی آبادی ۷۵۰ ہزار باشندوں سے گھٹ کر صرف اور صرف ۳۰ ہزار افراد تک باقی بچی تھی، اس لئے کہ ۱۸۲۹ء میں آسٹریلیا کے قید خانوں سے سزا یافتہ مجرموں کو اس لئے آزاد کیا جاتا تھا تاکہ وہ اس سرزمین کے اصلی باشندوں کا شکار کریں اور انہیں ہر باشندے کے قتل پر ۵ ڈالر دئے جاتے تھے۔ اسی طرح جب انگلینڈ نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو صرف بنگال صوبہ میں تقریباً ایک کروڑ لوگ بھوک، پیاس، بیماری اور انگلینڈ حکومت کے سپاہیوں کی جانب سے طاقت فرسا کاموں کو انجام دینے کی بنا پر اپنی جانوں کو کھو بیٹھے تھے، نیز ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء کے درمیان ساڑھے تین کروڑ سے پانچ کروڑ کے درمیان ہندوستانی قحطی اور خشکسالی سے مرے ہیں۔

ہولینڈ حکومت کے ہاتھوں انڈونیشیا کے باشندوں کا قتل عام، اہل یورپ کے ہاتھوں لاکھوں افریقی باشندوں کا قتل عام مخصوصاً کانگو پر قبضہ کرنے کے لئے بلجیم کے ذریعہ ہزاروں کی تعداد میں وہاں کے باشندوں کا قتل عام یا فرانس کا شمالی افریقہ جیسے مغرب، تونس، الجیریا وغیرہ پر حملہ اور اس میں لاکھوں انسانوں کا قتل عام۔ اسی طرح فیلیپین، کیوبا، میکسیکو اور ہاوائی میں انیسویں صدی کے آس پاس امریکی حکومت کے ہاتھوں وہاں کے باشندوں کا قتل عام مغربی سامراجیت کی تاریخ کا ایک شرمناک کارنامہ ہے۔

غلامی

مغربی سامراجیت کی تاریخ کا دوسرا المناک واقعہ غلامی کی زنجیر ہے جسے انہوں نے اپنے علاوہ ہر شخص کو پہنانے کی کوشش کی۔ جب غلامی اور بردہ داری یورپ سے امریکہ منتقل ہوئی تو وہاں اس غم انگیز داستان نے ایسا المناک موڑ لیا کہ پوری تاریخ انسانیت چیخ پڑی اور حقوق انسانی کی بربادی کا سب سے بڑا کھیل کھیلا گیا۔ ہارواڑڈ یونیورسٹی نے ۱۹۹۹ء میں ایک تحقیق کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ گذشتہ صدیوں میں ۲۷۲۳۳ بحری سفر غلاموں کو جابجا کرنے کے لئے انجام دیئے گئے ہیں۔ ۱۵۱۹ سے ۱۸۶۷ء تک تقریبا ۱۱۰۶۳۰۰۰ افریقی غلام بنا کر یورپین ممالک بھیجے گئے۔ مذکورہ سفر کے اعداد و ارقام میں ۵۵ فیصد سفر ۱۷۰۰ سے ۱۷۹۹ء کے درمیان ۲۹/۵ فیصد ۱۸۰۰ سے ۱۸۴۹ء کے درمیان اور ۳۰ فیصد غلاموں کی تجارت پر پابندی کے بعد انجام دئے گئے۔

سفر کے دوران غلاموں کو درپیش جانی نقصانات ۳۰ سے ۴۰ فیصد بتائے جاتے ہیں۔ اس تعداد میں سے تقریبا ۲/۵ فیصد یعنی ۲۸۰ ہزار غلام شمالی امریکہ منتقل کئے گئے اور کھیتی باڑی کے سخت اور جان لیوا کاموں میں جھونک دیئے گئے۔ سماجیات کے ماہرین کے بقول سخت گرمی کی وجہ سے وہاں کام کرنا نہایت دشوار تھا لیکن ان غلاموں کی جان جوکھم میں ڈال کر سامراجی طاقتوں نے مال و دولت جمع کیا۔

عالمی جنگ

ظلم و ستم کی مذکورہ داستان کے علاوہ جس کے صرف ایک گوشہ کو ہم نے یہاں بیان کیا، مغربی ممالک خود ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے جس کے نتیجہ میں ان کے درمیان آپسی خانہ جنگی ہوئی جس میں ظلم و ستم کی انتہا کردی گئی اور وہ مظالم ہوئے کہ قلم ان کے لکھنے سے شرمندہ ہے۔ پہلی عالمی جنگ نے بربادی اور ظلم و ستم کی وہ داستان اور وہ تاریخ رقم کردی ہے جو ایک تمدن کی بدنامی اور رسوائی کے لئے کافی ہے۔ اعداد و ارقام کے مطابق اس جنگ میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ انسانی جانوں کا نقصان ہوا اور دو کروڑ لوگ زخمی ہوئے، مرنے والوں میں سے ایک کروڑ فوجی تھی اور ساٹھ لاکھ عام انسان تھے۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد تقریبا دو کروڑ لوگ بیماریوں کی نذر ہوگئے۔

تاریخ نے ایک بار پھر دوسری عالمی جنگ کو مغرب کے بظاہر متمدن وحشی لوگوں کے نام پر لکھ دی۔

یہ جنگ پہلی جنگ سے کہیں زیادہ تباہی و بربادی کا باعث ہوئی۔ اس جنگ میں چھ کروڑ سے آٹھ کروڑ پچاسی لاکھ انسان یعنی اس وقت زمین کی آبادی جو دو عرب مانی جاتی تھی اس میں سے کوئی ۳ سے ۴ فیصد انسان مارے گئے جس میں سے تین کروڑ اسی لاکھ سے پانچ کروڑ پچاس لاکھ مرنے والوں کا تعلق عام انسانوں سے تھا جس میں سے ایک کروڑ نوے لاکھ سے دو کروڑ پچاس لاکھ لوگ بیماری اور قحطی سے مر گئے، دو کروڑ بیس لاکھ سے دو کروڑ پچیس لاکھ مرنے والے فوجی تھے اور ان میں بھی پچاس لاکھ جنگی اسیر تھے۔

دہشت گردی اور ظالم و جابر حکومتوں کی حمایت

مغربی ممالک مخصوصا امریکہ کی تاریخ دنیا بھر کی ظالم و جابر حکومتوں کی حمایت اور ان کی پشت پناہی کے تعلق سے بہت ہی سیاہ اور رسوا کن ہے۔ اس نے دنیا کی بے شمار عوامی اور واقعی جمہوری حکومتوں کا تختہ الٹا اور ایسی حکومتوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں وہی حکومت جمہوری ہے جو ان کی استعماری سیاستوں کو قبول کرتی ہو ورنہ ان کی استعماری سیاست کو ٹھکرانے والی حکومت سو فیصد جمہوری ہوتے ہوئے بھی جمہوری حکومت نہیں ہے۔ اس وقت امریکہ ایران کی عوامی حکومت سے برسرپیکار ہے اور دوسری طرف ایشیا کی ظالم و جابر بادشاہی حکومتوں کا پشت پناہ اور سب سے بڑا حامی بنا ہوا ہے جب کہ وہ اس وقت پوری دنیا میں دہشت گردی کے سربراہ اور القاعدہ و داعش جیسی خونخوار تنظیموں کے حامی بلکہ انہیں جنم دینے والے ہیں۔

البتہ یہ بات یاد رہے کہ اس وقت القاعدہ اور داعش کو امریکہ سے ملنے والی حمایت صرف پوشیدہ اور غیر مستقیم طور پر نہیں ہے بلکہ اس خونخوار تنظیم کی پیدائش بھی امریکا اور انگلینڈ کے شیطان صفت سیاستدانوں کی گھناؤنی سیاست کا حصہ ہے۔ یہ دونوں تنظیمیں اس وقت وجود میں آئیں جب امریکہ اور انگلینڈ کے منافع خطرے میں پڑ چکے تھے اور یہ تنظیمیں انہیں اس خسارہ سے محفوظ رکھ سکتی تھیں۔ افغانستان میں سویت یونین کے خلاف محاذ قائم کرنے کے لئے مغربی دنیا متعصب اسلامی جماعتوں سے متحد ہوئی جس کے نتیجہ میں القاعدہ کا جنم ہوا اور داعش کو امریکہ نے شام کے خلاف محاذ قائم کرنے اور وہاں کی حکومت کو ساقط کرنے کے لئے ایجاد کیا۔ آج امریکا داعش کو ختم کرنے کے بہانے میدان میں اترا ہوا ہے تاکہ اسلامی ممالک میں اپنے منحوس قدم جما سکے۔ اس نے ایسے فرضی دشمن کو خطرناک دکھا کر بہت سے ممالک کو ڈرایا دھمکایا اور

انہیں اپنے اسلحے فروخت کئے اور اس طرح اپنے خزانے کو مالامال کیا تاکہ دنیا میں اس کا سرمایہ داری نظام اور اس کی جنگی سیاست قائم رہے۔

یہودیوں کی حمایت کا دعویٰ

موجودہ مسلط اور حکمراں نظام کا دوسرا سب سے بڑا جھوٹ یہودیوں کی حمایت اور ان کے حقوق کو ضائع ہونے سے روکنا ہے۔ وہ ممالک جنہوں نے یہودیوں کے خلاف کلاسیکی عیسائیت کے دور میں نفرت، تعصب اور قتل و غارتگری کا ایک سیاہ باب قائم کیا تھا وہ آج اسلام کے خلاف محاذ قائم کئے ہوئے ہیں اور ان کا یہ الزام ہے کہ اسلام یہودیوں کا دشمن ہے اور انہیں نابود کرنا چاہتا ہے۔ جس زمانے میں اسلامی تمدن ترقی کی ثریا پر تھا اور پوری دنیا میں اس کا بول بالا تھا اس وقت تمام اسلامی سرزمینوں پر بسنے والے یہودی، عیسائی ممالک میں رہنے والے یہودیوں سے کہیں زیادہ بہتر حالت میں زندگی بسر کرتے تھے اور اس اسلامی دور کو یہودیوں کی حیات کا ایک طلائی دور کہا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں اسرائیل کے غاصبانہ قیام سے پہلے تک یہودی اور مسلمان تمام اسلامی ممالک میں خوش و خرم ایک دوسرے کی ہمسائیگی میں زندگی بسر کر رہے تھے اور ان میں کسی قسم کا کوئی اختلاف اور جھگڑا نہیں تھا۔

ہولوکاسٹ کی من گھڑت کہانی اگر واقعی مان لی جائے تو پھر بھی اس کا ہرجانہ آج کے یورپی ممالک کے شانوں پر ہے اور وہ اس واقعہ کے ذمہ دار ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی انسان اس بات کو قبول نہیں کر سکتا کہ یورپی ممالک کے جرم کے ہرجانہ کے طور پر فلسطینیوں کی سرزمین کو غصب کر کے یہودیوں کو ایک مستقل حکومت بنانے کے لئے دے دی جائے۔ اسرائیل اپنے غاصبانہ اور جابرانہ قیام کی ساٹھ سالہ تاریخ میں ساٹھ لاکھ لوگوں کی تباہی و بربادی کا باعث ہوا ہے گویا انہوں نے فلسطین کی نصف آبادی کو ان کی سرزمینوں سے باہر نکال دیا۔ آج اسرائیل یورپی ممالک مخصوصاً امریکہ کی حمایت سے علی الاعلان ظلم و ستم اور فلسطینیوں کے قتل عام میں مصروف ہے اور اس کی تاریخ میں صبرا، شتیلا، گھانا اور انہیں جیسے ہولناک اور دل دہلا دینے والے دیگر فجائع و وقائع ضبط و ثبت ہیں اور وہ آج بھی ایسے واقعات کو دہرانے سے قطعی طور پر نہیں ڈرتا بلکہ دلیری کے ساتھ اس کو دوبارہ انجام دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔

عالمی بھید بھاؤ

موجودہ عالمی سرمایہ داری نظام پوری دنیا میں امیروں اور غریبوں کے درمیان بھید بھاؤ اور جدائی کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے۔ اس وقت دنیا کے صرف ۱ فیصد لوگ دنیا کے ۵۷ فیصد لوگوں کے برابر ثروت اندوزی میں مشغول ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں دنیا کے ۵ فیصد امیروں کی آمدنی دنیا کے ۵ فیصد غریب لوگوں کی آمدنی سے ۱۱۴ گنا زیادہ تھی جب کہ یہ شرح ۱۹۸۸ء میں ۷۸ گنا تھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ۵ فیصد غریب لوگوں نے اپنی ۲۵ فیصد واقعی آمدنی کو کھو دیا ہے جب کہ اس خسارہ کے مقابلے میں ۲۰ فیصد امیروں کی آمدنی ۱۲ فیصد بڑھتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔

پوری دنیا میں بھید بھاؤ اور عدم مساوات کا باعث خود ہر ملک کی داخلی سیاست اور حکومتوں کے آپسی گٹھ بندھن ہیں جس کی وجہ سے امیر ملک روز بروز امیر تر اور غریب ملک روز بروز غریب تر ہوتا جارہا ہے۔ اقوام متحدہ کی انسانی ترقی شعبہ کی حالیہ رپورٹ کے مطابق امریکہ کے ڈھائی کروڑ امیروں کی آمدنی دنیا کے دو ارب غریبوں کی آمدنی کے برابر ہے۔ ۱۸۲۰ء میں مغربی یورپ کے لوگوں کی سالانہ آمدنی افریقہ کی سالانہ آمدنی سے تین گنا زیادہ تھی جب کہ یہی شرح ۱۹۹۰ء میں ۱۳ گنا ہو گئی تھی۔

گذشتہ دہائیوں میں ایک کروڑ تیس لاکھ بچے قے، دست اور پانی کی کمی جیسی بیماریوں سے مر چکے ہیں۔ ہر سال پانچ لاکھ عورتیں دوران حمل یا بچے کی پیدائش کے وقت جان دیتی ہیں اور پوری دنیا میں آٹھ کروڑ سے زیادہ لوگ غذائی قلّت کا شکار ہیں۔ امریکہ، ناروے، جاپان، جرمنی اور فرانس جیسے ملکوں کی سالانہ آمدنی ایتھوپیا، ملاوی، افغانستان اور بولیویا جیسے ملکوں کی سالانہ آمدنی سے سو گنا سے زیادہ ہے۔ ناخالص داخلی پیداوار کی شرح کی درجہ بندی میں کوئی بھی جنوبی امریکہ کا ملک ابتدا کے ۳۵ ملکوں میں شامل نہیں ہے اسی طرح کوئی بھی افریقی ملک ابتدا کے ۵۵ ملکوں میں نہیں آتا۔ پچاس فقیر ممالک کے لوگوں کی نصف آبادی افریقا میں رہتی ہے اور پوری دنیا کے ۶۰ فیصد امیر یورپ اور شمالی امریکہ میں رہتے ہیں۔

ماحولیات کی بربادی

غیر انسانی و استبدادی نظام کی قیمت صرف انسانوں نے نہیں ادا کیا ہے بلکہ تمدن نو کے ظہور اور جدید ترقیات اور مختلف طاقتوں کو کنٹرول میں کرنے کے بعد انسانوں کی ختم نہ ہونے والی خواہش نے اس خوبصورت

زمین کو بھی نابودی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ اس مختصر دور میں اس سرسبز زمین کو جس انداز میں تباہ و برباد کیا گیا ہے اور جنگلات کی جو بربادی کی گئی ہے وہ پوری تاریخ کی بربادی سے کہیں زیادہ ہے۔ بے شمار پرندوں اور جانوروں کی نسلوں اور چراگاہوں کی تباہی، پانی اور ہوا کی آلودگی غرض کہ اس زمین پر رہنے والے جملہ موجودات کی زندگی تباہی کے موڑ پر ہے اور ان سب کا باعث موجودہ نظام حکومت ہے۔

ترقی یافتہ ممالک کی موجودہ معیشتی اور صنعتی ترقی سے عالمی ماحولیات کو زبردست نقصان پہنچا ہے جو کسی بھی طرح قابل جبران نہیں ہے۔ ان کی ترقی کی آڑ میں ایسے نقصانات ہوئے ہیں جو عالمی حیثیت رکھتے ہیں جیسے اوزون تہہ کا پھٹ جانا، زمین کا حد سے زیادہ گرم ہونا، زہریلے اور غیر قابل بازیافت کوڑے اور میٹھے پانی کی قلّت، ہوا کی آلودگی اور نت نئی بیماریاں سب کی سب تمدن نو اور ٹکنالوجی کی دین ہیں جو طبیعی چیزوں سے دوری کی بنا پر وجود میں آئی ہیں۔ آج یورپ کے ترقی یافتہ ممالک اپنے زہریلے کوڑے کو غریب ممالک میں دفن ہونے کے لئے روانہ کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے من مانی کرتے ہوئے افریقہ کے غریب ممالک کو فوجی و غیر فوجی صنایع کی تحقیق کا مرکز بنادیا ہے اور ان کے عظیم خزانوں کو معمولی قیمتوں پر لے کر ہزاروں گنا فائدہ حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ظلم و ستم کی اس داستان کو پڑھ کر اور اپنی آنکھوں سے مغربی میڈیا اور ان کی تہذیب کے تسلط کے زیر اثر مسلّم اور تاریخی حقائق کی تحریف اور ان کی پردہ پوشی سے ذہن میں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مغربی ممالک کو دیگر انسانوں اور ملکوں سے خوفزدہ رہنا چاہئے یا غیر مغربی ممالک جیسے اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کو ہمیشہ مغربی حکومتوں کے تجاوز، غارتگری اور لشکر کشی سے خوفزدہ رہنا چاہئے؟ کیا عالم اسلام نے مغربی ممالک میں تشدد پھیلا رکھا ہے؟ یا یہ مغربی ممالک ہیں جنہوں نے پوری دنیا مخصوصاً مسلمانوں کو اپنی سامراجی سیاست اور خودخواہی کی آگ میں جھونک دیا ہے؟ مسلمانوں کی پوری تاریخ امریکی اور یورپی ممالک کے ظلم و جبر سے بھری ہوئی ہے اسی لئے ہرگز اسلام کے خلاف کسی قسم کا کوئی بھی پروپگنڈہ مغربی ممالک کے چہرے کو مظلومانہ پیش نہیں کر سکتا۔

عالم اسلام میں پائے جانے والے موجودہ تشدد کے لئے ممکن ہے مغربی جاسوسی ایجنسیاں بلاواسطہ ذمہ دار نہ ہوں لیکن بالواسطہ ضرور دخیل ہیں اس لئے کہ انہوں نے سالہا سال اسلامی ممالک کو اپنی جنگ طلبی کے پیروں تلے روندا، ان کی آبرو کو داؤ پر لگایا اور انہیں اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ اس کے علاوہ مغربی

ایشیا میں قائم ہونے والی آزادی بخش تنظیموں کو جو وطن کے نام پر وجود میں آئی ہیں اور جنہوں نے یورپی، امریکی اور اسرائیلی سیاست اور ان کی شیطانی سازشوں کا مقابلہ کیا ہے، انہیں دہشت گرد کا نام دیا جانے لگا اور ان کا قتل عام کیا جانے لگا۔ کیا ایسی صورت حال میں وہ توقع رکھتے ہیں کہ عالم اسلام ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے؟ کیا ان کی توقع بجا ہے؟

سرد جنگ کے خاتمہ اور سوویت یونین کے بکھراؤ اور خاص کر ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کے واقعہ کے بعد اسلام کے چہرہ کو مخدوش کرنے کی جو سازش ہو رہی ہے وہ صرف و صرف حقائق کو چھپانے کے لئے ہے تاکہ مغربی عوام اپنی حکومتوں کے کالے کرتوتوں سے واقف نہ ہونے پائیں۔

یہ مکر و فریب کی ٹکنالوجی، قتل و غارتگری اور جنگ کی تجارت ایسے حقائق ہیں جن سے واقف ہونا امریکی اور یورپی جوانوں کے لئے بہت ضروری ہے تاکہ اس کے مقابلے میں وہ کھڑے ہو سکیں۔ اس لئے کہ تاریخ گواہ ہے کہ مغربی حکومتوں نے اپنی سیاست کی راہ میں ہمیشہ اپنے عوام کو قربان کیا اور ہر گز ان پر رحم نہیں کیا ہے۔ آج آزاد اندیش انسانوں کے درمیان بڑھتے ہوئے رابطے اور ان کے افکار کے عالمی پیمانہ پر تبادلے کی وجہ سے آج کا انسان شعور کی منزلوں کو طے کرتا جارہا ہے اور اب ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ عالمی جنگ، مکر و فریب اور قتل و غارتگری کا سد باب کرے اور اس امر کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میڈیا کے آئینہ سے دور ہو کر عالمی وقائع کا جائزہ لیا جائے اور عالمی سماج کا ایک حصہ ہوتے ہوئے ان کے سلسلہ میں غور و فکر کی جائے اس لئے کہ اس کے بغیر زمین پر رہنے والوں کی موجودہ نظام سے رہائی ناممکن ہے۔

مغربی سماج میں انتہا پسندی: ایک مختصر تجزیہ

مولف: سید مجید امامی
مترجم: محمد جعفر زیدی

گذشتہ چند دہائیوں سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ مغربی یورپ میں اسلام کے سلسلہ میں بہت زیادہ بحث و گفتگو ہو رہی ہے۔ ممکن ہے اس کی جڑیں مختلف حوادث اور واقعات میں پوشیدہ ہوں جیسے ایران کا اسلامی انقلاب، خلیج فارس کی جنگ، سابق یوگوسلاویہ کی جنگ، مشرق وسطی کے بدلتے حالات اور تیزی سے پھیلتا ہوا اسلام۔ ان تمام عناصر کے علاوہ ایک دوسرا عنصر بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور وہ ہے کثیر تعداد میں مسلمانوں کا ان ممالک میں ہجرت کرنا جو یورپی یونین کے رکن ہیں۔ یورپی سماج کی موجودہ حالت پر سرسری نظر ڈالی جائے تو بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یورپ میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک اور رویہ اپنایا جارہا ہے وہ سراسر تعصب اور عدم آگہی پر قائم ہے جسے واضح طور پر ان کے ٹی وی چینلس اور میڈیا رپورٹوں میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ ایسے پروگرام اور رپورٹیں جس میں مسلمانوں کو خطرناک، متعصب، بدو اور عقل سے دور دکھلایا جارہا ہے۔

۱۹۸۰ء سے لے کر اب تک مغربی میڈیا مسلسل مغربی لوگوں کو اسلام کے خطرہ سے آگاہ کرارہا ہے لیکن اسلام کے خلاف یہ تہمتیں کبھی بھی حقیقتوں اور قابل یقین شواہد و قرائن پر استوار نہیں رہی ہیں۔ اسلام کے خلاف مغربی سیاستداں اور میڈیا جس چیز کو بطور دستاویز پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ دہشت گردوں کی اکثریت یورپ کے تازہ مسلمان یا مہاجرین ہیں جن کی سلفی فکریں اسلامی بنیاد پرستی سے پوری طرح ہماہنگ ہے۔ ایسی تصویر جو تنگ نظری، تشدد، کٹرپن، تحجر اور تہذیب و تمدن ستیزی کے رنگوں سے پوری طرح رنگی ہوئی ہے۔ اس پہیلی کو کیسے سلجھایا جائے؟ تشدد، بنیاد پرستی اور وہ سختیاں جو یورپی سماج کے ذریعہ مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں ان میں سے کون سا عنصر علت اور کون سا عنصر معلول ہے؟ ہمارا جواب یہ ہے

کہ کوئی بھی نہیں؛ یعنی مذکورہ تمام عناصر کسی تیسرے عنصر کی وجہ سے ہیں۔ لیکن کیوں اور کیسے؟ مجموعی طور پر یورپ میں ہم دو طرح کی اسلام ستیزی دیکھ رہے ہیں: اسٹراٹیجک اسلام دشمنی اور عوام کی اسلام دشمنی۔ اسٹراٹیجک اسلام دشمنی کا آغاز ۱۹۷۰ کی دہائی سے ہوا اور زیادہ تر امریکہ میں یہ دشمنی پائی جاتی تھی۔ اوپک کی جانب سے تیل کی قیمت میں اضافہ، ایران کا اسلامی انقلاب، تہران میں امریکی سفارت خانہ پر قبضہ اور موجودہ اراکین سفارت کو یرغمال بنانا، ۱۹۹۳ میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ، ستمبر ۲۰۰۱ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ اور مغربی میڈیا میں اس واقعہ کی جانبدارانہ اور مغرضانہ تجزیہ و تحلیل، یہ تمام واقعات اسٹراٹیجک اسلام دشمنی کا ماحصل ہیں۔

اسلام دشمنی کا دوسرا مرحلہ یورپ سے شروع ہوا۔ عوامی اسلام دشمنی یورپ میں مسلمانوں کی موجودگی کا نتیجہ ہے اور مہاجرین کے انضمام، نسلی اختلافات اور حجاب جیسے مسائل پر مرکوز ہے۔ ۱۹۸۰ء میں عوامی اسلام دشمنی نے ایک نیا رخ اپنایا اور مغربی یورپ میں اینٹی امیگریشن تحریک میں تبدیل ہو گئی۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسٹراٹیجک اسلام دشمنی کا تعلق معاشیات اور سیاست سے ہے وہیں عوامی اسلام دشمنی کا تعلق ثقافتی پہلوؤں سے ہے۔ دو الگ الگ طرح کی اسلام دشمنی واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ کس طرح سیاسی، معاشی اور ثقافتی مسائل دین اسلام سے جڑے ہوئے ہیں اور اسلام نامی حقیقت کو تشکیل دے رہے ہیں۔ اس طرح کی بحث و گفتگو میں ہمیں اس بات کی طرف توجہ رکھنی ہوگی کہ ہم کون سے اسلام سے روبرو ہیں۔ جو اسلام ان تنازعات اور کشیدگی میں تنقید کا نشانہ بنتا ہے یہ وہ اسلام نہیں ہے جو قرآن و سنت سے ماخوذ ہے بلکہ اس اسلام کا تعلق سیاسی و معاشی لحاظ سے بحران زدہ یورپی سماج سے ہے۔ لہٰذا ایسی صورت حال میں چاہے ہم اسلام کے حامی ہوں یا اس پر تنقید کرنے والے، ہمیں چاہئے کہ ہم ان عوامل و اسباب کو تلاش کریں جس کی وجہ سے یہ تنازعات و کشیدگی وجود میں آئی اور اس کے بعد ہی کوئی رائے قائم کریں؛ کیونکہ ان شرائط میں قرآن و سنت میں موجود اس کی حقیقی تعلیمات کی بنا پر اسلام پر تنقید کرنے کا لازمہ دو غلط فہمی اور پہلے سے طے شدہ قیاس ہیں:

سب سے پہلے تو یہ کہ، اسلاموفوبیا (اسلام دشمنی) مغربی ثقافت، راہ و روش اور یورپی تہذیب و سماجی اقدار کو بنیاد بناتا ہے اور اسلامی و مغربی ثقافت کے درمیان ناقابل مفاہمت جدائی کا قائل ہے۔ یہاں پر اہم اور قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ حد سے زیادہ ثقافتی اختلافات پر زور دینا اور تاکید کرنا، اسلامی تہذیب کے ادراک

اور شناخت کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کا ہدف مغربی ثقافت کی اسلامی ثقافت پر برتری کو عیاں وظاہر کرنا ہے لہٰذا طبیعی ہے کہ یہ سوچ صرف انہی لوگوں کی ہوگی جو پورے زور و شور سے یورپ میں اسلام کا منفی اور بھیانک چہرہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ دونوں ثقافتوں کے درمیان موازنہ اس طرح سے کیا جاتا ہے کہ مسئلہ ہی تحریف کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب اسلام کا تقابل بعنوان دین کسی خاص جغرافیائی علاقہ یا مغرب نامی سماج سے کیا جاتا ہے تو یہ تقابل تعصب سے خالی نہیں ہوتا ہے اور اس کا مقصد صحیح شناخت و معرفت اور منصفانہ غور و خوض نہیں ہے بلکہ پس پردہ سیاسی اغراض و مقاصد چھپے ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسلام فوبیا نقطۂ نظر سے تمام اسلامی ترقیوں اور تغیرات کا تعلق انتہا پسندی سے ہے۔ بطور مثال ایران کے اسلامی انقلاب کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا اس کے پیچھے صرف اسلامی انتہا پسندی کے عوامل کارفرما تھے اور مسلمانوں کی ذرہ برابر بھی توجہ تہذیب و تمدن، معاشیات، سماجی اور سیاسی عوامل و عناصر کی جانب نہیں تھی جن کا اس واقعہ میں اہم کردار تھا۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یورپی معاشرہ میں اسلام کو غلط اور منفی قضاوتوں سے کیوں روبرو ہونا پڑ رہا ہے اور کیوں مغربی میڈیا لوگوں کے اذہان میں اسلام کی غیر حقیقی تصویر پیش کر رہا ہے۔ یورپ میں اسلام کو اس کی بنیاد اور تعلیمات کی بنا پر نہیں بلکہ ایک جدید ابھرتی ہوئی سماجی، ثقافتی اور سیاسی تحریک کی وجہ سے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس درمیان معاشیاتی پہلو جس کا اس صورت حال میں اہم کردار ہے، اس سے پوری طرح غفلت برتی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں، میڈیا یورپ میں سکونت پذیر مسلمانوں کو بعنوان اقلیت پیش کرتی ہے جو تشخص اور ثقافت کے لحاظ سے پچھڑے اور غریب ہیں اور ان کی تہذیبی خصوصیتیں اس بات کی مانع ہیں کہ وہ جمہوریت اور اعلی مغربی ثقافت میں پوری طرح سے گھل مل جائیں۔ اسلام کو اس طرح سے پسماندہ و پچھڑی ثقافت کے طور پر پہچنوانے کے اقتصادی رجحانات بھی ہیں جو بہت سے مالی فوائد سے مسلمانوں کی محرومیت کا سبب ہے۔

اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنے پر مغربی میڈیا کا اصرار، ممکن ہے خود مسلمانوں کے اذہان کو بھی منحرف کردے کیونکہ جب مغربی میڈیا اسلام کا تجزیہ و تحلیل صرف سماجی اور سیاسی نقطہ نظر سے کرتا ہے تو ممکن ہے مسلمان بھی اسی پس منظر میں اپنا ردعمل دکھلائیں۔ مثال کے طور پر سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کے ضمن

میں اسلام کو ایک شدت پسند افراطی اور غیر منطقی دین کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ یورپ میں اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنے پر ممکن ہے بعض یورپی مسلمانوں کی جانب سے تند اور شدید رد عمل بھی سامنے آئے جو مغربی میڈیا کے دعووں کی تصدیق کا سبب قرار پاتا ہے لہٰذا گذشتہ چند دہائیوں سے یورپ میں اسلام دشمنی اور اسلام ستیزی کے نام پر جو چیز پیش کی جارہی ہے اس کا ذرہ برابر بھی تعلق عقل و منطق یا اسلامی تعلیمات سے نہیں ہے بلکہ اس تنازع میں اسلام ایک آلہ کی طرح ہے جس کا استعمال مغربی سیاستداں اور یورپی میڈیا اپنے ناپاک اہداف کو حاصل کرنے کے لئے کررہے ہیں۔

یہ مسئلہ اس جہت سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ مغربی میڈیا اور یورپی سیاستدانوں کی تنقید اور اس عظیم پروپگنڈہ کے خلاف یورپی مسلمانوں کا رد عمل کا تعلق اسلامی تعلیمات سے نہیں ہے۔ اس تنازع میں جو چیز اہم ہے وہ یورپ میں تعلقاتِ قدرت وطاقت ہے جیسا کہ بعض مغربی مفکرین اور دانشور حضرات بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سویت یونین کے بکھرنے کے بعد کمیونیزم کی جگہ اسلام یورپ کا سخت اور خطرناک دشمن بن گیا۔

گذشتہ چند دہائیوں میں مغربی میڈیا اور سیاستدانوں نے بخوبی اس چیز سے فائدہ اٹھایا اور بعض موارد میں بعض عوامل جیسے محرومیت، پابندیاں، نسلی تعصّبات اور یورپی معاشرہ میں موجود عدم مساوات کی وجہ سے بعض مسلمانوں نے بھی ایسے رد عمل اور جوابی کاروائی کا مظاہرہ کیا جس سے مغربی میڈیا نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بھرپور فائدہ اٹھایا لیکن اس درمیان جو مغالطہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اسلام اور مسلمانوں کو ایک غیر مساوی جنگ میں مجرم ٹھرایا جاتا ہے اور جب اس عدم مساوات اور تعصب پر اعتراض کرتے ہوئے مسلمان کسی رد عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں تو یورپی میڈیا مسلمانوں کی اس کاروائی کو اپنے دعووں کی سچائی پر بطور گواہ پیش کرتے ہوئے دوبارہ مسلمانوں کو مجرم وخطاکار قرار دیتا ہے۔

ہفت روزہ اخبار شارلی ابدو[۱] کے دفتر پر ہوئے حملہ کا تجزیہ بھی اسی تناظر میں ہونا چاہئے۔ یورپ میں مسلمان مختلف قسم کے تعصّبات اور عدم مساوات کا شکار ہیں اور ان تمام تعصّبات کو ان کے مسلمان ہونے کی

۱۔ شارلی ابدو Charlie Hebdo :ایک فرانسیسی طنزیہ ہفت روزہ اخبار ہے جو کارٹونوں، رودادوں، مباحثوں اور لطیفوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اپنے لب ولہجے میں گستاخ اور بے بدل، ہفت روزہ سخت مذہب مخالف اور بائیں بازو سے تعلق رکھتا ہے۔

وجہ سے ان پر روا رکھا گیا ہے تاہم عمل میں مسلمان ایک بڑھتی ہوئی ثقافتی اور نسلی اقلیت میں تبدیل ہو گئے ہیں جو یورپی میڈیا کے مطابق ثقافت، سیاست اور اقتصادی لحاظ سے یورپ کے لئے خطرہ بن گئے ہیں۔

حد سے زیادہ اس بات کی تکرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض مسلمان اضطراب اور ڈپریشن میں مبتلا ہو گئے اور اپنی نفسیاتی کیفیت کے مطابق عمل کرنے لگے جس کے نتیجہ میں مغربی میڈیا کو دوبارہ بہانہ مل گیا اور اسلام کے خلاف اس نے اپنی سازشوں کو مزید تیز کر دیا لیکن اس درمیان جس چیز کو نظر انداز کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا اسلامی نصوص اور تعلیمات میں اس طرح کے تشدد کو جائز قرار دیا گیا ہے؟ جس اسلام کے نام پر پیرس میں دہشت گردانہ حملہ کیا گیا، وہ نہ تو سنی اسلام ہے اور نہ ہی شیعہ اور نہ ہی وہابی اسلام اور نہ ہی روایتی بنیاد پرستی کی تفسیر سے ماخوذ ہے بلکہ یہ فرانس کا بانلیو[1] [شہر کا فقیر نشین علاقہ] اسلام ہے جو ایسے فرانسیسی نوجوانوں پر مشتمل ہے جو نسلی اعتبار سے اہل مراکش ہیں جن کے اندر تشخصی بحران اور حکومت کی جانبدارانہ پالیسیوں کے خلاف غم و غصہ بھرا ہے۔

فرانس کے فقیر نشین علاقوں کے مسلمان نہ تو فرانسیسی ہیں اور نہ ہی عرب۔ وہ اپنے غلیظ عربی لہجہ میں فرانسیسی بولتے ہیں لیکن غالبا وہ ایک جملہ بھی عربی کا ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ امریکی سیاہ فام[2] Ghetto کی طرح ان کی گفتگو اعتراض اور غصہ سے بھری موسیقی کے انداز میں ہوتی ہے۔ ان کے جمع ہونے کی جگہ نہ تو مسجد ہے نہ ہی نماز جمعہ اور نہ ہی دعا و استغفار کا جلسہ بلکہ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر وہ جمع ہوتے ہیں۔ کسی منظّم و منسجم گروہ کی طرح ایک دوسرے کے سلسلہ مراتب کا پاس و لحاظ رکھنا، بظاہر ایک جیسے لباس پہننا اور غیر قانونی سرگرمیاں انجام دینا [جیسے ڈرگس کی خرید و فروخت] سرد و گرم اسلحہ اپنے پاس رکھنا، تمام اعضاے گروہ کے ساتھ احساس برادری رکھنا [جیسے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے وقت Bro کہہ کر بلانا] نیز تمام اسٹریٹ کلچرز اور عادت و رسوم انہیں امریکی روڈ پر موجود آوارہ و بدمعاشوں کے گروہ سے زیادہ مشابہ بناتا ہے چہ جائیکہ ان کا شمار مذہبی اقلیت میں ہو۔

آج یورپ میں جو ان اپنی شناخت و تعارف کے بحران سے روبرو ہے، وہ نافرمان اور قانون شکن ہے

---

1. banlieue

۲. شہر کا وہ علاقہ جہاں اکثر فقیر اور مہاجر افراد زندگی گزارتے ہوں امریکہ میں گتو سیاہ فام اور مکزیکی لوگوں کو کہا جاتا ہے۔

اور سماجی محرومیتوں کا شکار ہے؛ وہی جوان جنہوں نے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں فرانسیسی طلبا تحریک کی صورت میں نمایاں کام انجام دیا۔ اس وقت یہ طلبا تحریک صرف فرانس ہی تک محدود نہیں تھی اور آنے والے چند سالوں میں ظلم و استبداد سے ناراض نوجوانوں نے یورپ میں نظام سرمایہ داری کو لبرل ریاستوں کے لئے درد سر بنا دیا۔ قابل غور بات یہ تھی کہ اس تحریک میں نہ صرف ان لوگوں نے شرکت کی جن کا تعلق سوشلزم سے تھا بلکہ ایک اچھی خاصی تعداد ان افراد کی بھی تھی جو فکری لحاظ سے لا قانونیت، قوم پرستی اور فاشیزم سے وابستہ تھے اور جن کی موجودگی سے یہ تحریک ایک عظیم تحریک میں تبدیل ہو گئی تھی۔ مغربی حکومتوں اور نظام سرمایہ داری نے کس طرح اس مشکل پہ قابو پایا یہ ایک الگ بحث ہے اور ہر گز اس مقالہ میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اسے بیان کیا جائے؛ لیکن جو چیز قابل غور ہے وہ یہ کہ یہ بحران صرف اور صرف سرمایہ داری نظام کی بے عدالتی اور ناکامی کی وجہ سے وجود میں آیا۔

اگر گذشتہ دہائی کے ماہرین اقتصادیات یا منتقد دانشور جیسے "Joseph Stiglitz"، "Naomi", "Klein" "HaJoon Chang" اور "John pilger" کی تجزیہ و تحلیل کا جدید لبرلزم سے مقابلہ کریں تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے گی کہ آج جو گھٹن اور غلبہ والی سیاست حاکم ہے، وہ کسی بھی طرح سے ۱۹۶۰ کی دہائی سے کم نہیں ہے اور اس غاصب نظام سرمایہ داری کے خلاف آواز اٹھانے والی تحریک آج بھی موجود ہے لیکن اس تحریک کے سن رسیدہ افراد کو زندگی کی سخت اور دشوار شرائط نیز کاذب ضرورتوں کو پورا کرنے میں مصروف کر دیا گیا ہے لہٰذا تنہا وہ گروہ جو اپنی سماجی صورت حال اور بپھری طبیعت کے ذریعہ اس تحریک کو آگے بڑھا سکتا ہے وہ صرف جوان طلبا کا گروہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپی ممالک میں جوان، خاص کر مہاجرین اور نچلی سطح پر زندگی گذارنے والے افراد شدید طور پر انتہا پسندی کی طرف مائل ہیں وہ اپنی پوشاک اور گفتگو سے اپنی ناراضگی و خفگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان حالات میں صرف ایک رہائی بخش اور طبقاتی و سرمایہ داری نظام کے خلاف آواز اٹھانے والی آئیڈیالوجی کی ضرورت ہے جو اس آتش فشاں کی صحیح ہدایت کر سکے۔

آج یورپی سماجی تحقیق کے مراکز اور یورپی اتحاد کے شعبے اپنی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ یورپی جوان روز بروز انتہائی نسل گرائی اور اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ ایک طرف سے تو خالص یورپی لوگ مہاجرین کی بڑھتی تعداد سے متاثر ہو کر [خاص کر عرب، افریقی اور ترک مہاجرین سے] شدید نسل گرا ہوتے جا رہے

ہیں اور اپنے غصہ کو غیر یورپی افراد پر نکالتے ہیں۔ دوسری طرف وہ مہاجرین جو سرمایہ داری اور طبقاتی نظام میں گھٹ گھٹ کر جی رہے ہیں اور ہر دن تحقیر، توہین اور تبعیض کا شکار ہوتے ہیں، وہ اسلامی بنیاد پرستی یعنی سلفیت کی پناہ میں چلے جاتے ہیں۔ یہیں سے یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے کہ کیوں یورپ کے تازہ مسلمان یا اصالتاً عرب افراد داعش اور دیگر دہشت گردی گروہ کی حمایت کرتے ہیں۔

حقیقت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یورپی جوانوں کا مسلسل قانون توڑنا، تشدد کرنا اور انتہا پسند ہونا، داعش کے تمام وحشیانہ اقدامات کے باوجود انہیں اس کٹر تنظیم سے ملحق ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ آج پورے یورپ میں مسلمانوں کو مسلحانہ حملہ اور تشدد کے لئے موردالزام ٹھرایا جاتا ہے جبکہ بہت سے دہشت گردانہ حملوں کا شکار خود مسلمان ہوتے ہیں یا تشدد پسند تنظیموں کے ذریعہ انہیں آزار واذیت پہنچائی جاتی ہے تاکہ وہ یورپ سے نکلنے پر مجبور ہو جائیں۔ اسی طرح سے اس نظریہ پر زور دینا کہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب بالکل ہی ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں اور انہیں آپس میں جمع نہیں کیا جاسکتا ہے لہٰذا کبھی بھی مسلمان مغربی تہذیب میں رچ بس نہیں سکتے ہیں، تعصب اور اسلامی تعلیمات سے ناآشنائی کی وجہ سے ہے۔ اس سلسلہ میں معمولا مسلمانوں کے اعتقادی مسائل جیسے حجاب اور تعدد ازواج کی طرف اشارہ کرکے ان کو بڑھاچڑھا کر مخاطبین کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کو مسترد کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود کو اپنی مادری سرزمین یا اس طرح کہا جائے کہ عالم اسلام سے وابستہ جانتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جن یورپی ممالک میں وہ مقیم ہیں خود کو اس ملک کے شہری قوانین کا پابند نہیں جانتے ہیں۔ اس سلسلہ میں Fred Halliday ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے اس موضوع کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ ان کی نظر میں یورپ کی مسلمانوں سے دشمنی، ان کا نسلی مہاجر ہونا اور دقیانوسی تصورات کی وجہ سے ہے لہٰذا ان کی دشمنی ایک گروہ سے ہے نا کہ اسلام سے؛ کیونکہ اسلام کے خلاف جو پروپگنڈے پیش کئے جاتے ہیں وہ صرف مذہبی اور دینی عناصر پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ایسے نظریاتی نظام پر استوار ہیں جس میں تمام عناصر شامل ہیں۔

فقیہ کی ولایت مطلقہ، آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای کی نظر میں

مولف: اکبر اشرفی، قدسی علیزادہ سیلاب
مترجم: خان محمد صادق جونپوری

ولایت فقیہ، سیاسی فقہ شیعہ کا اہم موضوع ہے جسے ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد بہت اہمیت حاصل ہوئی اور اسے اسلامی نظام کی اصلی بنیادوں میں سے مانا گیا۔اس مقالہ میں اس فقیہ کے اختیارات کے سلسلہ میں بحث و گفتگو مقصود ہے جسے ولایت امر سونپی گئی ہے۔اس کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ کچھ لوگ اس نظریہ کے سخت مخالف ہیں جو ولایت فقیہ کے اختیارات کے سلسلہ میں شبہ پیدا کرتے ہیں اور اس کی ایک غیر منطقی اور آمرانہ تصویر پیش کرتے ہیں۔ آیت اللہ خامنہ ای ولی فقیہ کی حیثیت سے اسلامی جمہوری نظام کی قیادت فرمارہے ہیں، لہٰذا ولی فقیہ کے حدود و اختیارات یا ولایت مطلقہ فقیہ کے سلسلہ میں آپ کے نظریات و آرا سے واقفیت بہت اہم ہے۔

امام خمینی (رہ) نے اسلامی انقلاب کی کامیابی اور اسلامی جمہوری نظام کے نفاذ کے بعد ولایت فقیہ کے مختلف پہلوؤں کی تفصیلی شرح پیش کی۔ محقق کرکی، نراقی اور صاحب جواہر جیسے فقہا فقیہ کے لئے اطلاق کی حد تک حق ولایت کے قائل ہیں اور اسے ولایت عامہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس لحاظ سے ولایت عامہ اور ولایت مطلقہ میں کوئی فرق نہیں ہے اور ولایت مطلقہ کا نظریہ امام خمینی (رہ) سے پہلے بھی موجود تھا بلکہ بعض دانشوروں نے بعض فقہا کے بیان میں موجود لفظ مطلقہ یا عامہ سے یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ وہ لوگ ولایت مطلقہ کے قائل تھے۔ چنانچہ محمد ہادی معرفت شیخ انصاری کے نظریہ کی تشریح کے ضمن میں یہ کہتے ہیں کہ شیخ انصاری اور آیت اللہ خوئی ولایت مطلقہ کے قائل تھے[۲]۔

---

۱. ارسطا، محمد جواد، مفہوم اطلاق در ولایت مطلقہ فقیہ، فصلنامہ علوم سیاسی، شمارہ ۲، ص ۷۹-۸۳
۲. معرفت، محمد ہادی، ولایت فقیہ از دیدگاہ شیخ انصاری و آیت اللہ خوئی، اندیشہ حوزہ، شمارہ ۱۷، ص ۲۴۶

بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نراقی اور صاحب جواہر جیسے فقہاکے نظریہ کو ولایت عامہ یا مطلقہ سے تعبیر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن ان فقہاکے بیان پر غور کرنے اور امام خمینی(رہ) کے نظریہ کو بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ فقہاکے بیان میں موجود لفظ عامہ اور امام خمینی(رہ) کے نظریہ ولایت مطلقہ میں تفاوت ماہوی ہے کیونکہ فقہائے مذکور کے بیان سے احکام اولیہ اور ثانویہ میں ولایت کے سوااور کچھ استنباط نہیں ہوتا ہے اور ولایت مطلقہ کے قائل فقہاکے بیان سے بھی تمام حسبیہ امور میں ولایت کی شمولیت اور صرف قضاوت یا کسی دوسرے امور میں اس کا محدود نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

امام خمینی(رہ) نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں جس اصطلاح کا استعمال کیا اس کی بنیاد پر ولایت مطلقہ کا مطلب مصلحت کی بنیاد پر ولایت کا نفاذ ہے جس کا احکام ثانویہ میں شمار نہیں ہوتا بلکہ یہ احکام اولیہ میں شامل ہے یا اس پر بھی مقدم ہے۔ بے شک گذشتہ فقہا کا یہ مطلب نہیں تھا اور شاید امام خمینی(رہ) سے قبل اس تعبیر کو کسی نے استعمال نہیں کیا ہے[1]۔

اسلامی جمہوریہ ایران کے قائد کے عنوان سے ولایت فقیہ کے اختیارات کے سلسلے میں آیت اللہ خامنہ ای کے نظریات کو جاننا بہت ضروری ہے لہٰذا اس مقالہ میں سب سے پہلے ولایت مطلقہ فقیہ کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور پھر اس موضوع پر آیت اللہ خامنہ ای کے نظریات کا تجزیہ کیا گیا ہے اور مقالہ کے آخر میں ولایت فقیہ اور مردم سالاری دینی پر گفتگو ہوئی ہے۔

ولایت فقیہ کے نظری اصول:

اصل موضوع پر گفتگو سے قبل یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ولایت فقیہ کے نظری اصول اور اس سے متعلق اصطلاحات کی تشریح کر دی جائے۔

ولایت

ولایت ایک عربی لفظ ہے جو لفظ ولی سے مشتق ہے اور جس سے محبت، حب و دوستی، نصرت و یاری،

۱۔ حقیقت، سید صادق، بررسی و نقد نظریہ ہای دولت در فقہ شیعہ، فصلنامہ علوم سیاسی، شمارہ ۴۸، ص ۱۹۱-۱۹۴۔

سلطان، متابعت و پیروی و سرپرستی کے معانی والے الفاظ مشتق ہوتے ہیں[۱]۔ولایت اصطلاحی طور پر کسی خاص فرد یا افراد پر حق سرپرستی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور حقیقت میں کسی شخص کے امور میں حق مداخلت کے معنی میں ہے۔ فقہا کی اصطلاح میں ولایت عقل یا شرع کے حکم سے کسی غیر کے بدن یا مال یا دونوں پر حاکم ہونے کے معنی میں ہے[۲]۔ امام خمینی کی نظر میں کسی ملک پر حکومت اور شرعی قوانین کے کو ولایت کہتے ہیں[۳]۔ لفظ ولایت ولی فقیہ کے مبحث میں سرپرستی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس میں ولایت تکوینی و ولایت تشریعی دونوں شامل ہیں۔ ولایت تشریعی کی دو قسمیں ہوتی ہیں، مجور پر ولایت اور عقلمند لوگوں پر ولایت۔ ولایت فقیہ اسلامی معاشرہ پر ولایت کے معنی میں ہے جسے احکام کے نفاذ، دینی اقدار کے تحقق، سماج میں رہنے والے افراد کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور انہیں منزل کمال پر پہنچانے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے[۴]۔

مطلقہ: لفظ مطلق اور مطلقہ چند معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

الف: ہر طرح کے قید و بند سے آزاد ہونا

ب: محدود و مقید کے مقابلہ میں

ولایت فقیہ کے ضمن میں لفظ اطلاق کا مطلب ولایت فقیہ کے حدود اور اس کی ذمہ داریاں ہے۔ گذشتہ فقہا لفظ مطلقہ کے بجائے لفظ عامہ کا استعمال کرتے تھے کیونکہ اس ولایت مطلق کے علاوہ دوسری ولایتیں بھی ہیں جن میں ایک خاص موضوع مد نظر ہوتا ہے۔ جیسے بیٹی کی شادی کے سلسلے میں باپ کی ولایت یا نابالغ بچے کے مال میں باپ یا دادا کا حق تصرف لہٰذا ولایت فقیہ کے ضمن میں اطلاق کا مطلب ولایت فقیہ کا دائرہ کار اور اسلامی معاشرہ کے تمام انتظامی امور اور مصالح عمومی کے مختلف پہلوں پر اس کا حق ہے لہٰذا لفظ مطلقہ مقید کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے جس میں ولی فقیہ کے اختیارات صرف کچھ موارد جیسے

---

۱. ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، ج ۱۵، ص ۴۰۰-۴۰۲

۲. بحر العلوم، محمد بن محمد، بلغۃ الفقیہ، ج ۳، ص ۲۱۰

۳. موسوی الخمینی، روح اللہ، ولایت فقیہ، ص ۵۱

۴. جوادی آملی، عبداللہ، ولایت فقیہ ولایت فقہاہت و عدالت، ص ۱۲۲-۱۲۹

امور حسبیہ تک محدود تھے۔ ولایت فقیہ کے مطلق ہونے کا یہ مطلب ہے کہ :

۱. فقیہ پر لازم ہے کہ اسلامی احکام کی تبیین کرے اور اسے معاشرہ میں نافذ کرے کیونکہ کوئی بھی حکم الٰہی عصر غیبت میں معطل نہیں کیا جاسکتا ہے۔

۲. اہم و مہم کے قاعدہ کی بنیاد پر تزاحم احکام کے لئے کوئی فیصلہ کرے۔

۳. مطلقہ حکومتوں کے برخلاف ولایت فقیہ میں لفظ اطلاق اسلامی موازین اور عدالت و تقوا کی بنیاد پر اسلامی معاشرہ کے ادارہ کرنے تک محدود ہے[۱]۔

ولایت فقیہ کے سلسلہ میں ولی فقیہ کے حدود و اختیارات کا موضوع سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ زمانہ غیبت میں ولی فقیہ کے وجود پر فقہا میں اتفاق رائے ہے لیکن ولی فقیہ کے حدود و اختیارات کے سلسلہ میں ان میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ امام خمینی(رہ) کی نظر میں ولی فقیہ کے پاس پیغمبر اسلام(ص) کے سارے حکومتی اختیارات موجود ہیں اور ولی فقیہ کی حکومت رسول خدا(ص) کی ولایت مطلقہ کا ایک شعبہ اور اسلام کے اولیہ احکام میں سے ہے جو تمام فرعی احکام جیسے نماز، روزہ اور حج پر مقدم ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ حکومت وسیاست کے سلسلے میں وہ تمام امور جو پیغمبر اسلام(ص) اور ائمہ معصومین(ع) کے لئے مقرر ہیں، فقیہ عادل کے لئے بھی ثابت ہیں اور عقلی طور پر ان میں کوئی فرق نہیں ہے[۲]۔

فقیہ: ولایت فقیہ کے سلسلہ میں فقیہ سے مراد مجتہد جامع الشرائط ہے جس میں تین خصوصیتیں پائی جاتی ہیں:

الف: اجتہاد مطلق: اسلام ایک منسجم مجموعہ کا نام ہے جس کی سیاست عین دیانت اور دیانت عین سیاست ہے لہٰذا اسلام کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے فقیہ کا اسلامی موضوعات پر مکمل احاطہ کرنا ضروری ہے۔ حقیقی اسلام شناس وہی ہے جو اصول و فروع، عبادات و عقود و احکام اور اسلامی سیاست میں ماہر ہے۔ اسلامی نظام پر حکومت کرنے والا فقیہ جو عصر غیبت میں قرآن کی حفاظت کرنے والا اور اس کو نافذ کرنے والا

---

۱. کعبی، عباس، بررسی تطبیقی مفہوم ولایت مطلقہ فقیہ، ص ۶۱۔

۲. موسوی الخمینی، روح اللہ، شوون واختیارات ولی فقیہ، ص ۳۵

ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کے تمام جوانب سے آگاہ ہو۔ قرآنی احکام و معارف سے آشنائی کے علاوہ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان اور اسلامی معاشرہ سے متعلق روایات کو اچھی طرح جانتا ہو اور اسلامی احکام پر مکمل طور پر احاطہ رکھتا ہو اور مسلمانوں کو درپیش مستحدثہ مسائل کا راہ حل تلاش کرکے انہیں اصول وفروع دین سے منطبق کرسکے[۱]۔

ب: عدالت مطلق: فقیہ جامع الشرائط کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی احکام کو مکمل طور پر سمجھنے کے علاوہ اس علم کو اپنی ذات اور اسلامی معاشرہ میں صحیح طریقہ سے نافذ کرسکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام دینی احکام پر عمل کرے، دین کو مکمل طور پر لوگوں تک پہنچائے اور ہوی وہوس کو ترک کردے۔ فقیہ عادل اگر کوئی فتوی دیتا ہے تو سب سے پہلے وہ خود اس پر عمل کرے اور کوئی قضاوت کرتا ہے تو خود بھی اسے قبول کرے اور اگر حکم ولائی وحکومتی صادر کرتا ہے تو خود بھی اسے مانے[۲]۔

ج: مدیر و مدبر ہونا اور قیادت کی صلاحیت: فقیہ جامع الشرائط کے لئے ضروری ہے کہ اجتہاد و عدالت مطلق کے علاوہ ملک کے اندرونی اور بیرونی سیاسی امور کے متعلق صحیح بصیرت رکھتا ہو اور مدیریت کا ہنر اس کے پاس ہو کیونکہ مدیریت میں نظریاتی صلاحیت کے علاوہ تدبیر کی ضرورت ہے لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر فقیہ عادل معاشرہ کی قیادت کرسکتا ہے بلکہ علمی صلاحیت کے علاوہ اسلامی امت کے ادارہ کرنے کے لئے اس کے اندر صلاحیت ہونی چاہئے[۳]۔

اس مسئلہ کی اہمیت اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین کی دفعہ نمبر ۱۰۹ میں رہبر کی مندرجہ ذیل خصوصیات بیان کی گئی ہیں:

۱. فقہ کے مختلف ابواب میں افتا کی علمی صلاحیت؛

۲. امت اسلامی کے لئے لازمی عدالت و تقوی؛

۳: سیاسی واجتماعی بصیرت، تدبیر، شجاعت اور مدیریت۔ اگر مذکورہ شرائط کئی لوگوں میں یکساں طور پر پائی

---

۱. ولایت فقیہ، ولایت فقاہت وعدالت، ص ۱۳۷۔

۲. ایضاً، ص ۱۳۸-۱۳۹۔

۳. ایضاً، ص ۱۳۹-۱۴۰۔

جاتی ہو تو فقہی و سیاسی بصیرت کو معیار بنایا جائے۔

نظریہ ولایت مطلقہ: ولایت فقیہ کے سلسلہ میں دو بنیادی نظریہ پائے جاتے ہیں۔

الف: ایک نظریہ کے مطابق ولایت فقیہ کے اختیارات کا دائرہ پیغمبر اسلام (ص) اور ائمہ معصومین (ع) کی حکومت کی طرح وسیع ہے اور ولی فقیہ ملکی قیادت کے لئے تمام امور میں مداخلت کا حق رکھتا ہے[۱]۔

ب: اس کے برخلاف کچھ لوگ ولایت فقیہ کے دائرہ اختیارات کو محدود مانتے ہیں جیسے ایسے مال میں تصرف جس کے مالک کا پتہ نہ ہو یا بے سرپرست بچے کی حضانت وغیرہ۔ ان لوگوں کا ماننا ہے کہ فقیہ اپنے دائرہ اختیارات کو وسیع نہیں کر سکتا ہے[۲]۔

دوسری طرف ولایت مطلقہ فقیہ کا موضوع کوئی نیا موضوع نہیں ہے جسے صرف امام خمینی (رہ) نے پیش کیا ہو۔ غیبت کے دور میں امام زمانہ (عج) کی طرف سے فقیہ کی نیابت کے موضوع کو پہلی بار شیخ مفید نے پیش کیا۔ ان کے بعد کے شیعہ فقہا نے ولی فقیہ کے اختیارات کو وسعت بخشا ہے۔ ان میں سے اکثر بزرگوں نے اصل ولایت فقیہ کو مسلّم جانا ہے اور ولی فقیہ کے حدود اختیارات کے دلائل کو جانچنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غیبت کے دور میں فقیہ نیابت عامہ، ولایت عامہ اور ولایت مطلقہ کا مالک ہے۔ امام خمینی (رہ) نے ولایت فقیہ کے باب میں کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا ہے بلکہ زمانے کی ضرورتوں کے مد نظر انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ جو کچھ کتاب البیع اور ولایت فقیہ میں تحریر فرمایا ہے اس میں ولی فقیہ کے اختیارات کو بیان کرکے موضوع کو اور واضح کر دیں[۳]۔

امام خمینی (رہ) کے نظریہ ولایت فقیہ کے مطابق ولائی قیادت کا ایک سلسلہ مراتب ہوتا ہے جس کی رو سے اصل حاکمیت اللہ تعالی کی ذات سے مخصوص ہے اور پھر یہ حاکمیت اللہ تعالی کے ذریعہ انبیائے الہی اور ان کے جانشینوں کے سپرد کی جاتی ہے[۴]۔ اسی طرح پیغمبر اسلام (ص) کی وفات کے بعد حاکمیت ائمہ معصومین (ع) کے حوالہ کی گئی ہے اور آخری امام (عج) کی غیبت کے دور میں شائستہ فقہا آنحضرت کی نیابت عام

---

۱. مزینانی، محمد صادق، ولایت مطلقہ فقیہ از دیدگاہ امام خمینی و قرائت ہای گوناگون، حوزہ، شمارہ ۸۵ و ۸۶، ص ۱۷۔
۲. ایضاً۔
۳. ایضاً، ص ۱۹۔
۴. علم الہدی، جمیلہ، نظریہ اسلامی تعلیم و تربیت، ص ۲۱۱۔

میں ولی فقیہ کے عنوان سے امت اسلامی اور اسلامی معاشرہ کی سیاسی قیادت کے ذمہ دار ہیں۔

امام خمینی(رہ) اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ زمانہ غیبت میں اگرچہ کسی خاص فرد کو زمام حکومت نہیں سونپی گئی ہے لیکن چونکہ امر حکومت اسلامی معاشرہ کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے لہٰذا عقل کی تشخیص اور نقل کی رہنمائی کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دور غیبت میں حکومت اور ولایت اسلامی کا برقرار رہنا بہت ضروری ہے۔اس نکتہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ اسلامی حکومت قانون پر مبنی ہوتی ہے اور وہ بھی قانون الٰہی لہٰذا اس حکومت کے ذمہ دار کے لئے قانون سے مکمل واقفیت اور عادل ہونا بہت ضروری ہے۔ امت اسلامی کی سرپرستی اور ولایت، فقیہ عادل سے متعلق ہے اور وہی مسلمانوں کی رہبری و قیادت کے لئے مناسب ہے کیونکہ حاکم اسلامی کو فقہ و عدالت سے متصف ہونا ضروری ہے یعنی اسلامی حکومت کی تشکیل فقہائے عادل کے لئے واجب کفائی ہے[۱]۔

اس موضوع میں اہم نکتہ یہ ہے کہ حکومت سے متعلق پیغمبر اسلام(ص) اور ائمہ معصومین(ع) کو جو ذمہ داریاں اور اختیارات دئے گئے ہیں وہ سب فقہائے عادل کے لئے بھی ثابت ہیں[۲]۔ پیغمبر اسلام(ص) اور ائمہ معصومین(ع) کے اختیارات کا ایک ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ فضیلت کے لحاظ سے بھی فقہا پیغمبر اسلام(ص) اور ائمہ معصومین(ع) کے برابر ہیں۔امام خمینی(رہ) نے اپنی کتاب البیع اور ولایت فقیہ میں اس نکتہ پر تاکید کی ہے کہ فقہاء کے حکومتی اختیارات کا پیغمبر اسلام(ص) اور ائمہ معصومین(ع) کے اختیارات کے برابر ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ان کا معنوی مقام بھی یکساں ہے اور یہ دونوں خلافت عرض میں نہیں ہے[۳]۔

امام خمینی(رہ) ولایت مطلقہ فقیہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حکومت رسول خدا(ص) کی ولایت مطلقہ کا ایک شعبہ ہے اور احکام اولیہ میں سے ہے اور تمام فرعی احکام جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ پر مقدم ہے اور حکومت کسی امر کو چاہے وہ عبادی ہو یا غیر عبادی، اگر مصالح اسلام کے خلاف ہے تو روک سکتی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ان اختیارات کی وجہ سے مزارعہ، مضاربہ وغیرہ ختم ہو جائیں گے تو میں صریحا یہ کہتا ہوں

---

۱. موسوی الخمینی، روح اللہ، شون واختیارات ولی فقیہ، ص ۱۱۔
۲. ایضاً۔
۳. ایضاً۔

کہ بالفرض ایسا ہوتا بھی ہے تو یہ حکومت کے اختیارات میں سے ہے بلکہ اس سے بڑھ کر بھی مسائل ہیں[۱]۔

امام خمینی(رہ) کی نظر میں فقیہ کی ولایت مطلقہ قوانین الہی کے دائرہ میں ہے۔ سنہ ۱۳۵۸ میں آئین اور اصل ولایت فقیہ کے پاس ہونے کے بعد اس ضمن میں آپ نے فرمایا: سبھی لوگ جیسے پیغمبر اسلام(ص)، فقیہ و غیر فقیہ قانون کی حاکمیت میں ہیں[۲]۔

ان کے نظریہ کے مطابق اسلام ایسی حکومت کا بانی ہے جس میں نہ تو استبدادی حکومت ہے اور نہ ہی مشروطہ اور جمہوری طریقہ جو ایسے قوانین پر مشتمل ہو جسے معاشرہ کے کچھ لوگوں نے بنایا ہو بلکہ ایسی حکومت ہے جو وحی الہی سے ملہم اور قوانین الہی پر مشتمل ہے[۳]۔

امام خمینی کی نظر میں ولایت مطلقہ فقیہ مصلحت عمومی کا مقید ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں مسلمانوں اور جامعہ بشری پر حکومت کرنے والے کے لئے لازم ہے کہ وہ عام لوگوں کے مفاد کو مد نظر رکھے اور ذاتی جذبات سے کام نہ لے۔ حاکم اسلامی مختلف موضوعات میں مسلمانوں کی مصلحت کے مطابق عمل کر سکتا ہے اور اسے ہر گز استبداد نہیں کہا جاسکتا ہے بلکہ یہ اسلام و مسلمین کی مصلحت کے مطابق ہے[۴]۔ امام خمینی کی نظر میں ولایت فقیہ کنٹرول اور نظارت کے معنی میں ہے نہ کہ شخص حاکم کی حکومت[۵]۔

شیعہ فقہا میں ولی فقیہ کے اختیارات کے سلسلہ میں تین نظریے پائے جاتے ہیں:

الف: پہلا نظریہ فقیہ کو امور حسبیہ میں تصرف کا حق دیتا ہے لیکن اس سلسلہ میں اس کے لئے کسی ولایت کا قائل نہیں ہے۔ ان دونوں اصطلاح یعنی جواز تصرف اور ولایت بہ تصرف میں یہ فرق ہے کہ پہلی صورت میں فقیہ کا وکیل اس کی موت کے بعد عزل ہو جاتا ہے جب کہ دوسری صورت میں فقیہ کی موت کے بعد اس کا وکیل معزول نہیں ہوتا ہے۔

ب: دوسرا نظریہ فقیہ کے لئے امور حسبیہ میں تصرف کے سلسلہ میں ولایت کا قائل ہے لیکن اس کے

---

۱. صحیفہ نور، ج۱۰، ص ۵۳۔
۲. ایضاً، ص ۵۳۔
۳. شئون واختیارات ولی فقیہ، ص ۲۰-۲۱۔
۴. ایضاً، ص ۲۱۔
۵. صحیفہ نور، ج۱۸، ص ۲۰۶۔

ساتھ ساتھ اس بات کا بھی قائل ہے کہ ولایت عامہ یعنی اسلامی ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور دفاع، اجرای حدود، خمس و زکات لینا اور اقامہ نماز جمعہ فقیہ کے لئے ثابت نہیں ہے[۱]۔

ج: تیسرا نظریہ فقیہ جامع الشرائط کے لئے امت اسلامی اور حکومت سے متعلق تمام امور میں ولایت کا قائل ہے۔ امام خمینی اور بہت سے دوسرے فقہا اسی نظریہ کے قائل ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق حکومتی امور کے سلسلے میں پیغمبر اسلام(ص) و ائمہ معصومین(ع) اور فقیہ میں کوئی فرق نہیں ہے لہٰذا ائمہ معصومین(ع) کی طرح ولی فقیہ بھی اقامت نماز جمعہ، اجرائے حدود، انعقاد صلح، خمس و زکات لینے، مجورین اور وقف کی سرپرستی یا کلی طور پر اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے ذمہ دار ہے۔

اس نظریہ کے مطابق حکومت کے سارے امور فقیہ جامع الشرائط کی ولایت میں ہیں لہٰذا اس نظریہ کو ولایت مطلقہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی اسے ولایت عامہ بھی کہتے ہیں[۲]۔

ولایت، آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں

آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں ولایت نبوت سے جدا نہیں ہے بلکہ اسی کا ایک حصہ ہے اور حقیقت میں ولایت نبوت کا خاتمہ اور تتمہ ہے اور اگر ولایت نہیں ہوگی تو نبوت ناقص رہے گی[۳]۔

آپ نے اپنے بیانات میں ہمیشہ اس بات پر تاکید کی ہے کہ ولایت اتصال، تعلق، محبت اور معنوی اتصال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: قرآن کی اصطلاح میں ولایت یعنی اتصال اور ہم بستگی، ایسے لوگوں کا گروہ جن کی فکر ایک فکر ہے، جن کا مقصد ایک ہے، جو ایک راستہ پر چل رہے ہیں اور ایک مقصد کے حصول کے لئے تلاش کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے قریب ہونا چاہئے اور دوسرے لوگوں سے انھیں الگ ہونا چاہئے تاکہ وہ ختم نہ ہونے پائیں اور اسی کو اصطلاح قرآنی میں ولایت کہتے ہیں[۴]۔

---

۱. مفہوم اطلاق در ولایت مطلقہ فقیہ، فصلنامہ علوم سیاسی، شمارہ ۲، ص ۸۷۔
۲. ایضاً۔
۳. حسینی خامنہ ای، سید علی، طرح کلی اندیشہ اسلامی در قرآن، ص ۵۱۶۔
۴. ایضاً۔

آپ کی نظر میں ولایت روحی، فکری اور عملی اتصال ہے۔ ولایت خدا اور ولایت ائمہ دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ ولایت ائمہ اور ولایت پیامبر دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ سب ایک ہے۔ ولایت یعنی دو چیزوں میں ایسا اتصال اور تعلق کہ انہیں آسانی سے الگ نہ کیا جاسکے۔ اگر ہمارے اور ائمہ، ہمارے اور خدا اور ہمارے اور پیغمبر (ص) کے مابین تعلق پیدا ہوگیا تو یہی ولایت ہے۔

آپ اس سلسلہ میں مزید فرماتے ہیں: ولایت کا اصل معنی و مفہوم دو چیزوں کا ایک دوسرے سے قریب ہونا ہے۔ لغت میں ولایت کے جتنے بھی معنی بیان ہوئے ہیں جیسے محبت، قیمومیت وغیرہ، ان سب میں دو چیزوں میں ایک طرح کی قربت پائی جاتی ہے۔ مثلا ولایت محبت کے معنی میں ہے کیونکہ محب و محبوب میں معنوی تعلق پایا جاتا ہے اور ان کو ایک دوسرے جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔

ولایت سے متعلق آیت اللہ خامنہ ای کے بیانات کو مد نظر قرار دیتے ہوئے ولایت فقیہ کی اس طرح تعریف کی جاسکتی ہے کہ یہ تعلق وارتباط محبت و دوستی کی بنیاد پر ہے اور دو طرفہ قلبی تعلق ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای نے فرد اور معاشرہ کو مد نظر رکھتے ہوئے ولایت کی تشریح کی ہے۔ ہم یہاں پر پہلے ولایت کے انسانی پہلو کے سلسلہ میں آپ کے نظریات کو پیش کریں گے۔

ولایت یعنی ولی سے انسان کا زیادہ سے زیادہ فکری و عملی تعلق ہو۔ اس کے لئے سب سے پہلے ولی کو تلاش کرنا ہوگا، ولی خدا کو پہچاننا ہوگا، ایسا شخص جو اسلامی معاشرہ کا ولی حقانی ہے، اس کا تعیین کرنا ہوگا اور اپنی فکر، عمل اور شخصیت کو اس سے متصل کرنا ہوگا اور اس کے نقش قدم پر چلنا ہوگا۔

آپ معاشرہ میں ولایت کی اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں: ولی معاشرہ کے مختلف گروہوں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے، وہ ایک ایسا محور ہوتا ہے جس کے گرد سبھی جمع ہوتے ہیں، ایک ایسا مرکز جہاں سے سارے احکام جاری ہوتے ہیں اور قانون کا نفاذ ہوتا ہے، سب اسی کو دیکھتے ہیں اور سبھی اسی کے پیچھے چلتے ہیں۔ ولی میر کاروان ہوتا ہے۔

آیت اللہ خامنہ ای قرآنی آیتوں کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ولایت صرف خدا کے لئے ہے اور اس لحاظ سے ولایت کی دو قسمیں ہیں، ولایت خدا اور ولایت غیر خدا یعنی ولایت طاغوت۔ اسلامی معاشرہ میں اللہ تعالی کی ولایت حاکم ہے اور یہ ولایت محبت و ایمان کے ہمراہ ہے اور غیر خدا کی ولایت سے مختلف ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

قرآن کریم نے ولایت خدا کے علاوہ دوسری ولایتوں کو ولایت طاغوت کے عنوان سے یاد کیا ہے۔ اگر انسان ولایت خدا پر عقیدہ نہیں رکھتا تو وہ ولایت طاغوت پر ہے۔ اسلامی معاشرہ کی معنویت اسی ولایت خدا کی وجہ سے ہے۔ یہ ولایت عالم سیاست میں بھی نافذ ہے اور اسی وجہ سے اسلامی نظام میں حکومت محبت و ہمدلی، وحدت اور عوامی مشارکت سے تشکیل پاتی ہے اور اسی ولایت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نظام اسلامی ہے۔

ولایت فقیہ کے اختیارات آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں

آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں ولی فقیہ کے اختیارات کے موضوع پر گفتگو کرنے سے قبل یہ بہتر ہے کہ ولی فقیہ کے سلسلہ میں آپ کے نظریات بیان ہوں۔ آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں ولایت و حکومت کا حق صرف اللہ تعالی کو حاصل ہے اور یا جسے وہ معین کرے۔ دوسرے فقہا کی طرح آپ کی نظر میں بھی انسان پر حکومت کرنے کے لئے سب سے پہلا حق اللہ تعالی، پھر پیغمبر اسلام(ص)، پھر ائمہ معصومین(ع) اور زمانہ غیبت میں فقیہ عادل کا ہے۔

آپ فرماتے ہیں: صرف اللہ تعالی لوگوں کو حکم دے سکتا ہے اور وہ انسانوں کی مصلحت کے اعتبار سے یہ حق کسی کو بھی عطا کر سکتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خدا کا کوئی بھی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا ہے۔ وہ پیغمبر کا تعین کرتا ہے، وہ امام کا تعین کرتا ہے اور امام کے بعد ایسے لوگوں کا تعین کرتا ہے جن میں کچھ خاص معیار اور صلاحیتیں ہوتی ہیں، یعنی جن لوگوں میں یہ صفات پائی جائیں گی وہ لوگ پیغمبر اور ائمہ کے بعد اسلامی معاشرہ پر حاکم ہونگیں۔ ولی کا انتخاب خدا کرتا ہے۔ وہ خود ولی ہے، اس کا پیغمبر ولی ہے، امام ولی ہے اور وہ لوگ ولی ہیں جو کچھ خاص معیاروں پر پورے اترتے ہوں[1]۔

آپ نے ولی فقیہ کو امام کے عنوان سے یاد کیا ہے اور ولی فقیہ کے انتخاب کے سلسلہ میں فرمایا ہے کہ اگر معاشرہ کی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے اور دشمنوں کے مقابلہ میں متحد رہنا ہے تو ہمیں مرکزی طاقت کی ضرورت ہے۔ اسلامی معاشرہ کو ایک دل کی ضرورت ہے، ایک قلب کی ضرورت ہے۔ البتہ اس کے لئے کچھ شرائط ہیں۔ اس کا عالم ہونا ضروری ہے، فیصلہ لینے کی اس میں صلاحیت ہونی چاہئے، اسے دور اندیش ہونا چاہئے، اللہ کی راہ میں اسے کسی چیز کا خوف نہیں ہونا چاہئے اور وقت آنے پر خود کو قربان کر سکتا ہو۔ ایسے

---

۱. طرح کلی اندیشہ اسلامی در قرآن، ص ۵۸۳۔

شخص کو امام کہا جاتا ہے۔ امام یعنی وہ حاکم و پیشوا جو خدا کی طرف سے معاشرہ میں معین ہوتا ہے۔ اللہ تعالی یا تو نام و نشان سے کسی کا تعین کرتا ہے جیسے پیغمبر یا امام کا تعین اور یا صرف نشانیاں بیان کرتا ہے جیسے وہ فقیہ جو امام منصوص کا جانشین ہوتا ہے۔ ایسا فقیہ خود امام ہے جس کا تعین نام سے نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔ جس پر یہ نشانیاں منطبق ہو نگیں وہ امام ہوگا۔ امام یعنی حاکم، پیشوا، یعنی ایسا شخص جس کے پیچھے لوگ چلیں، اس کا تعین اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، اسے عادل ہونا چاہئے، منصف ہونا چاہئے، دیندار ہونا چاہئے، اس کی قوت ارادی مضبوط ہونی چاہئے۔ ولایت قرآنی کی رو سے وجود امام واجب ہے[۱]۔

ولایت کا دوسرا پہلو قوم کے لوگوں سے اس کا مضبوط تعلق ہے۔ یعنی ہر حال میں اور ہمیشہ اس قلب امت سے لوگوں کا تعلق ہو، فکری تعلق بھی اور عملی تعلق بھی۔ یعنی اس کو اپنا سر مشق بنانا اور افعال و کردار میں اس کی پیروی کرنا۔ آیت اللہ خامنہ ای کے بیانات کے ذریعہ ولایت فقیہ کے متعلق آپ کے نظریات معلوم ہوتے ہیں جنہیں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

۱. **ولایت فقیہ یعنی ولایت الہی کا استمرار**: آیت اللہ خامنہ ای ولایت فقیہ کو ایک الہی منصب مانتے ہوئے اس بات پر تاکید کرتے ہیں کہ دور غیبت میں حکومت فقیہ جامع الشرائط یا ولی فقیہ سے مخصوص ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ غیبت کبری کے دور میں ادلہ عقلی نیز ادلہ اسلامی و شرعی کی رو سے یہ ولایت و حاکمیت دین شناس، عادل، بصیر اور فقیہ فرد کے ذمہ ہے اور یہ ولایت الہی اور حکومت الہی سے متعلق ہے۔ آج اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حکومت کے لئے سب سے مناسب فرد فقیہ جامع الشرائط ہے اور فرق اسلامی میں اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور سب اس بات کو مانتے ہیں کہ اگر اللہ کی طرف سے منصوب ولی موجود نہیں ہے تو اس منصب کے لئے سب سے مناسب وہی ہے جو اسلامی معیاروں سے سب سے زیادہ قریب ہو یعنی فقیہ جامع الشرائط، عادل، ہوائے نفس کی مخالفت کرنے والا، زمانہ کے حالات سے آگاہ و بصیر اور مدیر و مدبر یعنی وہی فرد جو اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین میں ولی فقیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

---

۱. ایضاً، ص ۵۴۵-۵۴۴۔

۲. **ولایت فقیہ احکام اسلامی کو نافذ کرنے والا:** اسلامی معاشرہ میں احکام کے نفاذ کی ذمہ داری ولی فقیہ پر ہوتی ہے لہٰذا اسلامی قوانین سے اسے واقفیت ہونی چاہئے اور اسے عادل بھی ہونا چاہئے۔ آپ فرماتے ہیں: جس معاشرہ میں لوگ اللہ تعالی کو مانتے ہیں ایسے معاشرہ میں اسلامی حکومت ہونی چاہئے اور اس حکومت کو سنبھالنے کے لئے سب سے مناسب فرد میں دو صفتیں ہونی چاہئے۔ پہلی صفت یہ کہ اسے اسلامی شریعت اور اسلامی فقہ کا سب سے زیادہ علم ہونا چاہئے اور دوسری صفت یہ کہ اس فرد میں ایسی ملکہ ہو کہ وہ خود کو گناہ اور خطائے عمد سے محفوظ رکھ سکے یعنی وہی صفت جسے اسلامی تہذیب میں عدالت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں صفات ایسے شخص کی ہیں جو اسلامی احکام کو نافذ کرنا چاہتا ہے۔ ایران کے آئین میں اسے ولایت فقیہ کا عنوان دیا گیا ہے۔ یہ نظام ہمارے آئین اور معاشرہ پر حاکم ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای ولی فقیہ کے لئے تین صفتیں بیان کرتے ہیں: فقاہت، عدالت اور درایت۔

۳. **ولایت فقیہ ایک ترقی یافتہ حکومتی نظام:** آیت اللہ خامنہ ای نہ صرف ولایت فقیہ کو فقہ شیعہ کے مسلمات میں سے مانتے ہیں بلکہ دوسرے حکومتی نظاموں پر اس کی برتری کے بھی قائل ہیں۔ قیادت یا ولایت فقیہ آج کا سب سے ترقی یافتہ سیاسی اور سماجی مسئلہ ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ولایت فقیہ صرف مدارس علمیہ کے لئے ہے لیکن ایسا نہیں ہے، ولایت فقیہ آج کے دور کا سب سے زیادہ مترقی حکومتی نظام ہے۔ ولایت فقیہ یعنی ایسے فرد کی حکومت جو معاشرہ پر حاکم آئیڈیالوجی کو سب سے بہتر جانتا ہو۔

۴. **ولایت فقیہ یعنی دین شناسوں کی حکومت:** آیت اللہ خامنہ ای فقیہ کی خصوصیات کی بنیاد پر ولایت فقیہ پر مبنی حکومتی نظام کو دوسرے نظاموں سے مقابلہ کرتے ہوئے اسے ایک بہتر نظام کے طور پر مانتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں: ولایت فقیہ معاشرہ میں ایک نظم ہے، یہ ایک نظام ہے، ولایت فقیہ یعنی اسلامی دانشوروں کی حکومت۔ ولایت فقیہ یعنی دین شناسوں کی حکومت۔ حکومت سے مراد یہ نہیں ہے کہ صدر یا وزیر اعظم ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جو آخری فیصلہ لیتا ہے اسے فقیہ ہونا چاہئے، صدر کو بھی وہی تنفیذ کرتا ہے اور دوسرے امور بھی۔

۵. **ولایت فقیہ ایک اسلامی عوامی حکومت:** آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں اسلامی عوامی حکومت کی سب سے اہم خصوصیت ولایت فقیہ ہے۔ ایک عوامی اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے ولایت فقیہ کی طرف

توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

۶. **ولایت فقیہ اسلام کے مسلمات میں سے ہے**: امام خمینی اپنی کتاب ولایت فقیہ میں تحریر کرتے ہیں کہ ولایت فقیہ ان موضوعات میں سے ہے جن کا تصور ہی تصدیق کا باعث ہے اور اس کے اثبات کے لئے کسی برہان کی ضرورت نہیں ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای بھی ولایت فقیہ کو اسلام کے مسلّمات میں شمار کرتے ہیں اور تاکید فرماتے ہیں کہ فقہا کے درمیان اصل ولایت فقیہ کے موضوع پر اتفاق نظر پایا جاتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ولایت فقیہ اسلامی فقہ کے مسلّمات میں سے ہے اگرچہ اس کے حدود یعنی توسیع و تضییق کے سلسلہ میں فقہا میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔

ولایت مطلقہ فقیہ آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں

آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں ولایت مطلقہ فقیہ کی وسعت فقہ کی وسعت کے برابر ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ فقیہ کی ولایت و حاکمیت کے حدود فقہ کے حدود کے برابر ہے۔ جس طرح اسلامی فقہ انسانی حیات کے تمام گوشوں پر حاوی ہے اور تمام سیاسی، اقتصادی، فردی اور سماجی مسائل حکم الٰہی میں شامل ہیں، بالکل اسی طرح ولی فقیہ کی حاکمیت بھی فردی، اجتماعی، سیاسی، اقتصادی، فوجی، بین الاقوامی اور دوسرے تمام امور پر ہے جو اسلامی شریعت کے دائرے میں آتے ہیں[۱]۔

آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں ولایت مطلقہ فقیہ کے اختیارات بہت وسیع ہیں اور ان اختیارات کی بنیاد پر وہ معاشرہ کے فردی و سماجی وسائل کو معاشرہ کے فلاح و بہبود کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

۱. **تزاحم احکام کی تشخیص**: تزاحم احکام کی تشخیص اور زیادہ اہم حکم کی پہچان بھی ولایت مطلقہ فقیہ کے اختیار میں ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ احکام میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں جہاں پر دو حکم ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں ان میں سے جو اہم ہے اسے فقیہ دوسرے حکم پر ترجیح دے سکتا ہے لیکن یہ کام صرف اور صرف ولی فقیہ کر سکتا ہے۔

ایسا شخص جو اسلامی فقہ کا عالم ہو اور مصالح کو بھی جانتا ہو، صرف فقیہ ہونا کافی نہیں ہے، ایسا فقیہ جو مصلحت زمانہ کو نہیں جانتا ہے، ایسا فقیہ جو ایک حکم کو دوسرے حکم پر ترجیح دینے کی جانب متوجہ نہیں ہے وہ

---

۱. حسینی خامنہ ای، سید علی، ولایت وحکومت، ص ۲۷۸۔

یہ کام انجام نہیں دے سکتا ہے۔ ایسا شخص جو ولی امت ہے، معاشرہ کا قائد ہے، فقیہ ہے، بصیر ہے، عادل ہے اور ہوائے نفس کا تابع نہیں ہے، وہ مصالح مسلمین کی جانب متوجہ رہتا ہے۔ یہ احکام ولایتی ہیں، احکام ولایتی یعنی وہ حکم جو فقیہ مصلحت کی بنیاد پر صادر کرتا ہے، یہ در حقیقت احیائے فقہ اسلامی ہے[۱]۔

۲. **اہم و مہم کا قاعدہ**: آیت اللہ خامنہ ای کے مطابق تزاحم احکام کی تشخیص کے علاوہ، قاعدہ اہم و مہم کے مطابق احکام کی تشخیص بھی ولی فقیہ کے ذمہ ہے۔ آپ تاکید کرتے ہیں کہ ولی فقیہ اپنے اختیارات کی بنیاد پر یہ طے کر سکتا ہے کہ کون عمل زیادہ اہم ہے۔

۳. **تشخیص مصلحت نظام**: آیت اللہ خامنہ ای کے مطابق اسلامی حکومت کی مصلحت کی تشخیص بھی ولایت مطلقہ فقیہ کے دائرے اختیار میں ہے یا جسے وہ اس امر کے لئے منصوب کرے[۲]۔

۴. **قوانین کا نفاذ**: آیت اللہ خامنہ ای تاکید کرتے ہیں کہ ولایت مطلقہ فقیہ قانون کا تابع ہے اور اسے استبداد و خود رائی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ ولایت فقیہ کے مطلقہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے قوانین کے نفاذ میں پورا اختیار حاصل ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ولایت مطلقہ فقیہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ مطلق العنان ہے اور جو چاہے وہ کر سکتا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے اور ولی فقیہ قانون کا پابند ہوتا ہے۔

۵. **ولایت الٰہی**: آیت اللہ خامنہ ای ولایت فقیہ کے الٰہی ہونے کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں: ولی فقیہ کی حاکمیت در حقیقت اسلامی فقہ کی حاکمیت ہے، دین خدا کی ولایت و حاکمیت ہے۔ ولایت فقیہ اقدار کی حاکمیت ہے نہ کہ کسی ایک فرد کی حاکمیت یعنی خود ولی فقیہ پر ایک فرد ہونے کے ناطے فرض ہے کہ وہ ولی فقیہ کے حکم کی پیروی کرے۔ ولایت فقیہ ولایت الٰہی ہے، ولایت پیغمبر ہے اور وہی امر جو پیغمبر سے اوصیائے معصوم تک اور اوصیائے معصوم سے علمائے امت یا فقہائے امت تک پہنچتی ہے لہٰذا اسے وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں ولی فقیہ کو پیغمبر اسلام (ص) اور ائمہ معصومین (ع) کے اختیارات حاصل ہیں۔ ولایت فقیہ ایک حقوقی شخصیت ہے اور وہ شخص جو حقیقی طور پر اس منصب پر فائز ہے اسے ولی فقیہ کی حقوقی شخصیت کے تابع ہونا چاہئے۔

---

۱. ایضا، ص ۲۸۱۔
۲. ایضاً، ص ۲۸۲-۲۸۳۔

۶. **ولایت مطلقہ فقیہ اور استبداد میں فرق**: آیت اللہ خامنہ ای ان لوگوں کے جواب میں جو ولایت مطلقہ فقیہ اور استبداد کو ایک ہی مانتے ہیں، فقیہ کے عادل ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: دشمنان اسلام ولایت مطلقہ فقیہ کو استبداد سے جوڑتے ہیں لیکن اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ولی فقیہ عادل ہوتا ہے اور اگر وہ عادل ہے تو مستبد نہیں ہو سکتا اور اگر مستبد ہے تو عادل نہیں ہو سکتا۔

منابع

۱. ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، دار الاحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۸۔
۲. ارسطا، محمد جواد، مفہوم اطلاق در ولایت مطلقہ فقیہ، فصلنامہ علوم سیاسی، ش ۲، سال اول، ۱۳۷۷۔
۳. آذری قمی، احمد، ولایت فقیہ از دیدگاہ فقہای اسلام، موسسہ مطبوعاتی دار العلم، قم، ۱۳۷۱۔
۴. جوادی آملی، عبد اللہ، ولایت فقیہ، ولایت فقاہت و عدالت، اسراء، قم، ۱۳۹۱۔
۵. حسینی، خامنہ ای، سید علی، طرح کلی اندیشہ اسلامی در قرآن، صبا، تہران، ۱۳۹۲۔
۶. حسینی، خامنہ ای، سید علی، ہدیہ الہی، مشخصہ ہای حکومت اسلامی وولایت فقیہ، مؤسسہ فرہنگی قدر ولایت، تہران، ۱۳۸۷۔
۷. حسینی، خامنہ ای، سید علی، ولایت وحکومت، صبا، تہران، ۱۳۹۱۔
۸. حقیقت، سید صادق، بررسی و نقد نظریہ ہای دولت در فقہ شیعہ، فصلنامہ علوم سیاسی، ش ۴۸، زمستان ۱۹۱-۱۹۴۔
۹. کعبی، عباس، بررسی تطبیقی مفہوم ولایت مطلقہ فقیہ، مظفر، قم، ۱۳۸۰۔
۱۰. مزینانی، محمد صادق، ولایت مطلقہ فقیہ از دیدگاہ امام خمینی وقرائت ہای گوناگون، حوزہ، بہار، شمارہ ۸۵-۸۶، ۱۳۷۷۔
۱۱. معرفت، محمد ہادی، ولایت فقیہ از دیدگاہ شیخ انصاری و آیت اللہ خوئی، اندیشہ حوزہ، شمارہ ۱۷، ۱۳۷۵۔
۱۲. بحر العلوم، محمد بن محمد، بلغۃ الفقیہ، ج ۳، منشورات مکتبہ الصادق، تہران، ۱۳۶۲۔
۱۳. . موسوی الخمینی، روح اللہ، ولایت فقیہ، عروج، تہران، ۱۳۹۰۔
۱۴. موسوی الخمینی، روح اللہ، صحیفہ امام، موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، جلد ۱۰، ۱۸، ۲۰، تہران، ۱۳۷۸۔
۱۵. . موسوی الخمینی، روح اللہ، شؤون و اختیارات ولی فقیہ، وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی، تہران، ۱۳۶۵۔

امام خمینیؒ اور آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای کی نظر میں

اسلامی تمدن کا احیاء

مولف: مہدی دنگچی
مترجم: بنت زینب خان

اسلامی انقلاب کے قائد عظیم الشان آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کے مطابق اسلامی انقلاب کے تمام مقاصد جیسے آزادی، استقلال، اسلامی حکومت کا قیام یا ظالمین و مستکبرین سے مقابلہ کرنے کو اسلامی تمدن سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس سے اسلامی تمدن کے احیاء کے مقولہ کی اہمیت و ضرورت بخوبی واضح ہوتی ہے۔ اسی لئے ہم امام خمینیؒ اور آیت اللہ خامنہ ای کے نظریات کا تحقیقی جائزہ لے رہے ہیں تاکہ اس موضوع کے تمام پہلوؤں کو ان کے تمدنی کردار کی روشنی میں بیان کرسکیں۔ دور حاضر کے اسلامی معاشرہ کی ہدایت میں امام خمینی اور آیت اللہ خامنہ ای کی سیاسی واجتماعی مقام و منزلت کو مد نظر رکھتے ہوئے، اسلامی تہذیب پر گفتگو کرنے کے لئے دوسرے صاحب نظر حضرات میں سے انہیں دو شخصیتوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ آپ کے تمام نظریات کو مندرجہ ذیل چار حصوں میں پیش کیا گیا ہے:

اسلامی تمدن کے احیاء کے عملی راستے، ضرورتیں، آیندہ نگری اور وہ مخالفین جو اسلامی تمدن کے احیاء کے لئے مشکلات اور خطرات ایجاد کرتے ہیں۔ محرر کے عقیدہ کے مطابق اسلامی تمدن کے احیاء کے سلسلے میں امام خمینیؒ اور رہبر معظم کی توضیحات اور وہ عملی راستے جو اس سلسلے میں انہوں نے پیش کیا ہے، ان حضرات کے نزدیک تمدن کے تہذیبی و نظری مفہوم کا نتیجہ ہے۔

حضرت علی(ع) نے اسلامی حکومت کے اصلی نسخے کو دنیا والوں کے سامنے پیش کیا اور کئی صدیوں کے گذر جانے کے بعد دور حاضر میں ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی سے آخرکار اسلامی حکومت کا خواب پورا ہوا۔ اس سیاسی اور سماجی واقعہ نے نہ صرف ایرانی معاشرہ کو نئے راستے پر کھڑا کردیا بلکہ دوسرے اسلامی

معاشروں اور قوموں کے سامنے بھی نیا دریچہ وا کر دیا جس کے سبب دور حاضر میں اسلامی حکومت کے قیام کے لئے اسلامی ممالک میں کوششیں تیز ہو گئی ہیں۔ ایک ایسی حکومت جس میں تمام مسلمان شریک ہوں اور اسلامی قوانین نافذ ہوں۔

اسلامی تمدن کی تشکیل کے سلسلہ میں رہبر معظم کی مکرر تاکید خصوصاً ماضی قریب کے دس سالوں میں، اسلامی تمدن کے احیاء کی ضرورت کو روشن کر رہا ہے۔ اس ضرورت پر دو اعتبار سے تحقیقی نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ پہلا، دنیائے اسلام کے داخلی مسائل کے اعتبار سے۔ ترقی یافتہ تمدن سے استفادہ کرنے کے لئے امت مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ نئے اسلامی تمدن کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرے۔

دوسرا، دنیائے اسلام کے بیرونی مسائل کے اعتبار سے۔ غرب کا مادی تمدن جو اسلامی تمدن کا اصلی رقیب ہے، اس سے مقابلہ کے لئے ضرورت ہے کہ اپنے مقصد کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں، لہٰذا اس تحقیقی تحریر میں ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ایران کے اسلامی انقلاب کے رہبروں کی نظر میں اسلامی تمدن کو زندہ کرنے کے کیا کیا طریقے ہیں۔

اسلامی تمدن

اکثر محققین جنہوں نے اسلامی تمدن کے بارے میں قلم فرسائی کی ہے وہ اس مقولہ کی دو تعریف کرتے ہیں: اول، وہ تعریف جو صدر اسلام سے لے کر دور حاضر تک کے اسلامی تمدن کی تاریخ میں تحول و دگرگونی کے مراحل کو بیان کرتی ہے۔ اس قسم کی تعریف اسلامی تمدن کے مصادیق اور اس کے حقائق کو نظر میں رکھتے ہوئے ایک تاریخی تجربہ کے عنوان سے بیان ہوتی ہے۔ دوم، وہ تعریف جو اسلامی تمدن کو ایک علمی اصطلاح تسلیم کرتی ہے اور اس مفہوم کے نظریاتی پہلوؤں پر محققانہ نظر ڈالتی ہے اور اس کے معیار وانتزاع کو بیان کرتی ہے۔ ہم بھی اس تحقیق میں اسی قسم کی تعریف کو بیان کرنے کی کوشش میں ہیں اور اسلامی تمدن کو ایک تاریخی تجربہ کے عنوان سے تجزیہ کرنے کو تمدن کے بارے میں کی جانے والی دوسری تحقیقات پر چھوڑ رہے ہیں۔

اسلامی تمدن کی اصطلاح اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ جو چیز میرے مطالعہ کے دائرے میں آتی ہے وہ دو چیزیں ہیں ایک تمدن اور دوسرے اسلامی۔ مطالعہ کا موضوع تمدن ہے، یعنی ایک ایسا عظیم معاشرتی

نظام جس کے دو اساسی رکن ہیں: معین جہان بینی اور مشخص تاریخی نظام۔ اسلامی تہذیب بھی دوسری تہذیبوں کی طرح ایک معین جہان بینی پر مبنی ہے جو اپنے زیر نظر کام کرنے والے تمام نظام کو شکل و صورت عطا کرتی ہے اور ان کا حد و مرز معین کرتی ہے۔ ایسی عظیم عقلانیت اور مبنا کہ زیر نظر کام کرنے والے دوسرے نظام کی صورت و سیرت اسی سے متاثر ہے اور ایک ایسا تاریخی نظام جو ہر دور کے سیاسی و معاشرتی شرائط کے پیش نظر دوسرے ادوار سے مختلف ہوگا۔

اسی طرح ہمارے مطالعہ کا موضوع اسلامی ہے۔ وہ اسلام جو آخری دین کے عنوان سے انسان کی زندگی کے تمام مراحل چاہے وہ فردی ہوں یا اجتماعی سب کو نظر میں رکھتا ہے۔ ایسا دین جس کی تعلیمات کتاب و سنت کے احکامات کا ماحصل ہے۔ ایسی کتاب جو وحی الٰہی اور سنت پر مبنی اور پیغمبر اکرم (ص) کی یادگار ہے۔

امام خمینی اور احیائے تمدن اسلامی

امام خمینی اسلامی تمدن کے مقولے کی تحقیق کے بارے میں اکثر اسلامی تمدن کی گذشتہ تاریخ کو سند کے طور پر پیش کرتے ہیں اور تمدن کو عملی جامہ پہنانے میں صدر اسلام کے مسلمانوں کے پچاس سالہ تجربہ کو نمونہ قرار دیتے ہیں۔ آپ دور حاضر میں دوسری قوموں سے مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کو صدر اسلام کے مسلمانوں کے تمدن سے دوری اختیار کرنے کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور پوری امت مسلمہ کو حقیقی اسلامی تمدن کو زندہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ایران کے اسلامی انقلاب کے بانی کے تمام تمدنی نظریات کی بنا تہذیب ہے۔ امام خمینی اسلام کے گذشتہ تمدن کی تحقیق میں بجائے اس کے کہ اس تمدن کے عینی وجوہات اور اس کے معاشرتی نظام کی جانب توجہ دیں، اس تمدن کے عقلانی وجوہات اور مسلمانوں کی تہذیب کی جانب زیادہ توجہ دیتے ہیں، یہاں تک کہ کہا جاسکتا ہے کہ امام خمینی ؒ کی نظر میں تمدن یعنی تہذیب۔ ہم نے امام خمینی کی نظر میں اسلامی تمدن کے معنی و مفہوم کے بارے میں مختصر بحث و گفتگو کی اور اب اسلامی تمدن کو زندہ کرنے کے بارے میں ان کے نظریات پر محققانہ گفتگو کی جائے گی۔

جدید اسلامی تمدن کے تحقق کے عملی راستے

ہم یہاں پر عظیم اسلامی انقلاب کے بانی امام خمینی ؒ کے نظریات کے مطابق جدید اسلامی تمدن کے تحقق کے عملی راستوں کو بیان کریں گے۔ اس حصے کے مطالعہ کے وقت شاید یہ سوال ذہن میں آے کہ اس طرح کے

نظریات و گفتگو عام ہیں اور انہیں تمدنی مباحث پر محیط نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ یاد آوری ابھی ضروری ہے کہ مصنف کی نظر میں جدید اسلامی تمدن کے وجود میں آنے کے چند مرحلے اور بہت سے مقدمات ہیں جن کا آغاز ظالم حکومتوں کے خلاف قیام کرنے سے ہوتا ہے اور حکومت کو وجود میں لانے نیز اسلامی معاشرہ کی تشکیل تک جاری رہتا ہے اور اس طرح تمدن کی سطح تک پہنچ جاتا ہے یعنی اسلامی تمدن کی ایک عام تعریف اور اس کا محقق ہونا مورد نظر ہے، لہٰذا امام خمینی یا رہبر انقلاب کے دستورات کا وہ حصہ جو کہ ان مراحل کے بارے میں ہو میری نظر میں موضوع سے مرتبط ہے۔

الف: امت مسلمہ کی وحدت کو محفوظ رکھنا

ایران کی اسلامی اور جمہوری حکومت کے عہدہ داروں مخصوصاً اسلامی انقلاب کے بانی کی نگاہ میں امت مسلمہ کے در میان ہمدلی اور وحدت کو محفوظ رکھنا اسلام کے عظیم مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کا اہم ترین و موثر ترین ذریعہ ہے اور اسلامی تمدن کو زندہ کرنا بھی انہیں عظیم مقاصد میں سے ایک ہے۔ اسلامی انقلاب کی رہبری کرنے والی شخصیات صرف امت مسلمہ کو اتحاد کی دعوت دینے والی نہیں ہیں بلکہ خود پوری امت مسلمہ کو ایک ایسا پیکر واحد سمجھتی ہیں جو اسلام اور قرآن کریم کے محور پر ایک دوسرے سے متصل ہیں۔

امام خمینیؒ تاکید کرتے ہیں کہ تمام مسلمین اگر اسلام کے احکام پر عمل کریں تو میری نظر میں وہ سب عزیز ہیں۔ ہم پوری امت مسلمہ کو جس جگہ بھی ہوں عزیز رکھتے ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ تصریح بھی کرتے ہیں کہ ایک مسلمان کا ہاتھ دوسرے مسلمان کے ہاتھ میں ہو آپس میں اتحاد کو قائم رکھیں کیوں کہ سب کہ سب مسلمان ہیں لہٰذا قرآن پر بھروسہ رکھیں اس لئے کہ اگر مسلمان متحد ہو جائیں تو کوئی ان کی کثیر تعداد کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہو سکتا اور اسی اتحاد کی صورت میں دشمن ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا اور کوئی بھی غلطی کرنے سے پرہیز کرے گا۔

ب: اسلامی معاشروں کی تہذیب کی اصلاح

اسلامی انقلاب کے بانی کی نظر میں امت مسلمہ کے حالات میں اصلاح کا بہترین عملی راستہ یہ ہے کہ اسلامی معاشروں کی تہذیب کی اصلاح ہو۔ امام خمینیؒ کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر تہذیب کی اصلاح ہو جائے تو ایک

حکومت کی اصلاح ہو جاتی ہے اس لئے کہ تہذیب ہی کی وجہ سے ایک وزیر کو وزارت ملتی ہے، تہذیب ہی کی بنا پر ایک انسان کو پارلیمنٹ میں جگہ ملتی ہے خلاصہ یہ کہ جتنے بھی حکومتی منصب ہیں وہ سب کے سب تہذیب سے متاثر ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ ایسی تہذیب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں مستقل ہوتی ہے لیکن تہذیب کی اصلاح کے لئے بھی کچھ چیزوں کا انجام دینا ضروری ہے اور معاشرے کی اسلامی تربیت ان ضروری چیزوں میں سے ایک اہم چیز ہے اس لئے کہ اگر معاشرہ مسلمان ہو جائے تو برائیوں کو روک سکتا ہے اور ان سے لڑ سکتا ہے۔ دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں شکست ناپذیر تہذیب اپنے محتوا کی وجہ سے استقلال کی خاصیت سے مستفیض ہوتی ہے۔

ج: خدا کی ذات پر ایمان

وہ مطلوب تہذیب جس کے ذریعہ اسلامی تہذیب کا احیاء ہوتا ہے اس کے عناصر میں سے ایک عنصر خدا کی ذات پر ایمان رکھنا ہے۔ امام خمینیؒ اسلامی انقلاب کی جانب اٹھائے جانے والے ایرانی عوام کے قدم کو الٰہی اور اسلامی تحریک کا نمونہ قرار دیتے ہیں کیونکہ مادی امکانات کی کمی کے باوجود، دشمنوں پر غلبہ خداوند عالم کی ذات پر ایمان رکھنے کی وجہ سے ممکن ہوا۔ خدا کی ذات پر ایمان اور اسلام نے ایرانیوں کو ایسی طاقت و قوت عطا کی کہ انہوں نے خالی ہاتھوں سے دشمن کی توپوں اور ٹینکوں کو شکست دی اور ان کے شیش محلوں کو منہدم کر دیا۔ اس بارے میں امام خمینیؒ مختلف دینی نشستوں کے انعقاد کو بالخصوص معاشرہ کے جوانوں کے لئے مفید اور ضروری جانتے ہیں، ایسی نشستیں جن میں دین کی طرف دعوت دی جائے اور دور حاضر کے مصالح و مفاسد بیان کئے جائیں۔

د: اسلامی ممالک کی مشترکہ دفاعی فوج کا قیام

امام خمینی کی نظر میں جدید اسلامی تہذیب کے تحقق کے لئے اسلامی ممالک کی مشترکہ دفاعی فوج کا قیام بہت اہم ہے۔ امام خمینیؒ کا عقیدہ ہے کہ اسلامی ممالک مسلمانوں کی پشت پناہی کے ذریعہ ایک ایسی دفاعی فوج کا ذخیرہ کر سکتے ہیں جو دس کروڑ فوجیوں پر مشتمل ہو اور وہ سب کے سب تعلیم یافتہ بھی ہوں اور اسی طرح ایک ایسی فوج جو کروڑوں پر مشتمل ہو اور سب کے سب اسلام کے پرچم تلے جمع ہوں تاکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن سکیں۔ امام خمینیؒ کو یہ امید ہے کہ اسلامی حکومتیں مذہب، قوم اور زبان سے صرف نظر

کرتے ہوئے صرف اسلام کے پرچم تلے آ کر اس بارے میں سوچیں تا کہ استکباری طاقتوں کے سامنے ذلت کے ساتھ سر جھکانے سے نجات پائیں اور آزادی و استقلال کی شیرینی کو محسوس کریں۔

جدید اسلامی تہذیب کے تحقق کی ضرورت

اسلامی ممالک کی تہذیبی حالت ان علامتوں میں سے ایک علامت ہے جو جدید اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش کو ضروری بتاتی ہے۔ دور حاضر کے اکثر اسلامی ممالک کے تہذیبی حالات کو انقلاب اسلامی سے پہلے ایران کے تہذیبی حالات سے مشابہ تصور کیا جاسکتا ہے۔ امام خمینیؒ کی نظر میں ایران کی تہذیب انقلاب اسلامی سے پہلے مکمل طور پر استکبار سے متاثر تھی اور ریڈیو، ٹی وی، میگزین اور دوسرے مواصلاتی ذرائع استکباری طاقتوں کی حمایت کی وجہ سے شہوت و بے حیائی کو رواج دے رہے تھے تا کہ جوانوں کے افکار کو مسموم کریں اور ان کے مقابلے کی قوت کو ان سے چھین لیں۔ امام خمینیؒ اس حالت کو وابستہ تہذیب سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان حالات میں مستکبرین کوشش کرتے ہیں کی تہذیب جیسی کسی چیز کو اسلامی ممالک میں رائج کریں تا کہ لوگ اعتراض نہ کریں۔ وہ الفاظ کا استعمال کرتے ہیں لیکن بغیر محتوا اور معنی کے۔

اسلامی معاشرہ میں ظلم و جور کی حاکمیت سے مقابلہ کرنا بھی ان چیزوں میں سے ہے جو جدید اسلامی تہذیب کے لئے تلاش و کوشش کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اسلامی انقلاب کے بانی اس بات کی تصریح کرتے ہیں کہ اگر امت مسلمہ ظالم حکومتوں کو برکنار کر سکتی ہے تو اسے ایسا کرنا چاہئے لیکن اگر ایسا کرنے پر قادر نہیں ہے تو ان ستمگروں کی حکومت سے رضایت کا اظہار کرنا ظلم پر راضی ہونا ہے اور لوگوں کے اموال کو غارت کرنا ہے جب کہ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہے کہ ظالم حکومت سے راضی رہے، لہٰذا یہ ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ اپنی اپنی قوت و طاقت کے مطابق ایسی حکومتوں سے جو قانون و شریعت کے خلاف عمل کرتی ہیں مقابلہ کریں۔

امام خمینیؒ ظالم حکمرانوں کی خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسلامی حکومتیں چاہے اسلامی ملک کے بادشاہ ہوں یا وزیر اعظم یا صدر مملکت سب کے سب عالمی استکبار کے تحت تاثیر ہوتے ہیں جو اسلامی دیانت داری کے مقاصد سے غافل ہیں اور انہیں اسلامی مسائل کا علم بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ چونکہ استکبار کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے ہوتے ہیں لہٰذا بشریت کے لئے اسلام کے فوائد سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔

جدید اسلامی تہذیب کے تحقق کا مستقبل

اسلامی بیداری اور احیائے تمدن اسلامی کا ایک اہم مقصد آج کے مستکبرین اور ماضی کی استعماری طاقتوں سے مسلمانوں کو نجات دلانا ہے۔ امام خمینیؒ اس بارے میں تصریح کے ساتھ فرماتے ہیں: "ہمیں مستقل رہنا ہے، ہم اپنی حکومت کو اپنے ہی لوگوں کے ذریعہ چلانا چاہتے ہیں، ہم دوسروں کے زیر اثر کام کرنا نہیں چاہتے، حکومت ہمارا سرمایہ ہے ہم نہیں چاہتے کہ دوسرے لوگ ہماری حکومت میں مداخلت کریں"۔

اسلامی بیداری کا دوسرا اہم مقصد مسلمان معاشروں میں اسلامی حکومت کو قائم کرنا ہے۔ امام خمینیؒ کی نظر میں اس طرح کی حکومتوں کی کچھ خصوصیات ہیں جیسے عدالت پر مبنی ہونا اور عوامی ہونا وغیرہ۔ مثال کے طور پر ایرانیوں کے ذریعہ لائے ہوئے انقلاب کی صفت بیان کرتے ہوئے آپ اس بات پر تاکید کرتے ہیں کہ عوام الناس ایک ایسی حکومت چاہتے ہیں جس میں اسلامی عدالت حکم فرما ہو، جو لوگوں کے درد کو سمجھے اور ان کا علاج کر سکے۔

امام خمینیؒ اسلامی بیداری کے دیگر مقاصد کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: عوام الناس کو مادی آسایش کے ساتھ ساتھ معنوی آسایش بھی فراہم ہونا چاہیے اور ان دونوں کو ساتھ ساتھ ہونا چاہیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی معنوی زندگی بھی آسایش سے بھری ہو، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اسلامی بیداری کا مقصد صرف لوگوں کے لئے گھر بنانا ہو یا پانی اور لائٹ مفت کر دی جائے یا سفر کو آسان بنا دیا جائے بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہماری معنوی زندگی باعظمت ہو اور ہم انسانیت کے مقام تک پہنچ سکیں۔

جدید اسلامی تہذیب کے تحقق کے مخالفین

اسلامی تہذیب کی طینت اور خمیر میں استعماری طاقتوں کی مخالفت پائی جاتی ہے لہٰذا ایسی تہذیب کو زندہ کرنے کی راہ میں ہمیشہ دشمنوں کے مکر و فریب اور خود باختہ اسلامی حکومتوں کی خیانتوں کا سامنا ہوتا رہا ہے اور اسی بنیاد پر اسلامی انقلاب کے بانی کی نظر میں دشمن شناسی جیسا مقولہ قابل ذکر ہے۔ امام خمینیؒ کا یہ عقیدہ ہے کہ دشمنوں نے قدیم زمانے سے ہی امت مسلمہ کے خلاف اپنی دشمنی کا آغاز کر دیا ہے اور اس دشمنی کا مقصد بھی دین اسلام سے مقابلہ کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آپ استعماری طاقتوں کی کوششوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ابتدا میں پیغمبر اکرم (ص) کی شخصیت کو مسلمانوں کے ذہن میں

مخدوش کرنا چاہتے تھے اور پھر اسلامی احکام کا رخ کیا اور کوشش کی کہ اسے گذشتہ تاریخ کا احکام قرار دیں جو کہ ایک ہزار سال پرانا ہے اور اس ترقی یافتہ دور کے نئے مسائل کا جواب نہیں پیش کر سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلام کو قدامت پرستی کا دین اور اسلاف کا دین قرار دیا۔

امام خمینی نے ہمیشہ اس بات کی تاکید کی ہے کہ زہریلی تبلیغات کا پہلا مقصد اسلامی ممالک کے جوان ہیں۔ مغربی ممالک اسلام کے خلاف اپنی تبلیغات کے ذریعہ جوانوں کو فریب دینے اور انہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تم لوگوں کی ہر بد بختی کا ذمہ دار اسلام ہے۔ امام خمینی کی نظر میں دشمنوں کے مقابلہ میں خود باختہ اسلامی حکومتوں اور غفلت کے سبب اس زہریلی تبلیغات کے لئے استکبار کا ہاتھ کھلا ہوا ہے۔

احیائے تمدن اسلامی کا سب سے بڑا دشمن خود مسلمانوں کی غفلت ہے۔ امام خمینیؒ کی نظر میں اسلام کے سیاسی اور معاشرتی مسائل سے غفلت ان تمام مصیبتوں کی وجہ ہے جو صدیوں پہلے سے اب تک مسلمانوں کے سر پر آئی ہے خصوصاً اس آخری ایک دو صدیوں میں جب اجنبی ملکوں کے ہاتھ اسلامی ممالک کی جانب بڑھے ہیں اور ان کے خداداد ذخیروں کو نابود کر دیا ہے۔

امام خمینیؒ کی نظر میں اسلام کے سیاسی اور معاشرتی پہلوؤں سے غفلت، استعماری طاقتوں اور مغربی ومشرقی جاسوسوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے جنہوں نے انفرادی اسلام کو مسلمانوں کے کمزور طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذہن میں بھر دیا اور اس کوشش میں اتنے آگے نکل گئے کہ اکثر علمائے اسلام نے یہ گمان کیا اور اب بھی یہ گمان کر رہے کہ اسلام کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور مسلمانوں کو سیاست میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ مسلمانوں کے امتیازی پہلوؤں جیسے مذہب، نسل، زبان وغیرہ پر تاکید کرنا ان امور میں سے ہے جنہیں عالمی طاقتیں مسلمانوں کے خلاف استعمال کر رہی ہیں۔ امام خمینیؒ کی نظر میں وہ چیز جس نے اسلامی حکومتوں کو بے چارہ بنادیا ہے اور قرآن کریم کے سایہ سے دور کر دیا ہے وہ نسل پرستی ہے۔ امام خمینی فرماتے ہیں کی یہ نسل پرستی بچگانہ مسالہ ہے اور ایسا معلوم ہو رہا ہے کی اسلامی حکومتوں کے سربراہوں کے ساتھ بچوں جیسا کھیل کھیلا جارہا ہے، ترک وفارس کوئی چیز نہیں ہے، عرب وعجم کوئی مسالہ نہیں ہے، مرکزی نقطہ اسلام ہے اور نسل پرستی ایک توہم ہے۔

آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای اور اسلامی تمدن کا احیاء

اس حصہ میں موجودہ اسلامی جمہوریہ حکومت کے رہنما حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کے نظریات پر تحقیقی نظر ڈالیں گے، چوں کہ اسلامی جمہوریہ حکومت نے اپنے بیس سال سے زیادہ کی عمر آیت العظمیٰ خامنہ ای کی رہنمائی میں گذاری ہے لہٰذا اسلامی انقلاب کا مقولہ مکمل طور پر ان کے نظریات سے متاثر ہے۔ انقلاب کے مفاہیم کے درمیان جس مفہوم کو انہوں نے زیادہ مورد توجہ قرار دیا ہے وہ مقولہ جدید اسلامی تہذیب ہے جو انقلاب کے ابتدائی دور ہی سے ان کی توجہ کا مرکز تھا لیکن سنہ ۱۳۸۱ ہ. ش کے آغاز سے اس سلسلہ میں اور زیادہ تاکید کرنے لگے۔ یہ مسالہ جہاں ایک طرف اس بات کی جانب اشارہ کر رہا ہے کہ انہیں اسلامی حکومت کے مستقبل کے بارے میں کتنی فکر لاحق ہے جو ان کے تہذیبی نظریات کے شکل میں ظاہر ہوتی ہے، دوسری طرف اسلامی تہذیبی حلقوں میں محققین کو مزید کوشش کی طرف اکساتی ہے۔ ہمارا یہ ماننا ہے کے اسلامی تہذیب کے موضوع کی تحقیق رہبر معظم کے نظریات کی طرف رجوع نہ کرنے کی صورت میں ناقص و ناتمام رہ جائے گی۔

رہبر معظم نے ہمیشہ یہ تاکید کی ہے کہ اسلامی انقلاب اور ایران کے عوام کا مقصد ایک جدید اسلامی تمدن کی ایجاد تھا، اسلامی تمدن یعنی چوطرفہ پیشرفت (مقام معظم رہبری ۹۱/۷/۲۳) جسے ایک بڑی تقسیم بندی میں فکری و عملی دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ رہبر معظم کا عقیدہ ہے کہ تمام تہذیبوں کا حقیقی جاذبہ ان کا عملی حصہ ہے اور یہ جاذبہ کچھ ایسے چھوٹے چھوٹے عناصر سے مل کر وجود میں آتا ہے جس سے مہذب معاشرہ کو حقیقی زندگی عطا ہوتی ہے۔ انہوں نے اس کا نام زندگی کا طریقہ رکھا ہے۔ طریقہ زندگی لفظ تہذیب کا دوسرا نام ہے اور رہبر معظم کی نگاہ میں یہ حصہ ہمارے تعلقات اور برتاؤ کے ان تمام نمونوں پر محیط ہے جو ہمارے مختلف اجتماعی حلقوں میں آتے ہیں چاہے وہ خاندانی حلقہ ہو یا سیاسی یا احبابی یا معاشرتی یا اقتصادی وغیرہ۔ (مقام معظم رہبری ۹۱/۷/۲۳) رہبر معظم کی نگاہ میں ہر تمدن کا اساسی عنصر تہذیب ہے جس میں اسلامی تمدن بھی شامل ہے اس لئے کہ تہذیب ہی وہ چیز ہے جو سارے تمدنی نظام کے رابطوں کو وجود میں لاتی ہے، تہذیب ہی اقدار کو معین کرتی ہے اور ایک نظام کو دوسرے محدود نظاموں کے مقابلے میں رکھ کر اس کا رتبہ معین کرتی ہے۔

رہبر معظم کی نظر میں اس بات میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ اسلام اپنی فطری طاقت اور رسوخ کی وجہ سے عالمی حکمرانی کے تخت پر بیٹھے گا اور اپنی روشنی کو ان تاریکیوں کی گہرائیوں تک پہنچائے گا جس میں پوری بشریت گرفتار ہے اور حملہ آور طاقتوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کرے گا اور آخر کار سربلند اور کامیاب جلوہ گری کرے گا[۱]۔ اس مقدمہ کے ساتھ ہم یہاں پر جدید اسلامی تمدن کے بارے میں رہبر معظم کے نظریات کو بیان کریں گے۔

جدید اسلامی تہذیب کے عملی ہونے کے راستے

اس حصے میں ہم جدید اسلامی تہذیب کی تشکیل کے عملی راستوں کے بارے میں آیت اللہ خامنہ ای کے نظریات کو بیان کریں گے۔

الف: اپنی قومی طاقت وصلاحیت پر یقین رکھنا

رہبر معظم کی نظر میں جدید اسلامی تمدن کو وجود میں لانے کے لئے اہم اور بنیادی عملی راستوں میں سے ایک راستہ مسلمانوں کی قومی صلاحیتوں پر مکمل یقین کرنا ہے۔ یہ ایسا نکتہ ہے کہ جس پر رہبر معظم نے کئی بار تاکید کی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ تاکید کی ہے کہ کچھ کر سکنے کا جذبہ جو جوانوں کی روح میں رواں دواں ہے اسے نابود نہ ہونے دیں بلکہ حکومتی عہدوں پر فائز افراد بھی چاہے اپنے بیانوں میں چاہے اپنے رفتار و کردار کے ذریعہ اس کر سکنے کے جذبہ پر تاکید کریں کیونکہ ہم اسلامی تمدن کو قائم کر سکتے ہیں۔(مقام معظم رہبری،۹۲/۹/۱۹)

ب: معاشرے کو دین کی حقیقی تصویر دکھانا

دشمنوں نے ہمیشہ سے اجتماعی دین اسلام کو انفرادی دین کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے لہٰذا اسلامی تمدن کی حفاظت کرنے والوں کا ایک اہم فرض معاشرے کو حقیقی دین کی تصویر دکھانا ہے۔

رہبر معظم اس بارے میں تاکید کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ہمیں چاہیے کہ لوگوں کو یہ سمجھائیں کہ یہ مہمل و بیکار و بے خاصیت چیز دین نہیں ہے، یہ بے محتوا ظواہر وہ نہیں ہے جسے پیغمبر اسلام(ص) نے آخری اور

۱۔ سید قطب، سید علی خامنہ ای، آیندہ در قلمرو اسلام، ص ۲۔

کامل آسمانی نظام کے عنوان سے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ بعض دینی واجبات کو انجام دینا وہ بھی بطور ناقص ہمارے جذبہ دین طلبی کے لئے کافی نہ ہو جائے اور ہمیں دین کے راستہ کی جستجو سے روک نہ دے۔ ہمیں چاہیے کہ لوگوں کو یہ یقین دلائیں کہ ہمارے دین کو اٹھا لے گے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ دین کی حفاظت کا فرض انہیں یاد دلائیں اور یہ ثابت کریں کہ یہ فرض آج تمام مسلمانوں کی توجہ کا طالب ہے اور یہ وہی عظیم الہی پیغمبروں کی رسالت ہے حن کی تاریخ زندگی کو ہم نے پڑھا ہے[1]۔

اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشروں میں تہذیب جیسے مقولہ کی اہمیت کی جانب اشارہ کریں۔ رہبر معظم صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ مستکبرین کے مقابلہ میں امت مسلمہ کی مقاومت کی بنیاد اور انشاءاللہ ان کی کامیابی، اسلامی اور انقلابی تہذیب کی حفاظت کے ذریعہ ہوگی لہٰذا ضروری ہے کہ وہ پودے جو اسلامی تہذیب کے میدان میں آگے ہیں ان کی تقویت کی جائے۔ (مقام معظم رہبری، ۹۲/۱۲/۲۰)

ج: فکری استقلال اور اسلامی منابع کی طرف رجوع کرنا

رہبر معظم کا ماننا ہے کہ اسلامی معاشروں کی سماجی مشکلات جیسے خواتین سے متعلق پریشانیاں وغیرہ کو حل کرنے کے لئے چند شرطوں کی رعایت ضروری ہے۔ آپ نے معاشرے کے دانشوروں کو مخاطب کرتے ہوئے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ پہلی شرط یہ ہے کہ آپ لوگ مغربی افکار کو اپنے ذہن سے نکال دیں، ایسے افکار جو غلط ہیں، نئے نظر آنے والے افکار جو دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں لیکن ان کا باطن خباثت سے پر ہے۔ اس سلسلے کی دوسری ضروری چیز اسلامی متون کی طرف رجوع کرنا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ کتاب خدا، پیغمبر (ص) کی سنت واحادیث، دعاوں اور کلمات و رفتار ائمہ علیہم السلام سے اساسی اصول ومبانی کا استخراج کریں اور اجتماعی مسائل کی جمع آوری میں حقیقتاً اصلی مسائل کی طرف توجہ دیں نہ کہ فرعی مسائل کی طرف۔ (مقام معظم رہبری ۹۳/۱/۳۰)

۱۔ سید قطب، سید علی خامنہ ای، آیندہ در قلمرو اسلام، ص۵-۶۔

د: امت مسلمہ کی وحدت کو حفظ کرنا

دوسرے مسلمان متفکرین کی طرح رہبر معظم بھی اسلامی تحریکوں کے مقاصد کے فروغ میں امت مسلمہ کی وحدت کو بہت اہم مانتے ہیں۔ معظم لہ تاکید کرتے ہیں کہ امت مسلمہ کے اتحاد کو برقرار رکھنا دور حاضر کے تمام مسلمانوں کا اہم فرض ہے۔ آپ اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان پائی جانے والی بدبینی اور غلط فہمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے اسلامی اتحاد کے لئے عظیم خطرہ قرار دیتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ اسے ختم کرنا سب کا فرض ہے اور قومی خصوصیات کو اجاگر کرنا اور قوم پرستی کو ہوا دینا معظم لہ کی نظر میں آگ کے ساتھ کھیلنے کے برابر ہے۔ (مقام معظم رہبری، ۹۲/۱۲/۲۰)

ہ: دائمی مجاہدت

معظم لہ کا عقیدہ ہے کہ اگر قوموں کے دانشور اور پڑھے لکھے حضرات چاہے وہ سیاسی میدان کے ہوں یا علمی و دینی میدان کے، اپنے فرائض کو صحیح طریقہ سے انجام دیں تو دنیائے اسلام کا مستقبل جو آج بیداری کا احساس کر رہا ہے ایک مطلوب مستقبل ہوگا۔ (مقام معظم رہبری، ۹۲/۱۲/۱۵)

اسی بناپر معظم لہ مجاہدت اور سعی و کوشش پر خصوصی تاکید کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دائمی مجاہدت سب کی ضرورت ہے۔ ہر ترقی اور ہر تمدن سازی دائمی مجاہدت کی برکت سے ہوئی ہے۔ دائمی مجاہدت بھی صرف زحمت اٹھانے اور تکلیفیں برداشت کرنے کا نام نہیں ہے، مجاہدت شوق پیدا کرنے والی چیز ہے، مجاہدت خوشی اور نشاط پیدا کرتی ہے۔ آج جب کہ اس مجاہدت کی ضرورت ہے اگر کوئی سستی، کاہلی اور گوشہ نشینی کی دعوت دے تو یہ کفران نعمت الہی ہے۔ (مقام معظم رہبری، ۹۲/۳/۱۷)

و: اسلام کے عملی اخلاق کے تحقق کی کوشش

رہبر معظم ہمیشہ اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کے اخلاقی مسائل اور اسلامی زندگی کے آداب میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جن کی ہمیں ضرورت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ان مسائل کو اپنی بحث و تحقیق کا محور قرار دیں۔ ہم لوگوں نے اسلامی حقوق اور اسلامی فقہ پر بہت کام کیا ہے اور اب ہمیں چاہیے کہ اسلامی اخلاق اور اسلام کی عقل عملی کے بارے میں بھی ایک وسیع اور باکیفیت کام انجام دیں۔ مدارس دینی، دانشوروں، محققین اور اہل نظر اور ہمارے علمی مراکز کی ذمہ داری ہے کہ اسلامی اخلاق کو اپنی

کارگذاریوں کا منبع اور محور قرار دیں، اسے اپنی درسگاہوں میں جگہ دیں، اسی چیز کی ہمیں آج ضرورت ہے اور ہمیں چاہیے کہ اس کے لیے جد وجہد کریں۔

ز: تقلید سے پرہیز کرنا

دوسرا نکتہ جو یہاں پر ذکر کیا جارہا ہے وہ یہ ہے کہ جدید اسلامی تمدن کے اس حصہ کو وجود میں لانے کے لئے تقلید سے پرہیز کرنا نہایت ضروری ہے۔ان لوگوں کی تقلید نہیں کرنی چاہئے جو اپنی زندگی گزارنے کے طریقہ کو دوسروں پر تحمیل کرتے ہیں۔ عصر حاضر میں اس زبردستی اور تحمیل کا واحد مظہر مغربی تمدن ہے۔ہم اس بات کو مغرب سے دشمنی یا جنگ کی بنا پر نہیں کہہ رہے ہیں۔ یہ بات تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگ جیسے ہی مغرب کا نام یا مغربی تمدن یا مغربی طریقہ کار یا مغرب کی دھوکہ بازی یا مغرب کی دشمنی کی بحث آتی ہے تو اسے مغرب ستیزی پر حمل کرتے ہیں جب کہ ایسا نہیں ہے۔ سب کو یہ محسوس کرنا چاہیے کی جدید اسلامی تمدن کے ایجاد کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ہے اور اس کام کے حدود و قوانین میں سے ایک یہ ہے کہ مغربی تمدن کا مقابلہ کیا جائے لیکن اس طرح کہ ان کی تقلید نہ ہونے پائے۔(مقام معظم رہبری ۱۹/۷/۲۳)

ح: خدا پر ایمان اسلامی تمدن سازی کی سب سے اہم ضرورت

رہبر معظم کی نظر میں اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے کے عملی راستوں میں سے ایک اور راستہ وہ ہے جس کے دو رکن ہیں۔ خدا اور عوام۔ معظم لہ کا عقیدہ ہے کہ ہم نے جس جگہ بھی خدا کی ذات پر بھروسہ کیا، جہاں بھی لوگوں پر بھروسہ کیا اور جہادی راستے کو اپنایا، وہاں ہمیں کامیابی نصیب ہوئی۔ آپ تاکید کرتے ہیں کہ جدید اسلامی تمدن سازی کی پہلی ضرورت کا نام ایمان ہے۔ (مقام معظم رہبری ۹۲/۱۲/۱۵)

ط: دشمن کی شناخت

جدید اسلامی تمدن کی جانب بڑھنے کا ایک اور عملی راستہ مستکبرین کے خیموں کی پہچان ہے۔ مستکبرین کی خصوصیات اور ان کی سازشوں کو پہچاننا تاکہ ہم معقول طریقہ سے اس کا مقابلہ کر سکیں۔ معظم لہ کی نگاہ میں اگرچہ مستکبرین کی خصوصیتیں اور ان کے طریقے مختلف ہوتے ہیں لیکن ان کے بنیادی اصول ہر زمانے

میں ایک ہی ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں رہبر معظم کا عقیدہ ہے کہ ہمیں تمام سرگرمیوں اور فردی واجتماعی فیصلوں میں حکمت و سمجھداری سے کام لینا ہوگا اور اگر ہم دشمنوں کو نہ پہچانیں گے تو سمجھداری سے کام کیسے کر سکتے ہیں۔ (مقام معظم رہبری ۹۲/۸/۲۹)

ی: جوانوں سے ایک سفارش

امت مسلمہ کو اسلامی تمدن کا مکمل نمونہ بنانے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ کچھ معین خصوصیات کی حامل ہو اور وہ خصوصیات رہبر معظم کی زبان میں مندرجہ ذیل ہیں: آیت اللہ خامنہ ای ایرانی عوام خصوصا جوانوں کو خطاب کرتے ہوئے تاکید فرماتے ہیں کہ بڑے کاموں کو انجام دینے کے لئے دین، تقوا، روح کی پاکیزگی اور پاکدامنی کو زیادہ سے زیادہ معاشرہ اور اپنے درمیان رائج کیجئے۔ آج کے جوان کو دین، تقوا، علم، کاروبار میں خوشحالی، امانت، پاکدامنی، سماجی خدمات اور تفریح کی ضرورت ہے۔ (مقام معظم رہبری ۹۲/۸/۲۹)

جدید اسلامی تمدن کے محقق ہونے کی ضرورت

مقام معظم رہبری اس بارے میں ماضی قریب کے سالوں میں دنیا کے اہم تحولات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "افریقہ کے شمالی حصہ میں اور ایشیا کے بعض حصوں میں ایسی طاقتیں سر اٹھا رہی ہیں جو دنیا کی قدیم طاقتوں کے مقابلے میں اپنے وجود کا اظہار کرتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ ان حالات پر نظر کرنے سے پتہ چلتا ہے کی دنیا ایک تبدیلی کی جانب بڑھ رہی ہے۔ (مقام معظم رہبری ۹۲/۸/۲۹) معظم لہ تاکید کرتے ہیں کہ انقلابی اور آگاہ مسلمان پر واجب ہے کہ اپنی تیز بین نگاہوں کے ذریعہ ان حوادث پر نظر رکھے۔

اسلامی تمدن کو زندہ کرنے کی ضرورت کے باب میں آیت اللہ خامنہ ای کے نظریات کو اس طرح خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔ رہبر معظم کا عقیدہ ہے کہ خدا کی ذات پر بھروسہ رکھتے ہوئے اور قرآن میں نصرت الہی کے تاکیدی وعدوں پر حسن ظن اور اعتماد رکھتے ہوئے نیز شجاعت و عزم و عقل کا استعمال کرتے ہوئے تمام موانع کو بر طرف کیا جاسکتا ہے۔ دوسری نصیحت یہ ہے کہ انقلاب کے دائمی اصول کا پھر سے مطالعہ کیا

جائے۔ اصول و نعروں کی اصلاح کی جائے اور انہیں اسلام کے مبانی و محکمات کے مطابق بنایا جائے۔ رہبر معظم کی نگاہ میں آزادی، استقلال، عدالت خواہی، استعمار و استبداد کے مقابلہ میں تسلیم نہ ہونا، قومی و نسلی و مذہبی تبعیض کی نفی اور صہیونیزم کی صریحی نفی احیائے تمدن اسلامی کے ملزومات ہیں اور یہ سب کے سب اسلام و قرآن سے ماخوذ ہیں۔

معظم لہ کی ایک اور اہم نصیحت یہ ہے کہ مذہبی اختلافات اور قومی، قبائلی، نسلی اور سرحدی اختلافات سے پرہیز کیا جائے۔ معظم لہ امت مسلمہ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کا اصلی کام نظام سازی ہے اور یہ کام دشوار اور پیچیدہ ہے۔ آپ تاکید کرتے ہیں: "مغربی لبرلزم یا لائیک نمونے یا شدید قومیت پسند مارکسیزم اپنے انحرافی رجحانات کو آپ لوگوں پر تحمیل نہ کرنے پائیں۔ اپنی جوان نسل پر بھروسہ کیجئے اور ان کے اندر اعتماد بہ نفس کی روح کو زندہ کیجئے اور اسی طرح مجرب اور بوڑھے لوگوں کے تجربوں سے انہیں مستفید کیجئے"۔ (مقام معظم رہبری ۹۰/۱۶/۲۶)

جدید اسلامی تمدن کا مستقبل

رہبر معظم کی نظر میں ایران کا اسلامی انقلاب نیز اسلامی بیداری جدید اسلامی تمدن کی تشکیل کی راہ میں ایک قدم ہے۔ آپ مختلف ممالک میں اسلامی بیداری کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دنیا کے حالات حساس ہیں اور دنیا ایک اہم تاریخی موڑ سے گزر رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک جدید نظم وجود میں آنے والا ہے۔ دنیا کے تحولات کا خاکہ ایک چند وجہی نظام کی خوشخبری دے رہا ہے جس میں روایتی طاقت کے مراکز کی جگہ مختلف ممالک اور تہذیبوں کی مشترکہ طاقت سامنے آئے گی جو مختلف سیاسی، اقتصادی اور سماجی رجحانات کے حامل ہونگیں۔ وہ حیرت انگیز واقعات جنہیں ماضی قریب کے تیس سالوں میں ہم نے مشاہدہ کیا ہے، بخوبی اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ جدید طاقتوں کا ظہور پرانی طاقتوں کے ضعف کے ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ (مقام معظم رہبری، ۹۱/۶/۹)

دنیا کے حالات ایک نئی شکل و صورت لے رہے ہیں۔ ہم نے اپنی پوری تاریخ میں اسلامی ممالک میں ایسی حالت نہیں دیکھی۔ یہ تشخص کا احساس، یہ بیداری کا احساس جو صرف ایک قوم میں نہیں بلکہ متعدد اسلامی ملکوں میں ہم دیکھ رہے ہیں، یہ ساری باتیں اسلام سے وابستہ ہیں۔ ان چیزوں کو ہم نے ماضی میں

ہر گز نہیں دیکھا۔ یہ عصر حاضر کی دین ہے۔ یہ ایک علامت ہے، یہ تبدیلی و دگرگونی کی علامت ہے کیونکہ دنیا میں مسلمانون کی آبادی ڈیڑھ عرب ہے۔ دسیوں ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور یہ ممالک حساس جگہوں پر واقع ہوئے ہیں لہٰذا یہ بیداری معمولی چیز نہیں ہے بلکہ دنیا کے نظام میں ایک تبدیلی کی علامت ہے۔ (مقام معظم رہبری، ۹۱/۵/۲۲)

جدید اسلامی تمدن کے تحقق کے مخالفین

رہبر معظم نے اپنی تقریروں میں جدید اسلامی تمدن کی تشکیل کی راہ میں ایرانی قوم کو پیش آنے والی پریشانیوں اور دشمنوں کی سازشوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس دشمنی کا زیادہ تر حصہ اصل اسلام سے متعلق ہے۔ اسلام دشمن طاقتیں اسلام کی غیر حقیقی تصویر لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہیں تاکہ اسلام کی سیاسی و سماجی طاقت پر پردہ ڈال سکیں اور مسلمانوں کی غفلت کی وجہ سے یہ لوگ گذشتہ صدیوں میں ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ رہبر معظم کے بقول آج دین اسلام ایک ناشناختہ دین ہوگیا ہے کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت اس وقت بھی اسلام کو مختلف رسوم کا مجموعہ مانتی ہے جن کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ ابھی اس بات کو ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ اسلام ایک نظام زندگی ہے اور صرف کچھ فردی واجبات کو انجام دینے سے ان کا شمار مسلمانوں میں نہیں ہوگا۔ حقیقی اسلام سے مسلمانوں کو دور کرنے کے لئے دشمن جو سازشیں کررہا ہے، ان سے ہمیں باخبر ہونا چاہئے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اس کے بارے میں بتانا چاہئے[۱]۔

دشمنوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ تفرقہ بازی اور مذہبی اختلافات کو ہوا دینا ان کی دوسری شیطانی حرکت ہے اور رہبر معظم تمام مسلمانوں کو اس سے پرہیز کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ معظم لہ کا عقیدہ ہے کہ امت مسلمہ سے مقابلہ کرنے کے لئے دشمن ہماری وحدت کو اختلاف میں بدلنا چاہتا ہے تاکہ مسلمانوں کو آپس میں لڑایا جائے اور اس حکمت عملی کے ذریعہ مسلمانوں کا ذہن ان کے اصل دشمن یعنی مفسد سرمایہ داری اور صہیونیزم سے ہٹ جائے۔

۱۔ سید قطب، سید علی خامنہ ای، آیندہ در قلمرو اسلام، ص ۳۔

دشمنوں کی دشمنی کے سلسلہ میں تحقیق کرکے ہم ان کے مکر سے محفوظ رہنے کے راستے تلاش کر سکتے ہیں۔ اس بارے میں رہبر معظم کی تاکید کے بموجب دشمنوں کی شناخت اور ان کی سازشوں سے آگاہی ضروری ہے اس لئے کہ صرف اسی صورت میں دشمنوں سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ رہبر معظم کی تاکید اس سلسلے میں کچھ ایسی ہے گویا معظم لہ کی نظر میں دشمنوں پر کامیابی حاصل کرنے کی شرط ان کی پہچان اور ان کے منصوبوں سے آگاہی ہےاور یہ صرف دشمن پر کامیابی کی شرط ہی نہیں بلکہ امت مسلمہ کے ارمانوں کی جانب اسلامی جاں نثاروں کی صحیح گامزنی کے لئے بھی اس شرط کی رعایت ضروری ہے لہٰذا تمام اسلامی حکومتوں اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ حقیقی بصیرت حاصل کریں تاکہ دشمن کی شناخت میں غلطی نہ کریں۔ (مقام معظم رہبری، ۹۲/۲/۱۷)

اسلام دشمنی کے اسباب وعلل کا بیان کرنا بھی ضروری ہے۔ رہبر معظم دشمنی کی جڑ کو مغربی تمدن کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں، یعنی وہ زمانہ جب صنعتی انقلاب کے ذریعہ مغربی ملکوں نے افریقہ اور ایشیا کے ممالک کو تیل اور دوسرے ذخایر کی خاطر اپنا مطمع نظر قرار دیا۔ اسی زمانے سے مختلف صورتوں میں مغرب کی غاصبانہ دست درازی کا آغاز ہوتا ہے۔ عصر حاضر میں اکثر اسلامی ممالک میں جس چیز کو ہم اسلام کے عنوان سے پہچانتے ہیں وہ دراصل استعماری طاقتوں کی سیکڑوں سال کی کوشش اور مسلمانوں کی غفلت کا نتیجہ ہے[۱]۔

معظم لہ اسلامی ممالک کے موجودہ حالات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسلامی تحریکات کو درپیش احتمالی نقصانات کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں: وہ نقصانات جو مسلمانوں کے درمیان اور خود ان کی کمزوریوں کی وجہ سے ہوتے ہیں اور دوسرے وہ نقصانات جو دشمن کی بلاواسطہ سازشوں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

پہلے قسم کے خطروں میں سے ایک خطرہ جذبات کا کم اور ارادوں کا کمزور ہونا ہے جو احساس کامیابی سے حاصل ہونے والے سکون وآرام کا نتیجہ ہے۔ رہبر معظم کا عقیدہ ہے کہ یہ خطرہ اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب لوگ حاصل شدہ کامیابی میں اپنے حصہ پر اپنا حق جتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک تلخ تجربہ جس کی وجہ سے جنگ احد کے موقع پر مجاہدین اسلام شکست سے دچار ہوئے۔ خوف کا احساس اور مداخلت کرنے والی طاقتوں اور مستکبرین کے مقابلے میں شکست کا احساس بھی پہلی قسم کے نقصانات میں سے ایک ہے۔

۱۔ سید قطب، سید علی خامنہ ای، آیندہ در قلمرو اسلام، ص ۳-۵۔

لوگوں کے دلوں سے اس طرح کے خوف کو دور کرنا معاشرے کے جوانوں اور بہادر دانشوروں کی ذمہ داری ہے۔ دشمن پر بھروسہ کرنا اور ان کے وعدوں کے جال میں پھسنا بھی پہلی قسم کے نقصانات میں سے ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں دشمن اور اس کے ارادوں کی شناخت کی ضرورت سامنے آتی ہے۔ دشمن کو اور اس کے مکر وفریب کو چاہے جس لباس یا شکل میں ہو پہچاننا اور اس سے مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

اس سکہ کا دوسرا رخ اس غرور میں مبتلا ہونا ہے جس کے نتیجہ میں دشمن کمزور اور غافل سمجھا جاتا ہے، اس نقصان سے بھی بچنا ضروری ہے اور آخر کار اس نقصان سے پرہیز کرنا جس کی وجہ سے دشمن مسلمانوں کے پیٹھ پیچھے اختلاف پھیلاتا ہے اور انہیں ایک دوسرے کا جانی دشمن بناتا ہے۔ رہبر معظم امت مسلمہ کو اس سلسلہ میں بھی ہوشیار رہنے کی تاکید فرماتے ہیں۔

دوسرے قسم کے نقصانات جو بیرونی دشمنوں کی جانب سے ہوتے ہیں، وہ نقصانات ہیں جو اسلامی بیداری کے سلسلہ میں، آج مسلمان ممالک ان سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ در حقیقت رہبر معظم کے بیانات میں اس طرح کے نقصانات کی شناخت دنیائے اسلام کے موجودہ حالات پر مبنی ہیں۔

انقلاب کے رہنماؤں کی نظر میں مستقبل میں اسلامی تمدن کا محقق ہونا ممکن نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ سب سے پہلے اسلامی معاشرے میں دین اسلام اور اس کی خالص توحیدی تہذیب کو رائج کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی تمدن کا احیا اور اس کی حیات نو در حقیقت حقیقی اسلام کے انفرادی، اجتماعی مجاہدانہ زندگی پر موقوف ہے۔ امام خمینی(رہ) اور آیت اللہ خامنہ ای جس وقت تمدن کے موضوع کو بیان کرتے ہیں تمدن کے تہذیبی اور نظری پہلوں پر نظر رکھتے ہیں۔

منابع

۱. کرمی قمی، محمد تقی، جستاری نظری در باب تمدن، پژوہشگاہ علوم وفرہنگ اسلامی، قم، ۱۳۸۸
۲. سید قطب، سید علی خامنہ ای، آیندہ در قلمرو اسلام، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، ۱۳۸۶
۳. روح الامینی محمود، زمینہ فرہنگ شناسی در علوم اجتماعی، دانشگاہ پیام نور، تہران، ۱۳۸۲

اسلامی حکومت میں آزادی اور سیاسی تنقید کے بارے میں امام خمینی اور آیت اللہ خامنہ ای کا نظریہ

مؤلف: خدابخش عبدلی
مترجم: خان محمد صادق جونپوری

لفظ آزادی ان الفاظ میں سے ہے جس کے بارے میں مختلف افراد اور مذاہب میں اختلاف پایا جاتا ہے اور ہر کوئی اس کے کسی ایک معنی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ آزادی کی دو سو سے زیادہ تعریفیں کی گئی ہیں اور مختلف علوم جیسے فلسفہ، اخلاق، سیاست، حقوق وغیرہ کے تناظر میں اس کے الگ الگ معنی بیان کئے ہیں۔

آزادی فرد یا معاشرہ کو اپنی مرضی یا ارادہ سے لئے گئے فیصلہ پر عمل کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ حضرت علی (ع) معاشرے میں انسانوں کے حق آزادی کے بارے میں فرماتے ہیں فلا تکن عبد غیرک فقد جعلک اللہ حرا[1] خود کو کسی اور شخص کے قید و بند میں نہ دو کیونکہ اللہ تعالی نے تم کو آزاد پیدا کیا ہے۔

امام خمینی (رہ) کی نگاہ میں آزادی ایسے بنیادی اور فطری امور میں سے ہے جس کی تعریف کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا انہوں نے اس رپورٹر کے جواب میں جو آزادی کی تعریف جاننا چاہتا تھا فرماتے ہیں کہ آزادی قابل تعریف نہیں ہے۔ لوگ عقاید کے سلسلے میں آزاد ہیں، انہیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ کو یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے، کوئی آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ ضرور اس راستے پر جائیں، کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ کہاں قیام کرنا ہے، یا کون سا پیشہ اختیار کرنا ہے، آزادی ایک واضح چیز ہے۔ اگر انسان اپنے تمام فیصلوں پر عمل کر سکے اور کوئی شخص یا ادارہ اس کی گفتار و کردار کو محدود نہ کرے تو یہ آزادی مطلق ہے یعنی

---

۱. نہج البلاغہ، نامہ ۳۱، ص ۵۱

بنا کسی روک ٹوک کی آزادی۔ لیکن چونکہ انسان اجتماعی طور پر زندگی گزارتا ہے، اسے مطلق آزادی نہیں مل سکتی ہے کیونکہ مطلق آزادی دوسرے افراد کی آزادی میں مخل ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر سماج کے اجتماعی ، سیاسی اور اقتصادی قواعد اس سماج کے افراد کی آزادی کے محافظ ہوتے ہیں اور اس طرح کی آزادی کے حدود کو بھی متعین کرتا ہے۔

تاریخ میں انسانوں کی ساری کوششیں مشروع آزادی کے حصول اور ظالم بادشاہوں کی بے حد و حصر آزادی پر روک لگانے کے لئے تھیں۔ شہید مطہری کی نظر میں لوگوں کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا آمریت اور مطلق العنانی ہے اور کم سے کم طرز فکر، عقیدہ، انتخاب اور مالکیت کی آزادی تو ضرور ہونی چاہئے۔ جو سماج ظالم و جابر حکمرانوں کا تختہ پلٹنے میں کامیاب ہوتا ہے اسی سماج کے افراد کو زیادہ آزادی نصیب ہوتی ہے۔ امام خمینی لوگوں کے حق آزادی کی تصدیق کرتے ہوئے، حاکموں کے سامنے تنقیدی نقطہ نظر کے بیان کو لوگوں کا حق مانتے ہیں:

"قوم کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے مسلمانوں کے حاکم سے وضاحت طلب کرے اور اس کی تنقید کرے اور حاکم کو بھی چاہئے کہ تسلی بخش جواب دے اور اگر ایسا نہیں ہے اور اس نے اپنے اسلامی فرض کے خلاف عمل کیا ہے تو وہ خود بخود اس منصب سے برخاست ہو جاتا ہے۔"[1]

آزادی کی قسمیں

آزادی کو مختلف پہلوؤں سے تقسیم کر سکتے ہیں:

۱. **فکری آزادی:** انسان جس طرح چاہے کسی چیز کے بارے میں فکر و استدلال کرے اور اس کی نگاہ میں جو طرز فکر صحیح ہو اس کا انتخاب کرے، یہ وہی چیز ہے جسے عقیدہ کی آزادی کہا جاتا ہے اور اصولی طور پر اس آزادی کو کسی سے چھین نہیں سکتے چونکہ فکر و عقیدہ قلبی اور ذہنی امر ہے اور باہری دباؤ اس کو ایجاد یا ختم نہیں کر سکتا ہے۔ یہ آزادی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے:

---

[1]. خمینی، روح اللہ، صحیفہ نور، ج ۴، ص ۱۹۰

الف: دین و ایمان میں آزادی: اسی وجہ سے اصول عقاید میں تقلید صحیح نہیں ہے اور یہ اصول تحقیق کی بنیاد پر قابل قبول ہے۔

ب: علمی نظریات کے انتخاب میں آزادی: جس کی دین نے بھی تائید کی ہے۔ پیغمبر اسلام(ص) اس بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: اطلبوالعلم ولو بالصین، فان طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة ۔علم حاصل کرو چاہے چین میں ہو، بے شک حصول علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر واجب ہے[1]۔

اسی طرح حضرت علی(ع) نے فرمایا: الحکمة ضالة المومن فخذ الحکمة ولومن اهل النفاق: حکمت مومن کی گمشدہ چیز ہے اسے حاصل کرو چاہے منافق ہی کے پاس کیوں نہ ہو[2]۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کے لئے کسی مخصوص فرد یا جگہ کی قید نہیں ہے اور انسان اس کو حاصل کرنے اور صحیح بات کے انتخاب کے لئے آزاد ہے۔ انتقاد علم و واقفیت کے حصول کا ایک راستہ ہے۔

۲. **طاقت کے استعمال کی آزادی**: کبھی آزادی کا مطلب اپنی طاقت کو زبردستی دوسروں پر مسلط کرنا ہے جس کی آخری حد فوجی آزادی ہے۔

۳. **بیان و قلم کی آزادی**: جس کا مطلب ہے کہ انسان اپنی اعتقادی باتیں اور دوسروں کے نظریات سے متعلق اپنے تنقید کو کسی ممانعت کے بغیر لکھ سکتا ہے ۔

۴. **سیاسی آزادی**: یعنی انسان معاشرے میں مختلف پارٹیوں کے ذریعہ اپنے سیاسی ارادے کا اظہار کرسکتا ہو۔ یہ بتادینا ضروری ہے کہ عقیدہ، مذہب ، بیان ، قلم اور سیاست وغیرہ کی آزادی عالمی حقوق بشر کے ذریعہ قبول کیا جاچکا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روح اور آیتوں و روایتوں کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ اسلام اوپر بیان کی گئی تمام آزادیوں کو قبول کرتا ہے لیکن دو شرط کے ساتھ۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اسلامی

---

۱. مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ج ۱، ص ۱۸۰
۲. نہج البلاغہ، حکمت ۸۰، ص ۶۴۰

قوانین کے متضاد نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ دوسروں کے انفرادی واجتماعی حقوق کے لئے نقصان دہ نہ ہو۔ ان حقوق کو قانون معین کرتا ہے، ایسا قانون جسے زیادہ تر لوگوں نے قبول کیا ہے اور شریعت، عقل و عدالت کے خلاف نہیں ہے۔

مطلق اور محدود آزادی:

۱. مطلق آزادی (بنا قید و شرط کی آزادی): اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے تمام افعال میں آزاد ہو اور کوئی قانون اور قاعدہ نہ ہو۔اس طرح کی آزادی عمل میں غیر ممکن ہے، چونکہ سماج میں ہر فرد کی مطلق آزادی دوسرے افراد کی مطلق آزادی میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہے یعنی خود بخود محدودیت پیدا ہو جاتی ہے۔

۲. محدود و مقید آزادی: اس کے معنی یہ ہے کہ انسان عمل، بیان و قلم وغیرہ میں آزاد ہے لیکن اس دائرے میں جسے دین یا قانون معین کرتا ہو۔

اندرونی اور بیرونی آزادی:

انسان سے متعلق ہونے کے لحاظ سے آزادی دو طرح کی ہوتی ہے:

بیرونی آزادی: اس طرح کی آزادی میں آزادی بیان و قلم اور فردی وسیاسی آزادی شامل ہے جس کی تائید آج کے مغربی معاشروں اور حقوق بشر کے ذریعہ کی گئی ہے۔

اندرونی آزادی: اس قسم کی آزادی میں مندرجہ ذیل باتیں شامل ہیں:

الف: **تخیل یا فکری آزادی:** اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی فکر خرافات کے قید و بند سے آزاد ہو اور انسان آسانی سے فکر کرسکے اور کسی منطقی نتیجہ تک پہنچ سکے۔

ب: **اخلاقی آزادی یا شہوت کے قید و بند سے آزادی:** اہل بیت علیہم السلام سے منقول روایتوں میں اس طرح کی آزادی پر تاکید کی گئی ہے اور دیندار انسان کی خصوصیات میں سے شمار کیا گیا

ہے۔امام جعفر صادق (ع) ارشاد فرماتے ہیں: ان صاحب الدین ... رفض الشهوات فصار حرا۔ بے شک دیندار لوگ نفسانی خواہشات سے دور رہتے ہیں اور آزاد ہو جاتے ہیں[۱]۔

ج۔ **عنوی و مادی آزادی**: آزادی اپنی اہمیت کے لحاظ سے دو طرح کی ہوتی ہے:

۱. **مادی آزادی**: اس طرح کی آزادی انسان کی انسانیت سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کے مادی پہلو سے مرتبط ہے البتہ ایک خوشحال زندگی کے لئے معقول حد تک اس کی ضرورت ہے اور اس کے بغیر زندگی مشکل ہو جائے گی۔اصل میں یہ آزادی انسان کی سعادت و ارتقا کے لئے مقدمہ ہے لیکن ان امور میں آزادی ، انسان کا آخری مقصد نہیں ہے چونکہ انسان کا مقصد ان مسائل سے بالاتر ہے ، لہٰذا اس طرح کی آزادی پیشگی کی اہمیت رکھتی ہے۔

۲. **معنوی آزادی**: اس طرح کی ہوتی آزادی میں قلم و بیان اور سیاسی آزادی جیسے امور شامل ہیں چونکہ انسان کی اہمیت اس کی فکر اور عقیدے سے ہوتی ہے اور ایک انسان صحیح عقیدہ اور دین کا انتخاب اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ فکری طور پر آزاد ہو۔دوسری طرف معاشرے کے صحیح ماحول میں انسان زیادہ بہتر طریقے سے معنوی ترقی کر سکتا ہے اور رکاوٹوں کی وجہ سے انسان کی معنوی ترقی کے مواقع کمزور یا بعض اِوقات بالکل ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پیغمبروں کا ایک اہم مقصد ،اسی معنوی آزادی کی حفاظت کرنا تھا، یعنی وہ لوگ آئے تاکہ انسانوں کے پیروں میں پڑی زنجیروں کو کھول دیں تاکہ ایک اچھے ماحول میں انسان ارتقا کی طرف پرواز کر سکے۔

آزادی کا دائرہ اور اس کی کسوٹی: آزادی کی اہم ترین بحث اس کا دائرہ ہے اور یہیں سے راستے الگ ہو جاتے ہیں اور ہر فرد آزادی کے سلسلے میں ایک راستے کا انتخاب کرتا ہے۔آزادی کسی بھی مذہب میں بغیر قید و شرط کے نہیں ہے لیکن ان میں فرق ضرور ہے۔ اسلام میں بھی آزادی کی ایک حد ہے اور یہ حد بندی آزادی کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے ہے۔ انسانی نقطہ نظر سے آزادی کا معیار صرف و صرف انسان کی

---

۱. محمدی ری شہری، محمدی، گزیدہ میزان الحکمہ، ج ۲، ص ۳۵۱

مرضی اور خواہش ہے اور یہ آزادی صرف اسی وقت محدود ہوتی ہے جب دوسروں کی آزادی میں خلل واقع ہوتا ہے۔ قانون ساز کی ذمہ داری ہے کہ ان تنازعات کی شناخت کرے اور آسان طریقے سے مشکل کو حل کرے تاکہ اکثریت کو زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل ہوں۔ خدا کے پیش نظر آزادی کی حقیقی کسوٹی اس کی مرضی ہے جو شریعت کی صورت میں پیغمبروں اور ان کے جانشینوں کے ذریعہ انسانوں کے لئے بیان کی گئی ہے اور نفاذ کے موقع پر نظام امامت وولایت اور قانون کی شکل میں پیش ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اسلام نے آزادی کو قبول کیا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ شریعت، عدالت اور عقل کے خلاف نہ ہو اور معاشرہ کے اکثر افراد نے اسے قبول کرلیا ہو اور ولایت خدا، رسول اور ائمہ کے نظام سے ہوتے ہوئے ولایت فقیہ تک پہنچتی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آزادی وہی اچھی ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے فطری حقوق تک رسائی حاصل کرسکے۔ لہٰذا عالم و فاضل افراد اپنے بیان و قلم کے ذریعہ قوم کو آگاہ کریں اور اس کے معنوی و مادی منافع کی اسے یاددہانی کرائیں تاکہ عدالت واحسان و تعاون کے ذریعہ لوگوں میں نیکی و پرہیزگاری حاکم ہو اور استبداد کا خاتمہ ہو۔ آزادی بیان و قلم حقیقتوں کو بیان کرنے اور نقد کرنے کے لئے بھی مفید ہے۔

سیاسی آزادی:

معاشرے میں سیاسی آزادی کے تحقق کی پہلی شرط قانون کی حکومت اور قانون کے سامنے افراد کا برابر ہونا ہے۔ امام خمینی اور آیت اللہ خامنہ ای نے قانون کی حکومت اور قانون کے سامنے افراد کے برابر ہونے پر تاکید کی ہے اور اسلامی حکومت کو اسلامی قوانین کے نفاذ سے مشروط جانا ہے ۔

سیاسی آزادی کے مصادیق:

سیاسی آزادی کے مصادیق کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی آزادی کی وہ قسمیں جو عوام کے حقوق کا تحفظ کرتی ہیں جیسے آزادی بیان، پارٹی بنانے کی آزادی، مظاہرہ کرنے کی آزادی، کتابوں کی اشاعت کی آزادی وغیرہ۔ سیاسی آزادی ممکن ہے ماہیت کے اعتبار سے سیاسی نہ ہو لیکن عوامی حکومت اور سیاسی مشارکت کو پورا کرتی ہے۔

سیاسی آزادی کی بنیادیں:

سیاسی آزادی کی بنیادوں کا مطالعہ بہت اہم ہے کیونکہ اس کے ذریعہ ہم اسلامی حکومت کی بنیادوں کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ سیاسی آزادی کی کچھ اہم بنیادیں مندرجہ ذیل ہیں:

خلافت الٰہی: دینی حکومت میں حق تشریع اور قانونگزاری صرف خدا کے لئے ہے اور اللہ تعالی کے علاوہ کوئی بھی مستقل طور پر بالذات لوگوں کے امور میں تصرف کا حق نہیں رکھتا ہے اور بشری حکومت کی مشروعیت اللہ تعالی سے استناد و انتساب کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کی نظر میں انسان زمین پر اللہ کا جانشین اور اللہ کی حکومت کے قیام کا ذمہ دار اور زمین کا آخری وارث ہے۔ انسان پر فرض ہے کہ اس ذمہ داری کے حصول کے لئے خود کو آمادہ کرے۔ اس نظریہ اور اعتقاد کے تحت مسلمانوں کی زندگی میں وسیع پیمانہ پر سیاسی تیاریوں کی نشاندہی ہوتی ہے جس کی حدیں مندرجہ ذیل آیتوں سے واضح ہوتی ہیں:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (۳۰بقرہ)

اے رسول اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں ۔

❖

يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ(ص،۲۶)

اے داود ہم نے تمہیں زمین میں اپنا جانشین بنایا ہے لہٰذا لوگوں کے درمیان حق کی بنیاد پر ساتھ فیصلہ کرو۔

❖

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور،۵۵)

اللہ نے تم میں سے صاحبان عمل صالح سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں روئے زمین پر اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح پہلے والوں کو بنایا ہے۔

امامت و رہبری: اللہ تعالی کی حکمت و قدرت لایزال کے ذریعہ اس کائنات کی ہدایت ، الٰہی تعلیمات کا ایک جزء ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انبیا اور اللہ کے بر گزیدہ لوگوں کے ذریعہ حقیقی سعادت کی طرف انسانوں کی ہدایت ہوتی ہے ۔ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے :

وَإِذِ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا (بقرہ، ۱۲۴)

اور جب پروردگار نے چند باتوں کے ذریعہ ابراہیم کی آزمائش کی تو اس میں کامیاب ہوئے ۔ خدا نے کہا کہ میں نے تم کو لوگوں کا پیشوا بنایا ہے۔

معاشرے پر حکومت کرنا ایک الہی حق ہے جو اللہ تعالی کی ربوبیت و ہدایت سے منشعب ہے اور اللہ تعالی اور اس کی طرف سے منتخب لوگوں کے علاوہ کسی کو بھی حق حکومت حاصل نہیں ہے۔ اللہ تعالی نے اس اہم ذمہ داری کو انبیا اور اماموں کو سونپا ہے جو مقام عصمت پر فائز ہیں۔ لوگوں کا انتخاب تبھی مشروع ہوگا جب پہلے سے متعین صفات و شرائط کے تحت ہو :

وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (مائدہ، ۴۲)

اگر فیصلہ کریں تو انصاف کے ساتھ کریں۔

❖

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (مائدہ، ۴۴)

اور جو بھی ہمارے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق حکم نہ کرے گا ان سب کا شمار کافروں میں ہوگا۔

❖

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (مائدہ، ۴۷)

اور جو بھی تنزیل خدا کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا وہ فاسقوں میں سے شمار ہوگا۔

❖

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (مائدہ، ۴۸)

اے پیغمبر ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جو اپنے پہلے کی توریت و انجیل کی تصدیق کرتی ہے اور محافظ بھی ہے لہٰذا آپ ان کے درمیان تنزل خدا کے مطابق فیصلہ کریں۔

۱. **ظلم واستکبار کے خلاف جنگ**: قرآن کریم معاشرہ میں ظلم کے خلاف جنگ کی اہمیت پر تاکید کرتے ہوئے یہ فرماتا ہے کہ اللہ تعالی ظلم سے مبرا ہے اور نظام آفرینش میں ظلم کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور معاشرہ سے ظلم و ستم کو ختم کرنے کی ذمہ داری انسانوں کو سونپتا ہے اور نہ صرف ظلم کرنے سے منع کرتا ہے بلک ظلم برداشت کرنے کی بھی تقبیح کرتا ہے۔

۲. **ذمہ داری اور حق انتخاب کے ساتھ آزادی**: اللہ تعالی نے انسانوں کو آزادی عطا کی ہے اور وہ انتخاب کرنے میں آزاد ہے کیونکہ انسان میں درک وقدرت تشخیص موجود ہے اور اسے آگاہانہ طور پر انتخاب کرنا ہوگا چاہے وہ دین کا انتخاب ہو یا اسلامی حکومت کے رہبر کا انتخاب ہو۔انسان خود اپنی قسمت کا تعین کرتا ہے اور اللہ تعالی نے اسے جو ذمہ داری دی ہے اس کی رو سے اسے اپنے مستقبل کے راستے کو تعقل و حکمت کی بنیاد پر انتخاب کرنا ہوگا۔اس سلسلے میں اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف،۲۹)

اور کہہ دو حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر ہو جائے۔

سیاسی آزادی کے ارکان

حق آگاہی: ولایتی نظام میں لوگوں کو حکومتی مسائل سے آگاہ رہنے کا حق حاصل ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ انہیں تمام امور سے آگاہ کرے سوائے ان مسائل کے جن کا بیان کرنا عوامی مصالح کے خلاف ہو۔حضرت علی (ع) فرماتے ہیں: حاکم کے سارے منصوبے اور حکومتی مسائل سوائے جنگی اسرار کے عوام کی آنکھوں کے سامنے ہونے چاہئے۔اسی طرح آپ ارشاد فرماتے ہیں: یہ جان لو کہ تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ میں کوئی بات تم سے نہ چھپاؤں سوائے جنگی اسرار کے۔ آپ والی مکہ کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں: تمہارے اور لوگوں کے درمیان کوئی حائل نہ ہو سوائے تمہاری زبان کے اور کوئی پردہ نہ ہو سوائے تمہارے چہرے کے اور کسی ضرورت مند کو اپنی ملاقات سے منع نہ کرو۔

نظارت: حکومت کی تشکیل کے بعد لوگوں کا فرض ہے کہ وہ سیاسی میدان میں آئیں اور حکومت پر نظارت کریں۔ حضرت علی (ع) اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں: حق بات کہنے سے باز نہ آؤ۔

سیاسی آزادی کے حدود:

دوسرے امور کی طرح سیاسی آزادی میں بھی کمی اور زیادتی کی گنجایش ہے اور دو باتوں پر توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ ایک آئین اور دوسرے حاکموں کے ذریعہ طاقت کا استعمال۔ سیاسی آزادی کے حدود متعین کرنے والا سب سے اہم عنصر کسی ملک کا آئین ہے اور معاشرہ میں سیاسی آزادی اور اس کے حدود کی شناخت کے لئے ہمیں ملک کے آئین کا سہارا لینا پڑے گا۔ اس مقام پر آئین میں موجود بعض حقوق کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے:

۱. اپنی قسمت کے انتخاب میں آزادی: معاشرے میں لوگوں کا ایک اہم حق، اپنی اپنی قسمت کے تعین کا حق ہے۔ بیشتر ملکوں کا آئین اس حق کو مانتا ہے۔ امام خمینی کی نظر میں عوام کا سب سے بڑا حق اپنی قسمت کے انتخاب کا حق ہے جس کی رو سے ہر قوم خود اپنی قسمت کا فیصلہ کر سکتی ہے[۱]۔

امام خمینی جہاں ایک طرف ولایت فقیہ کے بارے میں انتصاب اور الٰہی مشروعیت کے قائل ہیں وہیں دوسری طرف بہت سے مواقع پر حکومت میں عوام کے کردار پر تاکید کرتے ہیں۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام خمینی کی نظر میں حکومت میں لوگوں کا کیا رول ہے۔

امام خمینی کی نگاہ میں اسلامی حکومت اور حاکم کی مشروعیت صرف اور صرف الٰہی ہے اور عوام صرف حکومت کو مناسب موقع دینے اور ولی منصوب کی تلاش میں اپنا کردار نبھاتے ہیں۔ در حقیقت ولایت انتصابی میں ولی فقیہ کی حکومت کی مشروعیت امام معصوم کے نصب کی وجہ سے ہے اور لوگوں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے لیکن حکومت کو کارآمد بنانے میں عوام اہم کردار نبھاتے ہیں۔ پیغمبر اسلام اور امام معصوم کا لوگوں سے بیعت کا مطالبہ کرنا ان کو منتصب کرنے کے لئے نہیں تھا۔

---

۱. صحیفہ نور، ج ۳، ص ۲۰۴

اس نقطہ نظر کے مطابق آزادی انتخاب کا مطلب حکومت کی کارآمدی کے شرائط مہیا کرانا ہے یعنی حکومت اسی وقت کارآمد ہوسکتی ہے جب عوام پوری آزادی کے ساتھ حاکم کا انتخاب کریں گے۔ امام خمینی (رہ) کی نظر میں اسلامی حکومت کی ماہیت و محتوا قوانین الٰہی کے ذریعہ طے ہوتی ہے اور اس مسئلے میں عوام کا کوئی کردار نہیں ہوتا ہے لیکن حکومت کے لئے مناسب ڈھانچہ تیار کرنے میں عوام کی رائے سب سے اہم ہوتی ہے۔ اس طرح جمہوریت اور اسلامی کے مفہوم کے سلسلے میں امام خمینی کا نقطہ نظر واضح ہو جاتا ہے۔

کسی موقع پر آپ سے ایران میں شہنشاہی نظام کے متبادل نظام کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: حکومت اسلامیہ جمہوریہ ہے ۔ جمہوری اس معنی میں کہ عوام الناس کی حمایت سے وجود میں آتی ہے اور اسلامی یعنی اس کا آئین اسلامی قوانین پر مبنی ہے۔ اسلام میں انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں کے لئے قانون موجود ہے اور کسی دوسرے قانون کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔[1]

۲۔ آزادی بیان: سیاسی آزادی کی ایک اور قسم آزادی بیان ہے۔ آزادی بیان کے سلسلے میں اہم بات اس کے حدود کا تعین ہے۔ آزادی بیان کو بیشتر دانشوروں نے قبول کیا ہے اور زیادہ تر بحث و گفتگو اس کے حدود کے بارے میں ہے۔ آج قانون میں بھی زیادہ تر اسی رخ پر بحث ہوتی ہے لہٰذا آزادی بیان کے حدود کا معین کرنا بہت اہم ہے۔ توہین، افترا، تہمت ، کسی کی نجی زندگی میں دخل اندازی، حکومتی اسرار کا فاش کرنا، صور قبیحہ اور غیر اخلاقی متون کی اشاعت، کسی کے مقدسات کی توہین، اقلیتوں کے حقوق کی پامالی وغیرہ سماجی حقوق کے خلاف ورزی کے کچھ نمونے ہیں۔

آیت اللہ العظمی سید علی خامنہ ای نے ایک سوال کے جواب میں آزادی بیان اور انتقاد کے بارے میں فرمایا: " آزادی سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے اور مناظرہ و بحث و گفتگو سے نہیں بھاگنا چاہئے اور نقد و انتقاد کو صرف ایک رسم کی حد تک محدود نہیں رکھنا چاہئے۔ اسی طرح بحث و مناظرہ کو جنگ و جدل میں نہیں بدلنا چاہئے۔

حدود آزادی کے سلسلے میں امام خمینی کے بیانات سے ماخوذ تین اہم نکتے یہاں بیان کئے جارہے ہیں:

---

۱. صحیفہ نور، ج ۴، ص ۲۱

الف: آزادی بیان اور عوام کے مفادات کا تحفظ: امام خمینی کی نظر میں آزادی بیان کی راہ میں سب سے بڑا حائل قوم کے لئے اس کا مضر ہونا ہے۔ اگر کسی بات کا بیان کرنا قومی مفادات کے خلاف اور اس کے لئے مضر ہو تو اس کا بیان کرنا جائز نہیں ہے۔ آپ حدود آزادی کے سلسلے میں کئے گئے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: اگر قوم کے لئے مضر نہ ہو تو ہر چیز کے بیان کرنے کی آزادی ہے، صرف وہی چیزیں آزاد نہیں ہیں جو ہماری قوم کے لئے مضر ہیں۔[1]

یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ کسی موضوع پر مختلف نظریات کا بیان ہونا نہ صرف لوگوں کے لئے مضر نہیں ہے بلکہ ان کے لئے فائدہ مند بھی ہے کیونکہ اگر معاشرہ میں مختلف آرا و نظریات بیان ہوں گے تو لوگوں کو سوچنے سمجھنے کا موقع ملے گا یعنی آزادی بیان کا اصل مقصد لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہے لہٰذا حکومتیں مختلف نظریات کو پیش کریں جب تک کہ قومی مفادات کے لئے ان کا مضر ہونا ثابت نہ ہو۔

ب: آزادی بیان اور سازشوں کا مقابلہ: امام خمینی تاکید کرتے ہیں کہ آزادی بیان کو کسی سازش کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ آپ فرماتے ہیں: آزادی بیان صدر اسلام سے موجود ہے، ائمہ اطہار(ع) کے زمانے میں بھی موجود ہے، خود پیغمبر اسلام(ص) کے زمانے بھی، لوگ اپنی بات کہتے تھے، لیکن اس آزادی بیان کا سہارا لیکر سازش نہیں کرنا چاہئے۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومتوں اور ان کے ذمہ داروں کو آزادی بیان سے ڈرنا نہیں چاہئے۔

ج: آزادی بیان اور انتقام جوئی سے پرہیز: امام خمینی کی نظر میں آزادی بیان کو تنقید کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہئے نہ کہ انتقام جوئی کے لئے۔ آپ فرماتے ہیں: تنقید کرنا اچھا ہے لیکن اسے انتقام میں نہیں بدلنا چاہئے۔ مثال کے طور پر انسان کسی کو پسند نہیں کرتا لہٰذا اس کے خلاف اخبار میں کچھ لکھتا ہے تو یہ غلط ہے۔ ہاں اگر کسی نے غلطی کی ہے تو اسے نصیحت کرنی چاہئے۔[3]

---

۱. ایضا، ص ۲۵۹

۲۔ ایضا، ج ۵، ص ۱۳۰

۳۔ ایضا، ج ۱۹، ص ۲۱۶

مقام معظم رہبری ذرائع ابلاغ کے بارے میں فرماتے ہیں: ذرائع ابلاغ کسی بھی سماج کی ترقی کے لئے ضروری ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی تین اہم ذمہ داریاں ہوتی ہیں: تنقید و نظارت، لوگوں تک صحیح خبر پہنچانا، افکار و نظریات کا تبادلہ۔ آپ کا ماننا ہے کہ آزادی قلم اور بیان عوام اور ذرائع ابلاغ کا مسلّم حق ہے اور آئین نے بھی اس پر تاکید کی ہے۔

بہ طور خلاصہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام خمینی اور مقام معظم رہبری دونوں حضرات کے نزدیک آزادی بیان معاشرے کی ضرورت ہے لیکن اگر یہ آزادی معاشرے کے لئے مضر ہو یا سازش اور انتقام جوئی کے لئے ہو تو قابل قبول نہیں ہے۔

پارٹی اور انجمن بنانے کی آزادی: اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین کے مطابق لوگوں کو مختلف سیاسی، سماجی اور اقتصادی انجمنوں کے رکن بننے کی آزادی ہے اور کسی کو اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا ہے سوائے اس صورت میں کہ جب اس سے نظم عمومی کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔

سیاسی تنقید کا مفہوم:

برائیوں اور نواقص کو ختم کرنے اور کسی چیز کو آزمانے کے لئے تنقید کی جاتی ہے۔ تنقید کرنے والا صحیح اور غلط کی پہچان کرنا چاہتا ہے۔ تنقید اگر حقائق اور خوبیوں کو واضح و روشن کرنے کی غرض سے ہے تو بہت اچھی ہے لیکن اگر برائیوں کو بڑا دکھانے اور خوبیوں کو چھپانے اور توہین وافترا کی غرض سے ہے تو غلط ہے۔

اسلامی نقطہ نظر کے مطابق تنقید نظریات کو بیان کرنے کے لئے مختلف طریقوں کا سہارا لیا جاسکتا ہے جس میں سب سے اہم طریقہ امر باالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے تنقیدی نظریات کو نصیحت اور مشورے کی صورت میں پیش کریں۔

آزادی اور سیاسی تنقید کا تعلق:

ولایت الٰہی پر مبنی نظام میں ایسے شرائط فراہم کئے جاتے ہیں جس سے سبھی لوگ ملک کے نظام میں حصہ لے سکتے ہیں اور کسی بھی طرح کے استبداد اور خود محوری کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا ہے۔ ولایت الٰہی پیغمبروں، اماموں اور عادل فقیہوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور انسانی حقوق جیسے آزادی یا سیاسی شراکت کے حصول کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے۔ اس نظام کی بنیاد خلافت الٰہی، امامت و رہبری، ظلم ستیزی، استکبار ستیزی، آزادی اور حق انتخاب ہے۔ اس طرح کے نظام میں عوام کے ووٹ دینے اور انتخاب پر تاکید کی جاتی ہے اور دینی حکام جن طریقوں سے ان عظیم اہداف تک پہنچنا چاہتے ہیں اس پر بھی توجہ دی گئی ہے۔

منابع

۱. قرآن کریم
۲. نہج البلاغہ
۳. بوشہری، جعفر، مسائل حقوق اساسی، نشر دادگستر، تہران، ۱۳۷۶
۴. خمینی، روح اللہ، صحیفہ نور، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، تہران، ۱۳۸۶
۵. محمدی ری شہری، محمد، گزیدہ میزان الحکمہ، تلخیص حمید حسنی، دار الحدیث، قم، ۱۳۸۱
۶. مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، دار احیاء تراث العربی، بیروت، ۱۳۶۱
۷. مطہری، مرتضی، پیرامون جمہوری اسلامی ایران، انتشارات صدرا، ۱۳۶۴